SIR SYED AHMAD KHAN
KA
NAZARYA-E-TALEEM-O-TARBIYAT

THESIS

SUBMITTED FOR THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

BY

SHAMIMUDDIN

UNDER THE SUPERVISION OF

PROF. MOHAMMAD ZAHID

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2004



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

تلخیص

سرسیّد احمد خاں ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ان کی پوری زندگی علم و عمل سے عبارت ہے۔ اوران کی خدمات کا دائرہ مختلف جہات پر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا اپنے حسن تدبیر سے اسے سدا بہار بنا دیا۔ سرسیّد دہلی کے ایک معزز خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ان کے اسلاف مغل تاجدار شاہ جہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور شاہی حکومت میں اہم مناصب سے وابستہ رہے۔ سرسیّد کی ولادت اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی میں اکبر شاہ ثانی برسرِ اقتدار تھے اور ان کی سلطنت لال قلعہ تک محدود تھی۔ سلطنت کی معاشی صورت حال روز افزوں خراب ہوتی جارہی تھی۔اس زمانہ میں یورپی تہذیب کے اثر سے جو تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں ان کے نتیجے میں قدیم اور جدید افکار ونظریات کی کشمکش بھی اپنے عروج پر تھی۔تغیر اور تبدیلی کی ان علامتوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر بھی کیا تھا اور منتشر بھی۔ لیکن شورش اور انتشار کے زمانہ میں بھی دہلی میں شعروادب اور دوسرے علوم وفنون کی ترقی ہوئی جس کی تفصیل تاریخ کی صفحات پر محفوظ ہے۔ خود سرسیّد اپنی معروف تصنیف 'اثارالصنادید' کے چوتھے باب میں آخری مغل بادشاہوں کے عہد میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کا ذکر کیا ہے۔ دراصل قوموں اور حکومتوں کا عروج وزوال تاریخ کا مسلسل عمل ہے۔مغل تاجداروں نے بھی ہندوستان میں سولھویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے نصف اول تک اپنے شاہان جاہ وجلال اور شان وشوکت کا چراغ روشن رکھا اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اس کے بعد وہ قصہ پارینہ بن گئے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی سیاسی شکست بھی ان اعلیٰ تہذیبی قدروں کو پامال نہ کرسکی جو ہندایرانی تہذیب کے امتزاج سے ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ سرسیّد اسی تہذیبی روایت کے ساختہ پرداختہ

تھے۔کم وبیش ڈھائی سو سال تک ان کے خاندان کے افراد نے مغلیہ حکومت کی خدمات انجام دیں۔سرسیّد کے دادا سید ہادی کی خدمات کے اعتراف میں عالمگیر ثانی نے انہیں جواد علی خاں کا خطاب دیا تھا اور بعد میں شاہ عالم نے انہیں دوسرے خطابات کے ساتھ قاضی لشکر اور عہدۂ احتساب ان کے سپرد کی۔سرسیّد کے والد بزرگوار سید متقی کو بادشاہ وقت سے خصوصی قربت تھی اور شاہی محل میں بے روک ٹوک جانے کی اجازت تھی۔اس سے بادشاہ سے ان کے روابط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔لیکن سید متقی درویش صفت شخصیت کے مالک تھے۔وہ شاہ غلام علی سے بیعت تھے شاہ صاحب سے ان کی عقیدت کا بین ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے سرسیّد کی رسم بسم اللہ انہی سے کرائی تھی۔سرسیّد کا بچپن اپنے ننیہال اور شاہ غلام علی کی صحبت میں بسر ہوا۔سرسیّد کے نانا خواجہ فریدالدین احمد مشہور عالم تھے اور علم ریاضی میں انہیں بطور خاص دسترس حاصل تھا۔ان کے نانا کا ذاتی کتب خانہ تھا،سرسیّد نے اس سے استفادہ کیا۔سرسیّد کی تربیت میں ان کی والدہ ماجدہ اور ان کے نانا کا نمایاں حصہ ہے۔سرسیّد کی والدہ عزیز النساء بیگم دور اندیش اور دردمند خاتون تھیں۔سرسیّد ابھی کم سن تھے کہ والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت کی پوری ذمہ داری والدہ پر آن پڑی،اور انہیں کی تربیت کے نتیجے میں سرسیّد کو اعلیٰ نصب العین کے لیے تلخ حقائق سے نبرد ہونے کا گُر آتا تھا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد سرسیّد نے علوم متداولہ کی تحصیل کی تھی۔انہیں بچپن سے مطالعہ کا غیر معمولی شوق تھا۔زبان و ادب اور فلسفہ کے علاوہ انہیں علم ریاضی اور تاریخ سے گہرا شغف تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی جید علماء، ادباء، شعراء، حکماء کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔سرسیّد نے ان اکابرین روزگار سے کسب فیض کیا۔اس کے ساتھ ہی قلع معلّیٰ سے دیرینہ روابط کے توسط سے آداب شاہی اور انصرام سلطنت سے واقفیت بہم کی لیکن یہ بھی واقع ہے کہ مغل تاجدار سے روابط اور عزیزوں کی مخالفت کے باوجود سرسیّد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کو ترجیح دی۔ان کی ملازمت کا آغاز سررشتہ داری سے ہوا اور انہوں نے سب ججی سے پنشن لی۔اس زمانہ میں سب

جی کا منصب کسی ہندوستانی کے لیے معراج کمال تک پہنچنے کے مترادف تھا۔ ملازمت کے زمانہ میں انہوں نے فرائض منصبی کے ساتھ ساتھ علمی سرگرمیاں برابر جاری رکھیں۔ ان کی مشہور تصنیف آثار الصنادید' ۱۸۴۷ء میں پہلی بار شائع ہوتی تو انسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ملازمت کے زمانہ میں سرسیّد نے 'سرکشی ضلع بجنور' اسباب بغاوت ہند، قول متین در ابطال حرکت زمین، تحفۂ حسن، احکام طعام اہل کتاب، تبین الکلام، تسہیل فی جر الثقیل اور جام جم وغیرہ لکھا۔ اسی دوران انہوں نے آئین اکبری کا مصور ایڈیشن شائع کیا اور تاریخ فیروز شاہی اور تزک جہانگیری کی تصحیح و تدوین کی۔

سرسیّد ایک بلند پایہ مفکر، مصلح اور جامع تصور تعلیم کے مبلغ تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ہندوستانی عوام بطور خاص مسلمانوں کو جس صورت حال کا سامنا تھا، سرسیّد اس کے عینی شاہد تھے۔ ایسی ناگفتہ بہ صورت حال میں انہوں نے اصلاح احوال کے کام کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے متعدد ادارے قائم کئے اور مختلف تصانیف کے توسط سے مسلمانوں کی مسیحائی کی۔ ان کی علمی اور عملی خدمات کا ایک روشن باب ان کا تصور تعلیم و تربیت ہے۔

سرسیّد کے عملی اقدام کی ایک تابناک مثال مدرستہ العلوم کا قیام ہے جو بعد میں ترقی کر کے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کم وبیش سوا سو سال سے تشنگان علم وادب کو سیراب اور فیضیاب کر رہا ہے۔ اور اس عظیم الشان دانش گاہ کا شعبہ اردو منارۂ نور کی مانند بلا توقف ضیا پاشی کر رہا ہے۔ اس شعبہ سے متعدد ایسی شخصیتیں ابھریں جنہوں نے سرسیّد کی تعلیمی تحریک کو شرمندۂ تعبیر کے لیے ہمہ تن کوششیں کیں۔

سرسیّد کے تعلیمی تصورات کا دائرہ بہت جامع اور وسیع ہے۔ غالباً اسی حقیقت کے اعتراف میں شعبہ اردو نے ''سرسیّد احمد خاں کا نظریہ تعلیم و تربیت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ تیار کرانا طے کیا اور اس اہم کام کے لیے مجھ جیسے کم مایہ طالب علم کا انتخاب کیا اور حکم ہوا کہ میں یہ تحقیقی مقالہ استاد گرامی پروفیسر محمد زاہد کی سرپرستی اور نگرانی میں مکمل کروں۔

سر سیّد احمد خاں کی شخصیت اور خدمات پر اب تک بے شمار مضامین اور مقالات منظر عام پر آ چکے ہیں مثلاً حیات جاوید (از مولانا الطاف حسین حالی)، سر سیّد او علی گڑھ تحریک (پروفیسر خلیق احمد نظامی) سر سیّد اور ان کا عہد (پروفیسر ثریا حسین) اور سر سیّد کی صحافت (پروفیسر اصغر عباس) قابل ذکر ہیں۔ لیکن سر سیّد احمد خاں کا نظریہ تعلیم و تربیت پر اب تک کوئی باضابطہ تحقیقی کام نہیں ہوسکا ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں سر سیّد اور ان کے تعلیمی نظریات و افکار پر غور و فکر کرنے والوں اور اپنے نظریات و افکار کو مضامین اور مقالات کی صورت دینے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ ان علما اور دانشوروں کی موجودگی میں مجھ جیسے نا اہل طالب کے لیے اس موضوع پر قلم اٹھانا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن میں مشکور ہوں اپنے نگراں پروفیسر محمد زاہد کا انہوں نے میری ہمت افزائی کی اور میں نے مقالہ کی تیاری شروع کر دی۔ گو کہ موضوع کے متعلق مواد کی فراہمی میں گونا گوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ مقام شکر ہے کہ اس فریضہ سے عہدہ برآں ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔

''سر سیّد احمد خاں کا نظریہ تعلیم و تربیت'' کا مطالعہ کرنے کے سلسلے میں یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ اس وقت یعنی انیسویں صدی کی تہذیبی، تمدنی، تمدنی اور سیاسی صورت حال کا اجمالی جائزہ لیا جائے تا کہ یہ بات روشن ہو سکے کہ سر سیّد نے کن حالات اور واقعات سے اثر پذیری کے نتیجے میں اپنے نظریہ تعلیم کی تحریک کی۔ سر سیّد کا نظریہ تعلیم و تربیت پر کام کرتے وقت یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی کہ مجوزہ موضوع کا دائرہ خاصا وسیع ہے چنانچہ انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ایک ایک پہلو پر قدرے تفصیلی اظہار خیال کیا جائے۔ چنانچہ موضوع کی اہمیت اور سہولت کے پیش نظر مقالہ کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقالہ کا پہلا باب ''انیسویں صدی کی تہذیبی و تمدنی صورت حال'' پر مشتمل ہے اس باب کے آغاز میں پندرہویں صدی کے یورپ میں رونما ہونے والے صنعتی انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور اس کے زیر اثر زندگی کے دوسرے شعبوں میں رونما ہونے والی

تبدیلیوں، سماجی، تعلیمی، تہذیبی، تمدنی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کا محاکمہ کیا گیا۔ اس سلسلہ میں انیسویں صدی میں ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی صورت حال کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ اس کے تحت انیسویں صدی سے قبل کے ہندوستانی تہذیب وتمدن کو پس منظر کے طور پر بیان کیا گیا ہے جس میں آریوں کی آمد، رہن سہن اور یہاں کے قدیم باشندوں سے میل ملاپ کے نتیجے میں مخلوط زبان اردو کا وجود، مسلمانوں کی آمد، تجارت، تہذیبی اور مذہبی تبلیغ واشاعت۔ مغلوں کی حکومت اور اس کے عروج وزوال کے اسباب ۱۸۵۷ء کی شورش اور اس کے اثرات غدر سے پیدا شدہ مایوس کن صورت حال میں سرسیّد کی مساعی جمیلہ اور ان کی خدمات کے علاوہ یہاں کے تعلیمی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی صورت حال کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب ''انیسویں صدی کا نظام تعلیم'' کے عنوان پر منحصر ہے۔ موضوع کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اسے دو ضمنی ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

ا۔ سرکاری، اسکول، کالج اور یونیورسٹی

۲۔ غیر سرکاری اسکول یعنی دینی مدارس اور مکاتیب

ا۔ سرکاری اسکول، کالج اور یونیورسٹی: مقالہ کے اس حصے میں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد، اس کے اغراض ومقاصد، فورٹ ولیم کالج اور اس کے علاوہ ملک کے مختلف شہروں اور قصبات میں مشنری اسکولوں کا قیام اور ان کے مقاصد انگریزی حکومت کے تحت چلنے والے اسکولوں کا تعلیمی نظام، اساتذہ اور ان کا طریقہ درس وتدریس۔ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ابتدا میں اہم شہروں مثلاً کلکتہ، بمبئی، مدراس اور دہلی میں پہلے کالج پھر یونیورسٹی کا قیام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھانے والے اساتذہ، نصاب تعلیم اور اس کے اغراض ومقاصد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

۲۔ غیر سرکاری اسکول یعنی دینی مدارس مکاتیب: اس عنوان کے تحت سرکاری اسکولوں اور دوسری درس گاہوں کے نظام تعلیم کے نقائص اور مضمرات کے پیش نظر دینی اور مذہبی مدارس و

مکاتیب کے قیام کے اغراض و مقاصد، اساتذہ اور ان کی تقرری، نصاب تعلیم اور ان تعلیمی اداروں کا انتظام وانصرام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ کا تیسرا باب ''سرسیّد کا تصور تعلیم و تربیت'' ہے۔اس باب کے تحت ۱۸۵۷ء کی شورش اور اس سے پیدا شدہ صورت حال کو بطور پس منظر بیان کیا گیا ہے۔پہلی ناکام جنگ آزادی کے ساتھ ہی مغلیہ حکومت کا باضابطہ خاتمہ نیز مسلمانوں کی جانی، مالی، تعلیمی اور صنعتی نقصانات اور ان کے مضمرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس مایوس کن حالات سے عہدہ برآں ہونے میں سرسیّد کی فکر اور تعلیمی تحریک کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے تحت یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ شورش کے بعد کی صورت حال پر سرسید نے بڑی سنجیدگی سے غور وفکر کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمانوں کو اس ابتری سے نکالنے کی یہی صورت ممکن ہے کہ وہ ماضی کے دھند لکے سے باہر نکلیں جدید تعلیم سے کسب نور کریں اور جدید تقاضوں کے تحت اپنی زندگی کو روشن کریں۔سرسیّد نے عملی اقدام کی صورت میں مختلف مقامات پر اسکول قائم کرنے کی تحریک کی۔ غازی پور، مرآدباد، علی گڑھ میں مدرسہ کا قیام وغیرہ۔سرسیّد کا نظریہ یہ تھا کہ مسلمان قومی تعلیم کے لیے حکومت پر انحصار نہ کریں بلکہ وہ اس معاملہ میں خودکفیل ہوں اور نجی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی توجہ دیں اور اسی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم پر غور وفکر کریں۔علاوہ ازیں ماضی کی صالح روایات واقدار کے ساتھ عصری علوم وفنون سے متعلق سرسیّد کے جامع خیالات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اعلیٰ جدید اور مذہبی تعلیم کے ساتھ سرسیّد نے تربیت پر زور دی ہے۔ان کا خیال تھا کہ تعلیم و تربیت کے بغیر زندگی نامکمل رہتی ہے۔انہوں نے تعلیم کے ساتھ ساتھ بہترین اخلاقی تربیت پر زور دیا ہے۔نوجوانوں کی تربیت سے معاشرے میں صالح روایات کی بازیافت ہوتی ہے۔ سرسیّد کے اس تصور کا محاکمہ کیا گیا ہے۔

مقالہ کا چوتھا باب ''سرسیّد احمد خان کے اہم تعلیمی اقدام،، میرے نزدیک غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔اس سے قبل ہم نے ان کی علمی، تعلیمی، فکری اور تربیتی تصورات کا مطالعہ کیا

ہے۔لیکن مجوزہ باب سرسیّد کی زندگی کا وہ حصہ ہے جس سے ان کی عملی زندگی کی تحریکیں اور اقدام منصۂ شہود پر آتے ہیں۔اس باب کے تحت سرسیّد کی قائم کردہ اداروں اور جاری کردہ اخبارات و رسائل کا معروضی جائزہ لیا گیا ہے۔یوں تو سرسیّد کی خدمات اور عملی اقدام کا دائرہ خاصا وسیع ہے لیکن باضابطہ طور پر ان کی عملی اقدام کا آغاز ان کے قائم کردہ ادارہ سائنٹفک سوسائٹی سے ہوتا ہے۔اس ادارہ کے اغراض و مقاصد کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

انگلستان کے قیام کے زمانے میں سرسیّد کو یہ معلوم ہوا کہ وہاں سے نکلنے والے دو اخبارات 'ٹٹلر اور اسپیکٹیٹر' نے انگریزی قوم کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی بیداری میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔چنانچہ وطن واپسی پر انہوں نے ان اخبارات کی پیروی میں تہذیب الاخلاق جاری کیا۔جس میں انہوں نے خود مضامین لکھے اور دوسرے اہل قلم بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔اس رسالے نے جو اثرات مرتب کئے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔اس کی مقبولیت اور افادیت کا عالم یہ ہے کہ سوا صدی بعد بھی یہ رسالۂ اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ آج بھی جاری و ساری ہے۔اس رسالے کا مطالعہ اس طرح کیا گیا کہ اس کی غرض و غایت اور اس کی اہمیت و افادیت کے تمام پہلو منظر عام پر آسکیں۔

سرسیّد کا تبادلہ جب غازی پور سے علی گڑھ ہو گیا تو سائنٹفک سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہو گیا۔بعد ازاں انہوں نے اس ادارے کے تحت ایک اخبار 'انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے جاری کیا۔سائنٹفک سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت میں اس اخبار نے نمایاں کردار ادا کیا ہے چنانچہ اس چوتھے باب کے ضمنی حصہ میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ اجزاء کے مقاصد اور اس کی افادیت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

سرسیّد کی تعلیمی تحریک کا ایک روشن باب علی گڑھ میں مدرستہ العلوم کا قیام ہے یہ واقع ہے کہ سرسیّد نے مسلمانوں کو تعلیمی زبوں حالی سے نکالنے اور ترقی کی راہ پر لا کھڑا کرنے کی غرض سے اس عظیم الشان ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔جسے انہوں نے اپنے خونِ دل سے سینچا اور سنوارا

تھا جس نیک نیتی اور خلوص سے اس ادارہ کی بنیا درکھی تھی غالبًا اسی کا ثمرہ ہے کہ آج یہ ادارہ بین الاقوامی سطح کا ادارہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اب تک اس کے چشمہ فیض سے لاکھوں تشنگان علم نے کسب نور کیا اور اب بھی چشم فیض اپنی پوری تابانی کے ساتھ جاری ہے کوشش کی گئی ہے۔ اس ادارے کے قیام کے در پردہ سرسیّد کے افکار اور اس کی خدمات کا ہر پہلو منظر عام پر آ سکے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بے داری کی غرض سے سرسیّد نے ایک انجمن کے قیام پر زور دیا اور اپنے دوستوں کے تعاون سے انہوں نے ''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس'' قائم کی۔ اس ادارے کا مقصد یہ تھا کہ ہر سال ملک مختلف شہروں اور قصبات میں اس کا ایک جلسہ ہوگا جس کے توسط سے ہندوستانی عوام بطور خاص مسلمانوں میں عام تعلیمی بیداری کی کوشش کی جائے۔ بعد ازاں اس کانفرنس کے بعض ذیلی حصوں کا قیام عمل میں آیا۔ جس میں انجمن تر [illegible] اور اصلاح معاشرہ قابل ذکر ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی [illegible] معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں کانفرنس کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ کا پانچواں باب ''سرسیّد اور سیکولرزم'' ہے۔ اس [illegible] سرسیّد کے سیکولر ذہنیت کو مدلل بیان کیا گیا ہے۔ سرسیّد احمد خاں کے نزدیک ہندو اور مسلمانوں [illegible] ایک قوم کی مانند ہیں۔ انہوں نے بعض موقعوں پر اکثر و بیشتر اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ہندو اور مسلمان اس ملک کی دو آنکھوں کے مشابہ ہیں۔ اگر ان میں تھوڑا سا بھی نفاق پیدا ہوا تو اس ملک کی حالت اس طرح کی ہو جائیں گی جس طرح سے کسی انسان کی حالت ایک آنکھ کے بغیر رہتی ہے۔ سرسیّد نے ہمیشہ دونوں بڑے مذاہب ہندو اور مسلمانوں کو ایک ساتھ مل جل کر رہنے کی وکالت کی۔ انہوں نے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ قومی ترقی کی راہ میں اپنے دوسرے ہم وطنوں یعنی ہندوؤں کے شانہ بہ شانہ کام کریں۔ اس سے آپسی بھائی چارگی اور باہم مفاہمت کی راہیں ہموار ہوں گی۔ سرسیّد کی اس رواداری کا بین ثبوت یہ ہے کہ ان کے قائم کردہ مدرستہ العلوم میں مسلمان طلبا کے ساتھ ساتھ ہندو طلباء کو بھی تعلیم کا برابر مواقع حاصل رہے اور یہ سلسلہ اب بھی

جاری ہے۔ان حقائق کی روشنی میں سرسیّد کے سیکولر ذہنی رویہ اور ان کے عملی اقدام کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

اس مقالہ کے تیاری کے مراحل میں جو کتابیں اور رسائل معاون ثابت ہوئیں، اور بعض وہ کتابیں اور رسائل جن کے بعض اجزاء بطور حوالہ کے اختیار کیے گیے ہیں، مقالہ کے آخر میں ان کتابوں اور رسائل کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے تا کہ قارئین اور آئندہ تحقیق کرنے والوں کو اصل مواد تک رسائی حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آخر میں اس بات کو اعتراف کر لینے میں کوئی عار نہیں کہ کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی۔ممکن ہے اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والے اشخاص اور محققین بہتر مواد فراہم کرسکیں۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ راقم حروف نے اپنی بساط بھر اس موضوع پر مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی دانشت میں کسی حصہ کو تشنہ تکمیل ہونے سے حتی الامکان گریز کیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ طالب علمانہ کوشش سرسیّد اور ان کی خدمات جلیلہ سے شغف رکھنے والے اصحاب اور سرسیّد پر آئندہ کام کرنے والے محققین کے لیے معاون ثابت ہوگی۔

Department of Urdu

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202002 (India)

Tel : { 700920.921
{Extn. 1631

Dated:10.5.2004

TO WHOM IT MAY CONCERN

This is to certify that the thesis for Ph.D. degree submitted by Mr.Shamimuddin entitled "Sir Syed Ahmad Khan Ka Nazriyae-Taleem-o-Tarbiyat" has been done under my supervision. I am fully satisfied with the work and recommend that it may be submitted for the award of Ph.D. degree in Urdu.

Counter signature

(Prof. Qaiser Jahan)
Chairman
Chairman,
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh

(Prof. Mohammad Zahid)
Supervisor
Supervisor
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh

فہرست

پیش لفظ

سر سیّد احمد خاں ہنداسلامی اعلیٰ روایات واقدار کے ساختہ پرداختہ تھے۔ ان کے خاندان کے بزرگ مغل تاجدار شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آئے اور مغلیہ حکومت میں اہم مناصب سے وابستہ ہوگئے۔ اور یہ سلسلہ حکومت کے آخری ایام تک قائم رہا۔ سرسیّد کی ولادت ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم والدہ محترمہ کی نگرانی میں ہوئی بعد ازاں انہوں نے بہت جلد علوم متداولہ سے فراغت حاصل کر لی۔ اس کے علاوہ علوم عقلی و مذہبی جو بیشتر فارسی وعربی زبان میں پڑھائے جاتے تھے دہلی کے اعلیٰ علمی ماحول میں حاصل کئے۔ انہیں بچپن ہی سے مطالعہ کا غیر معمولی شوق تھا۔ زبان وادب اور فلسفہ کے علاوہ انہیں ریاضی اور تاریخ کے مطالعہ کا بھی خاص شغف تھا۔ کم عمری سے سنجیدہ تصنیف و تالیف کا آغاز ہوگیا تھا۔ اور بعد کی زندگی میں انتہائی مصروفیت کے باوجود یہ سلسلہ جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی جید علماء، ادبا، شعراء اور حکماء کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی، سرسیّد نے ان اکابرین روزگار سے کسب فیض کیا۔ یہی نہیں بلکہ قلعہ معلّی سے بھی توسل قائم رہا اور انہوں نے آداب شاہی اور انصرام سلطنت سے واقفیت حاصل کی۔ خانگی ضروریات اور اقتضائے وقت کے پیش نظر انہوں نے انگریزی سرکار میں ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز عدالت کی سررشتہ داری سے کیا بعد میں منصفی کا امتحان پاس کیا اور دہلی میں منصف کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ ملازمت کے دوران بھی تصنیف وتالیف کا سلسلہ برابر جاری رہا اور ان کے رشحات قلم سے متعدد تصانیف منصہ شہود پر آئیں، جن میں آثار الصنادید، آئین اکبری، تفسیر القرآن، رسالۂ اسباب بغاوت ہند اور تبیین الکلام کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں ان کے مضامین، خطوط، رسائل، علمی خدمات اور دوسری تحریروں نے اردو کے دامن کو وسعت دی ہے۔ سرسید کی یہ تحریریں بلا مبالغہ

اردو دوست اشخاص کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

سرسیّد احمد خاں ایک بلند پایہ مفکر، مصلح اور جامع تصور تعلیم کے مبلغ اور علمبردار تھے۔ وہ حصول علم کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ہندوستانی عوام بطور خاص مسلمانوں کو جن صورت حال کا سامنا تھا سرسیّد اس کے عینی شاہد تھے ان کی دورس نگاہوں نے اس کا مداوا عصری تعلیم کے حصول اور انگریزی حکومت سے مفاہمت کی صورت میں تلاش لیا تھا۔ اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے عملی اقدام کی صورت میں انہوں نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جو ترقی کر کے آج علی گڑھ مسلم یونیوسٹی کے نام سے معروف ہے۔ اور اس عظیم الشان ادارے کی ایک درخشاں شاخ شعبۂ اردو روشنی کے منارہ کی مانند اپنی ضیا پاشی سے تشنگان علم کو سیراب کرنے میں مصروف کار ہے۔ اس شعبہ نے متعدد ایسی شخصیتیں پیدا کیں جنھوں نے سرسیّد کی تعلیمی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہمہ تن کوششیں کیں۔ سرسیّد کی تعلیمی تصورات کا دائرہ خاص وسیع ہے۔ غالباً اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اراکین شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ''سرسیّد احمد خاں کا نظریۂ تعلیم وتربیت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ تیار کرانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس اہم کام کے لیے مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کو منتخب کر کے یہ ذمہ داری سپرد کی کہ یہ مقالہ استادِ گرامی پروفیسر محمد زاہد کی نگرانی میں مکمل کروں۔

''سرسیّد احمد خاں کا نظریۂ تعلیم وتربیت'' یہ وہ موضوع ہے جس پر اب تک بے شمار مضامین اور مقالات منظر عام پر آچکے ہیں۔ سرسیّد اور ان کی خدمات کے سلسلہ میں مولانا الطاف حسین حالی (حیات جاوید) ، خلیق احمد نظامی (سرسیّد اور علی گڑھ تحریک)، نورالحسن انقوی (سرسیّد اور ہندوستانی مسلمان)، ثریا حسین (سرسیّد اور ان کا عہد) اور اختر الواسع (سرسیّد کی تعلیمی تحریک) کی اہم کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا متذکرہ بالا تصانیف جو اس مقالے کی تکمیل میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ استاد محترم پروفیسر اصغر عباس، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا باعث سعادت سمجھتا ہوں جنھوں

نے ''سرسیّد کی صحافت'' کے موضوع پر گراں قدر تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ اس مقالے کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ہندوستان اور پاکستان سے اس کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے اپنے تحقیقی کام کی تکمیل میں اس غیر معمولی تصنیف سے کسب نور کیا ہے۔ سرسیّد کے نظریۂ تعلیم پر اب تک کوئی باضابطہ تحقیقی مقالہ نہیں لکھا جاسکا ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں سرسیّد اور ان کی تعلیمی نظریات و افکار پر غور وفکر کرنے والوں اور اپنے نظریات و افکار کو مضامین اور مقالات کی صورت دینے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ ان علماء اور دانشوروں کی موجودگی میں ایک طالب علم کے لیے اس موضوع پر تحقیقی کام انجام دینا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف تھا۔ لیکن میں مشکور ہوں اپنے نگراں پروفیسر محمد زاہد کا کہ انہوں نے میری ہمت افزائی کی اور ان کے مشورہ سے میں نے ہر ممکن ذرائع سے مقررہ موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی کا سلسلہ شروع کردیا۔ باوجود یہ کہ موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی میں گونا گوں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس آزمائش سے عہدہ برآں ہونے کا شرف حاصل ہوسکا ہے۔ توقع ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں بالخصوص سرسیّد کی شخصیت، ان کے افکار ونظریات سے شغف رکھنے والوں میں یہ طالب علمانہ کوشش قابل اعتنا سمجھا جائے گا۔

''سرسیّد احمد خاں کا نظریہ تعلیم وتربیت'' کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ امر ضروری سمجھا گیا کہ اس وقت یعنی انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورت حال کا اجمالی جائزہ لیا جائے تا کہ یہ بات واضح ہوسکے کہ سرسیّد نے کن حالات اور واقعات سے متاثر ہوکر اپنے نظریۂ تعلیم کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ سرسیّد کا نظریۂ تعلیم وتربیت پر کام کرتے وقت یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ مقررہ موضوع کا دائرہ خاصا وسیع ہے چنانچہ اس موضوع کے ساتھ انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کے ایک ایک پہلو پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے۔ اس سہولت کی خاطر مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقالہ کا پہلا باب ''انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورت حال'' پر مشتمل ہے۔ اس

باب میں یورپ اور ایشیاء کی تہذیبی ، تمدنی ، سیاسی ، معاشی اور معاشرتی صورت حال پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اس وقت کی تعلیمی صورت حال کا بھی قدرے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب ''انیسویں صدی کا نظام تعلیم'' کے عنوان پر مشتمل ہے۔ اس باب کی وسعت اور اہمیت کے پیش نظر اس کو دو ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اس عہد میں سرکاری اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور دوسرے حصے میں نیم سرکاری اور غیر سرکاری یعنی دینی مدارس و مکاتیب کے تعلیمی طریقہ کار پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہم عصر غیر سرکاری اسکولوں میں مروجہ تعلیمی صورت حال پر بھی بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں رائج الوقت تعلیمی نظام سے متعلق انگریز حکام کے نظریات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس مقالے کا تیسرا باب ''سرسیّد کا تصور تعلیم و تربیت'' خصوصی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے تحت سرسیّد کے تعلیمی نظریات پر گفتگو کرنے سے قبل اس عہد کی سیاسی ، معاشی ، معاشرتی ، تمدنی اور تعلیمی صورت حال پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی سورش کے بعد سرسیّد کو جن حالات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے سدِ باب کے لیے انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور قیام انگلستان کے دوران وہ جن چیزوں سے متاثر ہوئے اور اس ضمن میں انہوں نے جو علمی اقدام کیے ان کی روشنی میں ان کے تعلیمی تصورات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنی تعلیمی تحریک کے تحت انہوں نے ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی جس نے ۱۸۷۷ء میں ایم۔اے۔او۔کالج کی شکل اختیار کر لی اور یہی ادارہ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہوا۔ سرسیّد نے اپنے ادارہ میں تعلیم کا جو طریقہ کار اختیار کیا اس پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سرسیّد کے تعلیمی نظریات کے ساتھ ساتھ ان کا نظریہ تربیت کو بھی بہت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

مقالہ کا چوتھا باب ''سرسیّد احمد خاں کے اہم تعلیمی اقدام'' پر منحصر ہے اس باب کو پانچ

ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔سائنٹفک سوسائٹی

۲۔تہذیب الاخلاق

۳۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ

۴۔مدرستہ العلوم/محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

۵۔ایجوکیشنل کانفرنس

سرسیّد کے ذہن میں ان اداروں کے قیام کے در پردہ جو مقاصد اور منصوبے تھے اس پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

مقالے کے پانچویں باب میں ''سرسیّد اور سیکولرزم'' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ سرسیّد صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی یکساں تصور تعلیم رکھتے تھے اور ان کا دروازہ دونوں قوموں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا گریجویٹ ایک غیر مسلم (ایشوری پرساد) تھے۔سرسیّد نے دونوں قوموں کے درمیان حائل خلیج کو اپنے حسن تدبیر سے پاٹنے کی ہر ممکن کوشش کی۔وہ ہندوستان کو ایک ملک اور یہاں کے باشندوں کو ایک قوم خیال کرتے تھے۔

مقالے کے آخر میں ''کتابیات'' کی فہرست دی گئی ہے جس کے تحت ان کتابوں، رسائل و جرائد کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے جو اس مقالے کی تکمیل میں معاون اور مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

امید ہے کہ یہ طالب علمانہ کوشش سرسیّد کے نظریہ تعلیم و تربیت کو نئے انداز اور نئے زاویہ سے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی اور ان کے نظریہ تعلیم کے متعلق بعض نئے گوشے بھی منظر عام پر آسکیں گے۔

میں اپنے استاد مکرم پروفیسر محمد زاہد کا بے حد مشکور و ممنون ہوں جنھوں نے تحقیقی کام کے زمانے میں

میری قدم قدم پر رہنمائی کی۔ مجھے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر استاد محترم کی شفقت، محبت اورنظرِ عنایت شامل حال نہ ہوتی تو یہ مقالہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ اس سلسلے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر قیصر جہاں صاحبہ کا بہت ممنون ہوں جنھوں نے مشکل وقت میں اپنی قیمتی آرا سے سرفراز کیا اور بے پناہ شفقت اور محبت سے میری ہمت افزائی کی۔ علاوہ ازیں شعبۂ اردو کے اپنے تمام اساتذہ کا بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے تحقیقی کام کے دوران میری حوصلہ افزائی کی اور قیمتی مشوروں سے مستفیض کیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر میں ڈاکٹر حافظ محمد الیاس لکچرر شعبۂ نفسیات 'Psychology' اور ڈاکٹر محمد مقیم ریڈر شعبۂ فلسفہ 'Philosphy' کا ذکر خیر نہ کروں جنھوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور انہی کی مساعی جمیلہ سے اس تحقیقی مقالے کی کمپوزنگ کا مرحلہ بآسانی طے ہوسکا ہے۔ اپنے دوستوں بالخصوص ڈاکٹر محمد علیم الدین، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر محمد موصوف، محمد ناصر علی، قمر عالم، صدر عالم، علی عمران عثمانی، فخر عالم، محمد اکرم خاں، محمد مونس، محمد اکرام الحق، جلال الدین اور فتح عالم کا شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتا ہوں جنھوں نے میرے ساتھ ہمدردی، محبت اور دوستی کے رشتے کو ہمہ وقت روا رکھا۔

مولانا آزاد لائبریری میں صیغہ اردو کے اراکین محترم باقر علی خاں، محمد باقر حسین، محمد محسن جعفری، اور شعبۂ اردو کی سمینار انچارج محترمہ رابعہ سہیل میرے شکریے کے خاص طور سے مستحق ہیں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور حتی الامکان میری مدد فرمائی۔

آخر میں اس مقالے کے کمپوزیٹر میرے دوست محمد اشرف کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے مقالے کی کمپوزنگ میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

شمیم الدین
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۰ رمئی ۲۰۰۴ء

بابِ اوّل

انیسویں صدی کی
تہذیبی وتمدنی
صورتِ حال

انسان قدرتی طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ مدنی کے معنی ہیں شہر یا بستی بسا کر رہنے والا۔ انسان جان کی حفاظت اور باہمی امداد کی خاطر سماج میں رہنے کے خواہش مند ہوتا ہے اور اسی طرح وسیع و عریض معاشرہ تیار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ چھوٹے چھوٹے الگ الگ بستیوں میں رہتے ہیں وہ دیہاتی کہلاتے ہیں اور جو لوگ قصبوں اور شہروں میں رہتے ہیں شہری کہلاتے ہیں۔ انسانوں کی بنیادی ضروریات زندگی روٹی، کپڑا اور مکان ہیں۔ سر چھپانے کے لیے مناسب مکان، زندگی قائم رکھنے کے لئے موزوں صحت بخش غذا اور موسم کے مطابق جسم ڈھکنے کے لئے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرہ کا اقتصادی اور اخلاق معیار جتنا بلند ہوگا افراد کی کارگزاریاں اسی اعتبار سے بارآور ہوں گی اور سوسائٹی میں خوشحالی آئے گی اور ساتھ ہی علم و دانش کو فروغ ملے گا۔

جب تہذیب و تمدن کا ذکر آتا ہے تو انسان کے ذہن میں ایک طرح کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسان اپنی زندگی میں غذائی، رہائشی اور ستر پوشی کے معاملے میں بہتر سے بہتر بنانے کی مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور زندگی کو آرام و سکون سے گزارنے کے لئے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے ہیں انہیں اعلیٰ تہذیبی ارتقاء سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ اس ضمن میں مذہبی افکار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کیوں کہ ہندوستان کی دو بڑے مذاہب کے پیروکار ہندو اور مسلمان کے باہمی میل جول سے جو معاشرہ وجود میں آیا اس پر اسلام اور ویددھرم کی چھاپ نمایاں ہیں۔ ہندوستان میں سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد نے بھی تہذیب و تمدن میں گل کاریاں

کی ہیں ۔انیسویں صدی کے تہذیب وتمدن کے حالات اسی پس منظر میں زیر بحث آئیں گے۔

نظام قدرت میں تنازع البقا کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے قدرتی عناصر وحشی جانور، کیڑے مکوڑے جسمانی اذیت کا سبب بنتے رہتے ہیں مگر انسان نے اپنے فہم و دانش سے ان مخدوش طاقتوں کو زیر کر کے محفوظ راستے اختیار کئے ہیں اور اشرف المخلوقات کے خطاب کی لاج رکھی ہے ۔ ہر قوم اور قبیلے نے اپنے ماحول کے لحاظ سے زندگی کے نظام کو ترتیب دیا ہے۔ اسی نظام زندگی کو عملی اصطلاح میں تہذیب وتمدن کہتے ہیں ۔ یہ نظام جتنا پروان چڑھتا ہے اتنا ہی متعلقہ قوم کا درجہ بنی نوع انسان میں بلند ہو جاتا ہے۔تہذیب وتمدن ارتقا میں دانشور اور ارباب اقتدار کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور مناسب قوانین اور ضابطوں پر عمل درآمد صاحبِ اقتدار لوگ ہی کرا سکتے ہیں ۔عوام مقتدا لوگوں کی پیروی میں ہی اپنی سلامتی اور خیر و برکت سمجھتے ہیں ۔

انیسویں صدی میں متضاد انقلاب یورپ اور ایشیاء میں برپا ہوئے ۔ یورپ نے انیسویں صدی تک بے پناہ علمی وفنی ترقی کی اور مشرقی یعنی ایشیائی ملکوں پر سیاسی ومعاشی زوال کے بادل چھا گئے ۔ پہلے ہم یورپ کے بارے میں تفصیلی تبصرہ کریں گے کیونکہ مشرقی ملک جیسے ہندوستان وغیرہ میں مغربی قوموں کی دست اندازی سے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے۔

یورپ میں پندرہویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب کے بعد مغربی اقوام نے زندگی کے ہر میدان میں تیز رفتاری کے ساتھ قدم بڑھائے جو تاریخ میں بے مثال ہیں ۔انیسویں صدی کے آتے آتے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، اسپین اور پرتگال وغیرہ دنیا کے سربرآوردہ ملک بن گئے ۔ جہازرانی میں مہارت کی وجہ سے ان ملکوں نے ہزاروں میل دور ایشیائی اور افریقہ ممالک سے رابطہ قائم کرلیا۔ یہ رابطہ دو طرح سے فائدہ مند ثابت ہوا۔ایک تو یہ کہ مغربی ملکوں کی مشینی مصنوعات کو مشرقی ملکوں میں خاطر خواہ منافع پر فروخت کیا گیا۔ نیز مشرقی علاقوں سے

کچا مال ارزاں قیمت پر دستیاب ہوا۔ جس کی وجہ سے یورپ والوں کے کارخانے دن دونی ترقی کرتے رہے اور مصنوعات کی بکری سے کارخانوں کے مالک مالا مال ہو گئے ساتھ ہی کارخانوں کے مزدوروں کو بے کاری کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔ (1)

کچے مال آسانی سے حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک نے نو آبادیوں کی شروعات کی۔ اصطلاح میں نو آبادی اس علاقہ کو کہتے ہیں جہاں پر کوئی استبدادی طاقت اپنے ملک سے باہر حاکمانہ تسلط قائم کر لیتی ہے اور اس آبادی کے سپید وسیاہ کی مالک بن جاتی ہے۔

مشرقی ممالک میں نو آبادی کو قائم کرنے کا سلسلہ انہی مغربی ملکوں کو راس آیا جن کا جہازی بیڑا طاقت ور تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے ملک سے دو ہزار میل کے فاصلے پر کسی خطے پر تسلط بحری قوت حاصل کئے بغیر دشوار تھا۔ اگر چہ اکثر و بیشتر یوروپی قوموں نے علیحدہ علیحدہ نو آبادیاں قائم کیں لیکن انگلینڈ کو اس معاملے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ ہندوستان (بنگلہ دیش، پاکستان) لنکا، (برما) وغیرہ برٹش نو آبادیوں میں شمار کئے جانے لگے۔ بلکہ کناڈا، آسٹریلیا جیسے دور دراز وسیع علاقے پر یونین جیک (انگلینڈ کا جھنڈا) لہراتا تھا اور ان ملکوں کی حالت بھی نیم غلام ملکوں جیسی تھی جو برطانوی سامراج کا ایک حصہ کہلاتے تھے۔

انیسویں صدی میں مشرقی ممالک جیسے ہندوستان، برما، لنکا وغیرہ کی سیاسی اور اقتصادی حالت بدتر ہونے لگی تھی اگر چہ ہزاروں سال سے ہندوستان، ایران، چین شاندار تہذیب و تمدن کے مالک تھے اور ان تہذیب کا اثر ساری دنیا پر دیکھا جا سکتا تھا۔

بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی تبدیلی واقع ہوئی۔ مسلمانوں کی حکومت ۱۱۹۳ء میں دہلی پر قائم ہوگئی۔ محمد غوری دلی کی حکومت اپنے

---

(1) Nehru Jawaharlal, "The glimpses of world history", New Delhi, 1996, P-430.

غلام قطب الدین ایبک کو سپرد کر کے اپنے وطن واپس چلا گیا اس طرح دلی پر پٹھانوں کی حکومت تقریباً تین سو تیس برس تک قائم رہی اس کے بعد ظہیر الدین محمد بابر ایک ترک قبیلے کا سردار دلی کی حکومت کو ابراہیم لودی سے چھین کر یہاں کا بادشاہ بن گیا۔ مغل خاندان نے ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت کی۔ مغل خاندان میں سب سے زیادہ پسندیدہ، ہوشمند اور شاندار بادشاہ اکبر ہوا۔ جس نے تقریباً ساٹھ سال تک حکومت کی۔ اگرچہ کچھ عرصے کے لئے شیر شاہ سوری، ہمایوں کے بعد دہلی کے تخت پر قابض رہا۔ مگر شیر شاہ کے کالنجر کی لڑائی میں مارے جانے سے دلی کا تخت پھر مغلوں کے قبضے میں آ گیا۔ اور جلال الدین محمد اکبر، نور الدین جہانگیر اور شہاب الدین عرف شاہ جہاں تک بڑی شان شوکت سے حکومت چلی۔ اورنگ زیب نے ۱۶۵۶ء میں اپنے والد شاہ جہاں کو قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اورنگ زیب کٹر مذہب پرست تھا اس لئے اس نے بعض ایسے قانون نافذ کئے جن سے ہندو رعایا ناخوش ہوگئی ان میں ایک جزیہ ٹیکس بھی تھا۔ یہ قانون ہندوؤں کو اس لئے ناگوار گزرا کہ وہ صرف ہندوؤں پر لگایا گیا تھا۔ ہندو مسلم باہمی رواداری کی جو روایت اکبر سے لیکر شاہ جہاں تک تھی وہ باقی نہ رہی۔ (۱) اکبر نے راجپوت جیسی بہادر اور خوددار قوم کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ راجپوت رانیاں محلوں کی رونق بن گئیں۔ اور مذہبی تفریق بڑی حد تک حکومت کے راستہ میں حائل نہیں ہوئی۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی۔ اس کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوگیا۔ زوال کی متعدد وجوہات تھے۔ بعض مورخین کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اورنگ زیب کو اس صورت حال کا ذمہ دار مانا ہے۔ (۲) کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے مذہبی کٹر پن کو مورد الزام اس لئے ٹھہرایا گیا کہ انہوں نے غیر اسلامی رسمیں جو شاہ جہاں کے عہد تک

---

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India" P-27

(2) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", P-243.

حکومت کے کاروبار میں رائج تھیں ان کو اورنگ زیب نے ناپسندیدہ قرار دے دیا۔ اس طرح ہندوؤں کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بادشاہ ہندو مذہب کا مخالف ہے۔ جب کہ اکبر سے لے کر شاہ جہاں تک اس طرح کی بدگمانیوں کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ جواہر لال نہرو نے بھی اپنی بایوگرافی جس کا ترجمہ ''میری کہانی'' کے نام سے اردو زبان میں کیا ہے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے جزیہ ٹیکس لگانے سے ہندو عوام نہایت برافروختہ ہوئے۔(۲) ہمارے خیال میں جزیہ ٹیکس کے علاوہ اور بھی متعدد اسباب تھے۔ ہندوستان کے متعصب تاریخ نویسوں نے اورنگ زیب کو ظالم اور کٹر مذہب پرست مسلمان بادشاہ کہہ کر کچھ زیادہ بدنام کیا ہے حالانکہ اس نے بہت سے مندروں کو جائدادیں بھی دی تھیں۔

ہمیں لے دے کر ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا
میرے غم خانے کی جب حالت رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

مغل سلطنت کو بربادی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تقریباً ایک سو پچاس سال لگے ان ڈیڑھ سو سال میں آخری ایک تہائی عرصہ انیسویں صدی پر مشتمل ہے جس میں شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی دور حکومت تھی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کا ملزم ٹھہرایا اور انہیں تخت سے برطرف کر کے رنگون کے قید خانوں میں مقید کر دیا تھا۔ جہاں چند سال بعد ان کی وفات ہوگئی اور وہیں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ اسی مضمون کا ایک نہایت دلگداز شعر ظفر کبھی خود کہہ چکے تھے:

(2) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", P-271.

ے ''کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے

دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں''

بہادر شاہ کا آخری دور بڑا دردناک تھا۔ محلوں میں اور محلوں سے باہر آئے دن جاں نثاروں اور شہزادوں کا خون بہایا جارہا تھا۔ ہر طرف چھوٹے سے لے کر بڑے تک بے اطمینانی اور پریشانی کے شکار تھے۔ سلطنت کے اراکین کو بھی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے لوگ اس صورتِ حال سے اتنے متاثر نہیں تھے جتنے کہ دلی کے رہنے والے چھوٹے بڑے امیر فقیر اور صاحب حیثیت لوگ چراغ پا تھے۔ دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے جتنا قتل عام دلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ لاشیں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔ دفن کی کوئی صورت نہیں تھی۔ مردہ خور جانور لاشوں کو کھینچتے پھرتے تھے۔ درختوں پر رسیاں باندھ کر ہزاروں لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ ان درختوں پر لٹکی لاشوں کو کوّے اور گدھ مدتوں تک اپنی خوارک بناتے رہے۔ دلی والے یا تو گھروں میں جان بچائے چھپے بیٹھے رہے یا پھر دلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انگریزوں کی طرف سے ان پر بے شمار ظلم کئے جاتے تھے ان کو ننگا کر کے ان کے پوشیدہ مقام کو پھندا ڈال کر رسی سے کھینچا جاتا۔ بے ہوش ہو جانے پر انہیں غلاظت سے بھرے ناند میں پھینک دیا جاتا۔ پوس اور ماگھ کی سردی میں انہیں ٹھنڈے پانی کے اندر غوطہ لگوایا جاتا۔ جیل کے اندر بند قیدیوں کو اوڑھنے کے لئے صرف ایک کمبل اور کھانے کو ایک چپاتی دی جاتی۔ وہ بھی کسی کو ملتی اور کسی کو نہیں ان کو کولہو میں بیل کی جگہ جوتا جاتا تھا۔ اس تباہی کا نقشہ جوش ملیح آبادیؔ نے اپنی مشہور نظم ''سوداگروں سے خطاب'' میں یوں کھینچا ہے :

کس زباں سے کہہ رہی ہو آج اے سوداگرو

دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں درکارواں

سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں

تیسرے فاقے پہ اک گرتے ہوئے کو تھامنے

کس کا سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے''

انیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے استحکام کی وجہ سے ہندوستان میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ اس میں تہذیب وتمدن کے صحیح وسالم رہ جانے کا کوئی امکان نہیں تھا عام لوگوں کی زندگی آلام ومصائب کا شکار ہو چکی تھی۔ جان بچانے کے علاوہ روٹی کپڑا اور مکان کا خیال کرنا فضول تھا مسلمانوں کا جاگیردار طبقہ جو تہذیب وتمدن کا دعوے دار بھی تھا اور عمل پیرا بھی۔ اس طبقہ کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی کیونکہ اس طبقہ کی خوشحالی حکومت کی خوشحالی سے وابستہ تھی۔ جب حکومت ہی حال سے بے حال ہوگئی تو جاگیردار اور منصب دار بھی خود بہ خود تباہی کا شکار ہو گئے اور جہاں سر چھپانے اور جان بچانے کا موقع ملا وہاں پہنچ گئے۔ اس طرح معاشرے میں انتشار اور افراتفری پھیل گئی۔

مسلم تہذیب وتمدن کے سلسلے میں نہرو نے اپنی بایوگرافی میں لکھا ہے کہ شمالی ہندوستان میں صرف ایک مٹھی بھر متوسط طبقے کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ جن پر ایرانی زبان اور ایرانی روایات کا اثر ہے۔ اور عوام پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن، کی نشانی بظاہر یہ ہے کہ ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لانبا ہو اور نہ زیادہ اونچا، ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی کا رکھنا، اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی ہوتی ہے۔ اور عورتوں کا برقعہ مسلم

تہذیب وتمدن کی پہچان تھے۔اس کے برخلاف ہندوؤں میں دھوتی پہننے کا،سر پر چوٹیا رکھنے کا، اور ذرا مختلف قسم کا لوٹا رکھنے کا رواج ہے۔(۱)ہندومسلم مشترکہ تہذیب و تمدن نے ہندومسلمانوں کوقریب تو کیا مگر شیروشکر کی طرح گھل مل جانے کی نوبت نہیں آئی۔ مذہبی عقیدے اس کی راہ میں حائل ہوئے۔ ہندوستان میں ہندو معاشرہ اور مسلم معاشرہ عام طور پر مذہبی اثرات کے تحت کسی قدر محدود انداز میں تشکیل پاتا رہا۔مگر درمیانی طبقے کا کلچر جاگیردارنہ اور منصب دارانہ تھالہٰذاتہذیب وتمدن دونوں قوموں میں ایک ہی انداز سے پروان چڑھا۔

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہوتا ہے کہ جاگیردارنہ کلچر انیسویں صدی تک ہندوستان میں باقی تھا جب کہ یورپ میں جاگیرداری نظام اٹھارہویں صدی تک دم توڑ چکا تھااور سرمایہ دارانہ نظام نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ بڑے بڑے کارخانے والے دولت مند ہو گئے اوران سرمایہ داروں نے اپنی کاروبار کی بدولت سیاسی اقتصادی اور معاشی صورت حال کواتنا متاثر کیا کہ حکومت انہی سرمایہ داروں کے اشاروں پر چلتی رہی۔کارل مارکس (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۸۳ء) نے سرمایہ داری نظام کے خلاف آواز بلند کیا اور داس کیپٹل (Das Capital) کتاب لکھ کر سیاسی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔کارل مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف عام ذہنوں کوتیار کیا۔ڈاکٹرمحمداقبال نے کارل مارکس کے فلسفہ سے متاثر ہوکرلکھا تھا :

’’نیست پیغمبرو لے دارد کتاب (وہ پیغمبرنہیں مگر صاحب کتاب ہے) جواہرلال نہرو نے مارکس کے بارے میں کہا کہ’’وہ اجتماعی امورمیں گہری بصیرت رکھتا تھا‘‘۔(۲)

انیسویں صدی میں مارکس کی تعلیم کولینن جیسے دلیراور دیدہ ور انسان نے اتنا پروان چڑھایا کہ مارکس کانظریہ کمیونزم کی شکل میں سرمایہ داری کے خلاف ایک عالمگیر تحریک کے طور پر

---

(۱) جواہرلال نہرو،’’میری کہانی‘‘ حصہ دوم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۳۳۵

(۲) ’’میری کہانی حصہ دوم‘‘ جواہرلال نہرو، ص ۵۲۶۔

سامنے آیا۔اس طرح زمینداری نظام اور ساہوکاری نظام کو بنی نوع انسان کے لئے لعنت سمجھا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر اقتصادی ،تعلیمی،تمدنی ، سیاسی ، معاشی تمام میدانوں میں بربادی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔سارا تہذیبی اور تمدنی ڈھانچہ درہم برہم ہوگیا تھا اور ہر چھوٹے بڑے کی جان و مال اور عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔اس لئے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ تہذیبی اور کلچرل قدریں کتنی الٹ پلٹ گئیں تھیں۔اس صورت حال میں ایک تہذیبی کرن اردو زبان کی شکل میں پھیل رہی تھی ۔اس زبان کی ترقی کا سارا راستہ فورٹ ولیم کالج کے بعد ہی شروع ہوا۔فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ۱۸۰۱ء میں قائم ہوا اور بہت بڑا نثری سرمایہ اس کالج کے قیام کے بعد ہی اردو زبان میں فراہم ہونا شروع ہوا۔یوں کہئے کہ اردو اسی دور میں علمی زبان کی صورت میں پروان چڑھی۔سرسیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اردو کو دنیا کی بڑی زبانوں کی صف میں لاکر بیٹھا دیا جو آگے چل کر سرکاری زبان کے درجے تک جا پہنچی۔

ثقافتی ارتقاء کا یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے کہ اردو زبان اتنے تھوڑے عرصہ میں ایک معمولی پودے سے بڑھ کر تناور درخت بن گئی۔ایسی مثال دنیا کے کسی حصے میں نہیں ہے۔مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کا رشتہ برج بھاشا سے استوار کیا اس کی تائید میں مولانا محمد حسین فرماتے ہیں کہ:

''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو اس کی

عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا
وطن ہے۔''(۱)

اور مسعود حسین خان کی جدید تحقیق کے مطابق اردو دلی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان جسے ہم اور آپ کھڑی بولی کے نام سے جانتے ہیں، یہی اردو کی بنیادی شکل ہے جو ایک ہندوستانی زبان ہے اور اس کا تعلق کسی غیر ملکی زبان سے نہیں ہے۔ فارسی اور کچھ عربی کے الفاظ کثیر تعداد میں اس لئے اردو میں شامل ہو گئے کہ فارسی ایک سرکاری زبان تھی اور اردو کو فروغ دینے والے بھی فارسی کے دلدادہ تھے۔ اور اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں پروفیسر شیرانی نے اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''میں نے بعض تاریخی مفروضات کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی اور ہریانوی پنجابی مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔''(۲)

فورٹ ولیم کالج میں اردو کو جو ترویج اور ترقی حاصل ہوئی اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اردو ایک عوامی زبان ہے اور عام لوگ اس کو آسانی سے پڑھ لیں گے اور سمجھ سکیں گے۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریز افسران کو عام لوگوں کی زبان سمجھنے کے لئے جو طریقہ اپنایا گیا اس کا بنیادی مقصد غیر ملکی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن کو اردو زبان کی تعلیم دینا تھا تاکہ عوام سے رابطہ قائم کرنے میں اس زبان کا سہارا لینے میں آسانی ہو۔ مگر بعض سیاسی مقاصد کے لئے دو زبانیں یعنی اردو اور ہندی علیحدہ علیحدہ بن گئیں۔ ناگری رسم الخط میں ہندی کو جو اس وقت اردو سے کوئی علیحدہ زبان نہ تھی سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے بوجھل کر دیا گیا اسی طرح فارسی رسم الخط میں لکھی جانے

(۱) پنجاب میں اردو حافظ محمود خاں شیرانی، اپکار پریس لکھنؤ، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۵۴۔۵۵
(۱) مقدمہ تاریخ زبان اردو، مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۱

والی سادہ زبان کو فارسی اور عربی الفاظ سے سجایا گیا۔ اس سلسلے میں کچھ کام اردو مصنفوں نے کیا جنہوں نے اپنا سکہ جمانے کے لئے اردو کو سادگی کے راستے سے ہٹا کر گنجلک راہوں پر ڈال دیا۔ ''فسانہ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے چنانچہ اس کی مثالیں ان دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔ سرسیّد جن کو اردو کا سب سے بڑا محسن قرار دیا جاتا ہے انہوں نے بھی خاص طور پر سادہ زبان کے استعمال پر زور دیا۔ مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی مشہور تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اس بات پر زور دیا ہے کہ زبان عام فہم اور سادہ ہونا چاہئے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کے بعد اردو کا مقام اتنا بلند ہو گیا کہ اس نے عوام اور خواص میں اتنی مقبولیت حاصل کر لی کہ لوگ فارسی جیسی زبان پر اردو کو ترجیح دینے لگے۔ فارسی تعلیم و تدریس کا رجحان دن بہ دن کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی نے اردو زبان کا اتنا بڑا تحفہ ہندوستان کو دیا جس کی مثال نہ پہلے تھی اور نہ ہی آئندہ امکان ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ اردو جو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی تابناک مثال ہے جو ایک دلکش بھاشا ہے۔

ے ''اردو زبان گلشن ہندوستان کی ہے
ہمدم وہیں رہے گی یہ مٹی جہاں کی ہے'' (ادیب کاسگنجوی)

مشترکہ تہذیب و تمدن کا تصور کہیں نہیں ملتا ہے وہ ہر صاحب نظر کے لئے اردو کی صورت میں موجود ہے۔ ہندوستان نے انیسویں صدی میں دنیا کو دو غیر معمولی تحفے دیئے ایک اردو زبان اور دوسرا عدم تشدد کا نظریہ۔ ان پر محبّ وطن ہندوستانی جتنا فخر کریں کم ہے۔

تہذیب و تمدن کے فروغ خاص طور پر تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انیسویں

صدی تک تعلیم کا انتظام سرکاری طور پر کم ہی تھا۔ لوگ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے معلم کا انتظام خود کرتے تھے اور گھریلو مکتب قائم کرتے تھے۔ (۱) سرکاری طور پر دو ایسے ادارے وجود میں آئے ایک دلی کالج اور دوسرا فورٹ ولیم کالج۔ جہاں پر تعلیم و تربیت کا انتظام تھا حالانکہ فورٹ ولیم کالج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کو دیسی زبان سکھائی جاتی تھی۔ یہاں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دلی کالج البتہ اس وقت کی مروج اعلیٰ تعلیم مہیہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ملک کے کئی نامور لوگ یہاں سے تعلیم پا کر نکلے اور جنہوں نے تعلیم کی روشنی وسیع پیمانے پر پھیلائی۔ مرزا غالب کو اس کالج میں بطور فارسی کا استاد رکھنے کا ارادہ تھا مگر ان کی انانیت کی وجہ سے پورا نہیں ہوا۔ ۱۹ ویں صدی کے نصف آخر کے ہندوستان میں عام لوگوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کے والدین پر منحصر رہتا تھا۔ بڑے زمیندار اور منصب دار اپنے بچوں کے لئے جو تعلیم کا اہتمام کرتے تھے وہ بڑے لوگوں کے بچوں تک محدود تھے۔ جاگیرداروں اور منصب داروں پر جب زوال آیا اور وہ اقتصادی طور پر بدحال ہو گئے تو گھریلو مکتب بھی برائے نام رہ گئے۔ تعلیم کی یہ کمی مسلمانوں پر زیادہ اثر انداز ہوئی اور سر سیّد احمد خاں نے اسی کمی کو محسوس کر کے اپنی تحریک کا آغاز کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ روایتی تعلیم سے اب خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے انگریزی تعلیم قطعاً ضروری ہے۔ اگر چہ عام مسلمانوں اور بعض علما نے انگریزی تعلیم کی بے حد مخالفت کی اور سر سیّد کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ناقابل برداشت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے جو بات دل میں ٹھان لی تھی اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ یہاں تک کہ سب سے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام سے جو فائدے حاصل ہوئے اس کا احساس لوگوں کو بہت بعد میں ہوا۔

---

(۱) حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، لاہوتی پرنٹ ایڈز جامع مسجد نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۰

"[9] انگریزی تعلیم کے ذریعہ ان علوم تک دسترس ہوئی جو سوائے انگریزی زبان کے کسی اور زبان میں نہیں تھے۔نئی سائنسی ترقی نے جو دروازے کھولے اور نئی نئی ایجادات کا فائدہ بنی نوع انسان کو نظر آیا، اس کے حاصل کرنے کا راستہ صرف انگریزی تعلیم کی معرفت ممکن تھا۔ جیسے جیسے تعلیم کا شوق لوگوں میں پیدا ہوا ہر طبقے کے لوگ انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے پھر بھی مسلمانوں کی توجہ انگریزی تعلیم کی طرف ہندؤوں کے مقابلے میں دیر سے ہوئی اور وہ تعلیمی میدان میں ان سے تقریباً پچاس سال پیچھے رہ گئے اور اسی بات کا خمیازہ وہ اب تک بھگت رہے ہیں۔"[10] برٹش حکومت نے بھی سرسیّد کی اس کوشش میں بہت معاونت کی اور لندن کے علمی حلقوں میں بے حد تعریف کی گئی۔اعلیٰ احکام میں سرسیّد کی آؤبھگت زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ان کو 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا یہ خطاب انگریزوں کو بھی اعلیٰ خدمات کے لئے برٹش حکومت طرف سے عطا کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں مسلمانوں میں عام طور سے تین طبقے ظہور پذیر تھے۔ایک اعلیٰ طبقہ جس میں بڑے بڑے رؤسا اور منصب دار لوگ تھے جو راجہ یا نواب کہلاتے تھے جن کو بڑی بڑی جائدادیں ملی ہوئی تھیں ان جائدادوں سے بڑی معقول آمدنی ہوئی تھی اور عیش و آرام سے زندگی گزرتی تھی۔مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سے ایسے نوابوں اور راجاؤں کا مستقبل بھی دیرپا نظر نہیں آرہا تھا لیکن تہذیب وتمدن کا معیار صرف اسی طبقے میں برقرار تھا اور عام لوگ بھی اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔دوسرا طبقہ جو نچلے طبقے کے زمینداروں اور تعلقہ داروں کا تھا، وہ لوگ دیہات میں بھی رہتے تھے اور شہری آبادی میں مقیم تھے یہ وہ لوگ تھے جو چھوٹی چھوٹی جائدادوں کے مالک تھے لیکن اپنی زندگی کسی قدر آرام اور شان وشوکت سے گزارتے تھے۔اس طبقے کی آمدنی کسانوں کی پیداوار میں سے ایک مقررہ رقم وصول کر کے حاصل ہوتی

تھی ان کے رہن سہن کا معیار اگر چہ اعلیٰ طبقے کے برابر بلند نہیں تھا پھر بھی جہاں تک ممکن تھا۔ یہ اپنے آپ کو نچلے طبقے سے بلند و برتر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ زمین کا لگان پیداوار کی نسبت سے کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریب آدمی زیادہ غریب اور زمیندار طبقہ زیادہ خوشحال تھا۔ آمدنی کی اس تفریق سے کسانوں کے بچے تعلیم سے محروم رہتے تھے اور زمینداروں کے بچے تعلیم پا کر سرکاری عہدے حاصل کر لیتے تھے۔ سرکاری عہدے دار زمینداروں سے بھی زیادہ مغرور تھے۔ اور عوام کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے تھے۔ اقتصادی نا برابری، معاشی اور سماجی معاملات میں ابتری پیدا کرنے کے بنیادی اسباب یہی تھے۔ ظلم اور ناانصافی قدم قدم پر نظر آ رہی تھی۔ ایسے حالات میں تہذیب وتمدن کا ڈھانچہ چور چور ہو جانا ناممکن نہ تھا۔ جہاں تہذیب وتمدن کے کچھ آثار باقی تھے وہ بھی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے کھوکھلے اور نمائش ہی رہ گئے۔ صرف خوشی اور غم کی تقریبات پر یا تہواروں پر ایسی رسوم ادا ہوتی تھیں۔ جن پر تہذیب وتمدن کی چھاپ ہوتی تھی۔

انیسویں صدی کی دو مشہور شخصیتیں جو علمی، اخلاقی اور سماجی اصلاح کے لئے آگے بڑھیں وہ راجہ رام موہن رائے ہندوؤں میں اور سر سیّد احمد خاں مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوئے۔ راجہ رام موہن رائے بنگال کے رہنے والے تھے وہ سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بنگال میں سماجی اصلاح کا کام کیا۔ ستی کا رواج جس میں ہندو عورت اپنے خاوند کے ساتھ چتا میں جل جاتی تھی اس کو بند کرایا اور قانونی طور پر جرم تسلیم کرا دیا اور بہت سی جاہلانہ رسمیں جو ہندو سماج میں تھیں ان کو ختم کرانے کے لئے تحریک چلائی لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ اسکول کھلوائے۔ ہندو مسلمانوں میں مذہبی کٹر پن کو مٹانے کی کوشش کی اور کہا کہ ہندو مذہب اور اسلام مذہب میں ٹکراؤ کی کوئی بات نہیں ہے

اور اس کے لئے برہمہ سماج کا مذہب ایجاد کیا جو زیادہ دن تک نہیں چلا۔(۱) اگرچہ رابندر ناتھ ٹیگور بھی برہمہ سماج میں یقین رکھتے تھے۔

مسلمانوں میں سرسیّد احمد خاں نے کچھ اس طرح کا اصلاحی کام کیا اور بیجا رسمیں جو مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں ان پر روک لگانے کی کوشش کی۔ وہ بھی راجہ رام موہن کی طرح اس خیال کے حامی تھے کہ بغیر انگریزی تعلیم حاصل کئے اور سائنسی علوم کو فروغ دیئے بغیر مسلم معاشرے کی فلاح و بہبود ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے جابجا اسکول کھلوائے اور علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرائے۔ سائنٹفک سوسائٹی بنائی جس کے ممبر پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ ہندو مسلمان دونوں قوم کے لوگ تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اس بات پر صرف کردی کہ لوگ انگریزی زبان اور انگریزوں کی عادت اور خصلت پیدا کریں۔ تب ہی مسلمان دنیا کی دوسری قوموں کی برابری کر سکتے ہیں۔ اس کام میں ان کو بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ساتھی اکثر ان کے راستے کا روڑا بن جاتے تھے۔ علماء میں سے چند ایک نے ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا۔ کچھ لوگ ان کو کرسٹان بھی کہنے لگے تھے۔ پھر بھی سرسیّد اپنے ارادے پر اٹل رہے اور مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کا کام مرتے دم تک کرتے رہے۔ آخر کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے اتنی بڑی درسگاہ اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔(۱)

اب ہم اس طبقے کا ذکر کریں گے جو کہ تعداد میں بہت بڑا تھا لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے سب سے زیادہ پستی اور مفلسی کی حالت میں تھا۔ یہ طبقہ دو طرح کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ایک وہ جو کھیتی کرتے تھے اور جن کی تعداد کل آبادی کے تین چوتھائی کے برابر تھی۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ آتے تھے جو نہ زمین رکھتے تھے اور نہ کوئی خاص ہنر ان کے ہاتھ میں تھا یہ لوگ مزدور کہلاتے

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", Fifth, eded. Calcutta, 1986, P-320.

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", P243.

تھے جو کھیتوں میں کسانوں کی مدد کرتے تھے اور بدلے میں جنس یا نقد کی صورت میں مزدوری ملتی تھی۔ انیسویں صدی میں عوام کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ دیہات میں زندگی کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے دیہاتی آبادی خوشحال تھی مگر انگریزوں کے ہاتھوں میں دیوانی وغیرہ آ جانے سے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کے ہاتھوں اندھا دھند لوٹ مار ہونے کی وجہ سے یہاں کے کسان اور مزدور زیادہ تر ننگے بھوکے رہنے لگے۔ بنگال، بہار، اتر پردیش، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بار بار قحط کی بلا نازل ہوئی۔ جن میں لاکھوں لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور حکومت بالکل تماشائی بنی دیکھتی رہی۔ سارے ہندوستان میں پنجاب ایک ایسا علاقہ تھا جو کسی قدر خوشحال تھا اس کی وجہ تھی کہ پنجاب کے سکھ اور جاٹ بڑے محنتی ہوتے تھے اور اپنے کھیتوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کر لیتے تھے نیز قدرتی طور پر پنجاب میں پانچ بڑے دریا ستلج، ویاس، راوی، چناب، جہلم اور سندھ علاقے کو سیراب کرتے تھے اور قحط کی صورت میں پانی کی کوئی قلت نہیں تھی۔ دریاؤں سے نکلی نہروں سے آبپاشی جاری رہتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب تک ایسٹ اڈیا کمپنی کا کوئی اثر ورسوخ نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اس کا زیادہ تر کاروبار سمندر کے ساحلی علاقوں میں بندرگاہوں کے آس پاس ہی پھیلے ہوئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تجارتی اور سیاسی کوشش شہر بمبئی، مدراس اور کلکتہ پریسیڈینسی تک محدود رکھی۔ اس طرح جو کچھ بھی لوٹ مار ہوئی وہ انہیں علاقوں تک محدود رہی جہاں تک کلکتہ، بمبئی اور مدراس پرسیڈنسی کے اثر ورسوخ تھے۔

کسانوں اور مزدوروں کی معاشرتی زندگی ملک میں سب سے زیادہ خراب تھی۔(۱) یہ لوگ جو کچھ کھیتوں میں پیدا کرتے تھے اس کو بیچ کر سرکاری ٹیکس بڑی مشکل سے ادا کر پاتے

(۱) میری کہانی، جلد دوم، از جواہر لال نہرو، ص ۳۱۹

تھے۔کسان اپنی پیداوار کا قیمتی حصہ بیچ کر سرکاری ٹیکس اور مہاجنوں کا قرضہ ادا کر پاتے تھے۔وہ خود اور انکے بچے موٹے اناج پر زندگی گزارتے تھے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بھرپور غذا اور جسم ڈھانپنے کے لئے ضروری کپڑے بھی نصیب نہیں ہوتے تھے۔خوراک کی کمی کے علاوہ بیماریوں سے بچنے کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ چیچک، ہیضہ اور پلیگ (طاعون) جیسی بیماریاں وبا کی شکل میں ہمیشہ پھیلتی رہتی تھیں اور ہزاروں جانیں ضائع ہوتی تھیں۔وبا سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔صحت عامہ کا محکمہ خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا۔

جہاں پر مذکورہ حالات اس طرح کی ہوں وہاں پر تعلیم کا ذکر بے معنی سا ہے۔دن بھر کی محنت کے بعد پورے خاندان کو دو وقت کی غذا بھی حاصل نہیں ہوتی تھی تو حصول تعلیم کی فرصت کہاں سے آتی۔ اس لئے دیہاتی آبادی علم سے بے بہرہ تھی۔تھوڑی بہت تعلیم مندروں و مسجدوں میں' پنڈت اور مولوی اپنے طور پر مذہبی اثر قائم رکھنے کے لئے جاری رکھتے تھے جو کہ کچھ خاص برادریوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ پنڈت اور مولوی لوگ بھی مذہب کی آڑ میں کسانوں کا استحصال کرتے تھے اور چند مذہبی رسمیں جن کا اصل مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا روزی روٹی کے چکر میں اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے تھے۔اسطرح ہندوستان کا کسان اور مزدور طبقہ دنیا کے سب سے زیادہ غریبوں میں گنا جاتا تھا۔(۱)

اس کے برخلاف اگر ہم یورپ کے معاشرتی نظام پر نظر ڈالیں تو وہاں کا کسان و مزدور طبقہ صنعتی انقلاب کے بعد کافی بیدار ہو چکا تھا اور وہ اپنے حق کے لئے تحریکیں چلاتا رہتا تھا۔ دانشور بھی کسانوں و مزدوروں کے حمایتی بن کر میدان میں آئے۔کارل مارکس نے ''داس کیپٹیل'' نامی کتاب لکھی۔(۲) اور اس نے دنیا کو یہ باور کرا دیا کہ دولت کے مساوی تقسیم

---

(۱) ''میری کہانی'' جلد دوم از جواہر لال نہرو، ص ۳۱۹

(2) Karl Marx, Das Capital, Moscow, 1974, P.269

ضروری ہے ۔کسانوں اور مزدوروں کے جو حقوق سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے چھین رکھے ہیں ۔ وہ ان کو ملنا چاہیئے ۔لینن جیسا آدمی اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور جان فشانی کی بدولت زارشاہی کا تختہ پلٹ کر حکومت پر قابض ہو گیا۔

یورپی ملکوں میں انیسویں صدی میں جب کسان مزدور طبقہ اتنا بیدار ہو چکا تھا کہ حکومتوں کے سپید و سیاہ میں اس کا ہاتھ رہتا تھا لیکن بالمقابل اس کے دور میں ہندوستان کے کسان مزدور سیاسی بیداری سے محروم علوم فنون سے بیگانہ رہ کر زندگی کے بد سے بدتر حالات سے دوچار تھے۔ دراصل یہ علم سے بے بہرہ چوپایوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اس زبون حالی میں قدرتی مصائب سے زیادہ حکومت اور دانشور طبقے کا ذہنی دیوالیہ پن کا ہاتھ رہا۔ایسی صورت میں جس قسم کے تہذیب وتمدن کی ہم کو امید کرنا چاہئے وہ چند گنے چنے خوشحال اور صاحب اقتدار لوگوں میں ہی باقی رہ گئی تھی اور ان کی تعداد معمولی تھی اور غریب طبقے میں اس کا عدم وجود نہیں کے برابر تھا۔ چند گنے چنے جاگیرداروں اور نام ونمود منصبداروں کی عیش پرستی جو پانی کے بلبلے کی طرح فنا ہونے والی تھی وہ اس بات کی دلیل تھی کہ اس عیش پرستی میں افلاس زدہ کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کا عمل دخل کسی نہ کسی حد تک شامل تھا۔

انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورت حال پر بحث کرنے سے پہلے ان قومی اور بین الاقوامی عناصر پر نظر ڈالنی چاہئے۔ جو انیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات پر اثر انداز ہوئے اور جنہوں نے یہاں کے تہذیب وتمدن کو گاہ بہ گاہ متاثر کیا۔ وہ عناصر خاص طور پر تین تھے۔

۱۔ ہندو دھرم یعنی ہندو   ۲۔ مذہب اسلام یعنی مسلمان

۳۔ عیسائیت یعنی عیسائی لوگ

ہندو اس ملک میں تقریباً چار ہزار سال سے آباد ہیں جو خود کو آریہ نسل کا کہتے ہیں ۔ آریوں کی آمد سے قبل اس ملک میں دراویڑ قوم آباد تھی ۔ آریوں کی آمد کے بعد ان کو جنوبی ہندوستان کی طرف چلا جانا پڑا ۔ تامل، تیلگو، ملیالم وغیرہ زبانوں کا تعلق دراویڑ لوگوں سے ہے ۔ سندھ گھاٹی کی قدیم تہذیب کا سلسلہ ہندوستان کے دراویڑ لوگوں سے ملتا ہے ۔ (۱)

آریہ لوگ وسط ایشیاء سے مختلف زمانوں میں آتے رہے ۔ جو سندھ اور گنگا جمنا کے زرخیز علاقوں میں آباد ہوئے ۔ آریوں کی تہذیب ویدک تہذیب کے نام سے موسوم ہے ۔ ''وید مقدس'' کتاب آریوں کے دور میں تصنیف ہوئی جن کی تعداد چار ہیں اور وہ اس طرح ہیں ۔

۱۔ رِگ وید

۲۔ یجروید

۳۔ اتھروید اور

۴۔ سامیہ وید

رگ وید میں مذہبی باتوں کا ذکر ملتا ہے اور دوسرے ویدوں کے دیگر موضوعات بھی پائے جاتے ہیں ۔ ہندو زیادہ تر ویدوں کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں ۔ ویدوں میں مختلف علوم پر بے پناہ معلومات کا خزانہ ہے علمی دنیا کی سب سے پہلی کتابوں میں وید کا شمار ہوتا ہے ۔ آریاً تہذیب وتمدن ویدوں کی تعلیم پر مبنی ہے ۔ اس تہذیب کو دنیا کی قدیم تہذیبوں میں گنا جاتا ہے اور ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ ہندو معاشرے میں مذہبی عقیدہ فکر وخیال پر غالب رہا ہے ۔ اور اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ مخالف ہوائیں اور انقلابی واقعات کا کوئی اثر مذہبی عقیدے پر نہیں پڑا ۔

اسلام یا مسلمانوں کا سیاسی غلبہ بارہویں صدی عیسوی میں ہوا اگرچہ اسلام کے آغاز

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India" , P-72.

سے قبل ہی عرب لوگ تجارتی تعلقات ہندوستان کے ساحل مالا بار کے باشندوں سے قائم کئے ہوئے تھے۔موپلا نام کا عرب قبیلہ کئی صدیوں سے ساحل مالا بار پر تجارت کے کاروبار سے جڑا ہوا تھا۔اس قبیلے نے انگریزی حکومت کے زمانے میں اپنے حقوق کے لئے زبردست تحریک چلائی تھی۔دلی کی حکومت پر قبضہ محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں کیا تھا۔اس کے بعد ساڑھے چھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان پر رہی۔۱۵۲٦ء تک پٹھانوں کے مختلف خاندانوں نے دلی پر راج کیا اور اس کے بعد بابر نے مغل حکومت قائم کی جو ۱۵۲٦ء تک چلی۔۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی میں مغلوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ہندوستان کی تاریخ میں مغل دور سنہرا دور مانا جاتا ہے۔مغلوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے راجپوت جیسی بہادر اور غیرت مند قوم کو اپنا دوست بنالیا اور راجپوت رانیاں محلوں کی رونق بن گئیں۔اکبر اعظم نے اپنے حسنِ تدبیر سے ہندو معاشرے کا دل جیت لیا۔

ترک اور مغل حکمرانوں نے اپنے ساتھ ایرانی وعربی تہذیب کا تحفہ ہندوستان میں لائے تھے۔ایران اپنے عروج کے زمانے میں ایشیاء اور فرانس کے مدمقابل تھا اور فارسی زبان کا درجہ ایشیائی زبانوں میں وہی تھا جو کبھی فرنچ کا یورپی زبانوں میں تھا۔اس لئے ایران میں عربی تہذیب وتمدن کا ایک عرصہ تک ایشیاء میں بول بالا رہا۔مغلوں کے آخری دور میں اردو زبان کا حیرت انگیز ارتقا ہوا اور وہ دیکھتے دیکھتے سرکاری زبان فارسی پر غالب آگئی۔اور انگریزوں کے دور میں شمالی ہندوستان کی سرکاری زبان بھی اردو ہوگئی۔

عام بول چال کے ساتھ ساتھ اردو علمی وادبی زبان کے مقام تک پہنچ گئی اور صرف امیر و وزیر ہی نہیں بلکہ خود بادشاہ سلامت بھی اردو زبان کے دلدادہ ہوگئے اور ظفر تخلص کے ساتھ دنیائے شاعری میں بالخصوص اردو شاعری (غزل گوئی) پیدا کر گئے۔مرزا غالب اور شیخ محمد

ابراہیم ذوق اردو نثر ونظم بالخصوص اردو غزل گوئی اور قصیدہ نگاری کی بدولت شہرت وعزت کے آسمان پر براجمان ہو گئے ۔ ہندو مسلم یکجہتی کی نشانی اردو زبان بلا فرق قوم و مذہب سب کی چہیتی بن گئی ۔ اردو غزل کا تقابل دنیا کی مختلف زبانوں کی شاعری سے کرنا بے معنی ہے ۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا خمیازہ نا کردہ گناہ اس پیاری زبان کو بھگتنا پڑا اور نا عاقبت اندیش اور ہندی کے با اثر لوگوں نے اردو زبان کو در بدر کرنے کی مختلف تدبیریں بنالیں ۔

ہندوستانی معاشرہ میں مشترکہ تہذیب وتمدن کی صحیح نمائندگی اگر کوئی زبان کر رہی ہے تو وہ ہمارے خیال میں اردو زبان ہے ۔ جس میں مشتمل اسمأ سے قطع نظر سارے افعال ہندی زبان کے ہیں ۔ اور جہاں تک ان کا تعلق ہے ان میں بھی بعض دوسری زبانوں کے الفاظ کو خاطر خواہ جگہ ملی ہے گنگا جمنی ہندوستانی تہذیب کو اگر اردو تہذیب کے نام سے پکارا جائے تو غلط نہ ہوگا ۔

ہندو مسلمان قریب قریب ایک ہزار سال سے رہتے چلے آرہے ہیں پھر بھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ابتدا میں دونوں قریب قریب اجنبی تھے ہندوؤں کا مذہب زبان ، رہن سہن کا ڈھنگ اور زندگی کے مختلف طور طریقے ان کے اپنے تھے اور جو صدیوں سے ان کی گھٹی میں پڑے تھے ۔ وہ لوگ تعلیم یافتہ اور مہذب تھے ۔ مسلمان قومی ، ملکی ، مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے ہندوؤں سے بالکل جدا تھے ۔ ہندو مسلمانوں کا باقاعدہ پہلا واسطہ فاتح اور مفتوح کی صورت میں ہوا ۔ ہندو اپنی آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں غالب تھے ۔ پھر ملک بھی ان کا اپنا تھا مسلمان صرف فوجی طاقت کی وجہ سے حاکم بن گئے تھے ۔ لیکن جب دونوں نے سمجھ لیا کہ مل جل کر رہنے کے سوا چارہ نہیں ہے تو فاتح نے اپنا غرور اور مفتوح نے اپنی نفرت پر قابو کر کے بھائی چارے کو فروغ دیا اور ایک دوسرے کی خوشی اور غم کے قریب ہو گئے ۔ اجنبی پن دور ہوتا گیا اور بھائی چارے کی فضا پھیل گئی ۔ مذہبی کٹر پن کی جگہ رواداری اور مروت نے لے لی اور بیگانے اپنے بن گئے اور

ہمسایوں کی طرح پیار محبت سے زندگی گزارنے لگے۔

جیسا کہ تہذیب وتمدن کے سلسلے میں سرسیّد نے بارہا اپنی تقریر میں کہا ہے کہ ''تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ قومی ترقی قومی تعلیم پر منحصر ہے بس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے کی کوشش کریں''۔(۱) وہ انسان میں تہذیب وتمدن، دوراندیشی پیدا کرنا تعلیم کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی سرسیّد کی یہی کوشش رہی کہ ہندوستانیوں میں فروغِ علم ہوا اور وہ اپنی تہذیب وتمدن اور تعلیم کے بل بوتے پر ترقی کی منزلیں طے کریں۔ وہ مسلمانوں کی ابتری دیکھ کر صرف تعلیم ہی کی طرف ان کو رجوع کرنا چاہتے تھے اور ان کا پختہ یقین تھا کہ جب مسلمانوں میں تعلیم عام ہوگی تو وہ خود سیاستِ وقت کی طرف رجوع ہوں گے اور اس وقت وہ صحیح رہنمائی کرنے کے زیادہ موقف ہوں گے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیمی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تمام میدانوں میں دوسری قوموں کے ہم پلہ ہو جائیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سرسیّد کی زندگی اور کارناموں کے بہت سے پہلو ہیں۔ زندگی کی تمام حاجتوں اور ضرورتوں کا کون سا میدان ایسا نہیں ہے جس میں سرسیّد نے مسلمانوں کی رہنمائی نہ کی ہو۔ سیاست سے لیکر تعلیم، ادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، مذہب حتیٰ کہ روزمرہ کے اخلاقیات تک میں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔

مسلمان جو ایرانی تہذیب وتمدن اپنے ساتھ لائے تھے وہ ہندوستانی تہذیب وتمدن سے مختلف تھا۔ ایرانی تہذیب وتمدن کا کارگر اصول یہاں کام آیا اور مسلمانوں میں رہن سہن، رسم و رواج، بات چیت، لباس اور خوراک میں بھی یکسانیت آ گئی۔ غرض حاکم اور محکوم ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھنے لگے۔

---

(۱) مقالات قومی سمینار، ایجوکیشنل کانفرنس، مرتبہ ریاض الدین شروانی، سلطان جہاں منزل علی گڑھ ۲۰۰۰ء، ص ۵۸

ہندوستانی معاشرے میں تیسرا عنصر عیسائیوں کا تھا جو تعداد میں بہت کم تھے اور چھ ہزار میل دور سات سمندر پار کے رہنے والے تھے وہ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی، انگلینڈ کی تجارتی کمپنی تھی جو اکبر کے زمانے سے بغرض تجارت ہندوستان آئے تھے اور شہنشاہ اکبر نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر جہاں اب بمبئی ہے وہاں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس نے اپنا کاروبار بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں قائم کر لیا تھا اور ان علاقوں میں تجارتی کوٹھیاں بھی تعمیر کروائے۔ اورنگ زیب کے زمانے تک کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا مگر اس کی وفات کے بعد مغل حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور بالآخر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس خاموشی اور چالبازی سے ہوا کہ مغل حکمرانوں کو اس کی بھنک بھی بہت دنوں تک نہیں لگی۔ مغل حکومت کا زوال بتدریج ڈیڑھ سو سال میں ہوا اور اسی دوران انگریزوں نے اپنی چالبازی سے اپنا اثر ورسوخ زندگی کے مختلف شعبوں میں قائم کر لیا جب عوام انگریزوں کی چالبازی سے بہرآور ہوئے تو اس سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بڑی چالا کی سے تجارت کے علاوہ ملک کے سیاسی، معاشی اور مذہبی معاملات میں بھرپور دخل اندازی کے اسباب مہیا کر دیئے تھے۔

ملک کے انتظامی معاملے میں غلبہ اس وقت انگریزوں کا شروع ہو گیا تھا جب بنگال اور بہار کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۷۶۴ء میں حاصل ہوئی ان علاقوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا وہاں پر تعلیم و تربیت کا نظام اس طرح قائم کیا جاتا تھا کہ اسکولوں میں پڑھنے والے بچے نہ صرف انگریزی سیکھیں بلکہ عیسائی مذہب کے پیرو بن جائیں۔ ایسے سیکڑوں ابتدائی اسکول، ثانوی اسکول اور کالج قائم کئے گئے جہاں پر انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی تہذیب تمدن کا پرچار ہوتا

تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی تعداد ہندوستان میں ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی تھی کہ جو ہندوستانی تہذیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ مشرقی تعلیم کو بھی بیکار اور بے مصرف سمجھتے تھے۔ بڑی تعداد میں پست اقوام کے لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کی تعداد بمبئی، مدراس اور آسام وغیرہ میں باقی ملکوں سے زیادہ ہے۔ اس صورت حال سے اعلیٰ خاندان کے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو اونچی اونچی نوکریاں ملنے لگیں اور اونچے سرکاری عہدوں پر پہنچنے والے ہندوستانی انگریز افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو انگریزی وضع قطع میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس طرح اس مشترکہ تہذیب وتمدن پر جو ہندو مسلم بھائی چارے سے وجود میں آیا تھا گہری چوٹ پہنچی۔ انگریزی تعلیم کا رواج جیسے جیسے بڑھا لوگوں کے خیالات میں مذہب سے بیزاری پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ بعض لوگ مذہب کو خیر آباد کہنے پر بھی پیش پیش رہنے لگے۔ غرض کہ مشترکہ تہذیب وتمدن مغربی اثرات کی وجہ سے درہم برہم ہو گیا۔

اس سلسلے میں سرسیّد احمد خاں نے غیر متناہی اور بے شمار موضوعات بالخصوص معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ دین اسلام اور مذہب کی خدمات میں نمایاں رول بھی ادا کیا، عیسائی مبلغین، مصنفین اور مورخین نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے تہذیبی وثقافتی ورثہ اور قرآن وحدیث اور آنحضور ﷺ کو موردِ الزام قرار دیا، آپ نے ان مبلغین ومورخین کے بے سروپا الزامات کے علمی وتحقیقی جوابات دیئے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات ملحوظ خاطر رکھا کہ انہوں نے یک طرفہ تمام عیسائی مبلغین ومورخین کو موردالزام قرار نہیں دیا بلکہ اگر کسی مستشرق نے اسلام کے سلسلے میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے تو آپ نے اس کے علمی صداقت کا جواب بھی دیا ہے۔ سرسیّد کی تحریروں میں دونوں ہی طرح کے خیال رکھنے کا ذکر مورخین نے

کیا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ تمام مخالفتوں اور عداوتوں کے باوجود مذہبی حیثیت سے ہم عیسائیت سے بہت قریب ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسی مذہب والوں کو ہمارا دوست کہا ہے سر سیّد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

> ''اور جہاں تک ہم سے ہو سکے ہم انگلش گورنمنٹ کے وفادار ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ عیسائی مذہب کا طرفدار ہوں۔ عیسائی مذہب کا جیسا کہ مخالف ہوں بلکہ دشمن ہوں اور جیسی جیسی سخت کتابیں میں نے عیسائی مذہب کے خلاف لکھی ہیں شاید کسی نے لکھی ہوں گی۔ گو وہ مذہب کیسا ہو مگر خدا نے اسی مذہب والوں کو ہمارا دوست کہا ہے۔'' (۱)

سر سیّد نے مذہب اسلام اور عیسائیت کے مابین حائل ہو جانے والی خلیج کو منقسم کرنے کے لئے توریت وانجیل کی تفسیر بھی لکھی تا کہ دونوں مذاہب کے اختلافات رفع دفع ہو جائیں چنانچہ ''تبین الکلام فی تفسیر التورۃ والانجیل علی ملتہ الاسلام'' کے پہلے مقدمے میں انبیاء کی آمد اور ان کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انبیا ومرسلین ایک دین صادق کے ساتھ اس دنیا میں مبعوث کئے گئے۔ البتہ شریعت جدا جدا تھی مسلمانوں کو تمام سابقہ انبیا ورسل پر ایمان لانا ضروری ہے۔ (۱) اس کتاب میں سر سیّد نے جگہ جگہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالے سے وضاحت کی ہے اور انہیں احادیث وآیات کے حوالے سے یہ بھی منکشف کیا کہ ہم مسلمان توریت، زبور صحف انبیاء اور اناجیل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) سر سیّد احمد خاں، خطبات سر سیّد، مرتب محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۴۹

(۲) فکر ونظر، سر سیّد نمبر، اکتوبر ۱۹۹۲ء، لیتھو آفسیٹ، اچل تال جی ٹی روڈ، علی گڑھ، ص ۱۷۸

(۳) ایضاً، ص ۱۷۸

مذہب عیسائیت اور مذہب اسلام میں قربت پیدا کرنے کے لئے اور اختلافات کے راستے کو بند کرنے کی غرض سے سیر سید نے ایک رسالہ ''احکام طعام اہل کتاب'' کے عنوان سے تصنیف کیا جس میں انہوں نے آیات قرآنی، احادیث نبوی، فقہ اور اقوال مفسرین سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز ہی سے مغل سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ پلاسی کی لڑائی میں سراج الدولہ کی شکست ۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کلائیو کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ سراج الدولہ اگرچہ ہوشیار اور بہادر صوبہ دار تھا مگر اپنے سالے میر جعفر کی دغابازی سے لڑائی میں مارا گیا۔ یہ نواب بنگال کی شکست نہیں تھی بلکہ مغلیہ سلطنت کی شکست تھی۔ اس لئے شاہ عالم نے نواب اودھ سعادت علی خاں کو کلائیو کی سرکوبی کے لئے بنگال بھیجا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر نواب اودھ کی شکست ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ عالم کو انگریزوں سے مجبوراً صلح کرنی پڑی اور مغل سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوگئی اور دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ شاہ عالم نے بہار اور بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیئے۔ اس کے بدلے میں پچیس لاکھ روپیہ منظور کر دیا۔ مغل سلطنت کا ایک بڑا زرخیز علاقہ جس کی آبادی موجودہ راجستھان، اتر پردیش اور مدھیہ پردیش سے زیادہ تھی رہن رکھ دیا گیا اس بات کو قدرت کا کرشمہ یا قسمت کی ستم ظریفی سمجھئے کہ سات سمندر پار کر کے غیر ملکی تجارت پیشہ چند لاکھ افراد گورے نے مغلیہ سلطنت پر اپنا قبضہ جما لیا اور انہیں اپنی سیاسی بساط کا مہرہ بنا کر اپنی مرضی کے مطابق چلاتے رہے۔

اورنگ زیب نے پچیس سال کی شدید محنت سے سارے جنوبی ہندوستان کو مغل سلطنت کے ماتحت کر لیا تھا۔ اس کی اولاد اس درجہ ناکارہ ثابت ہوئی کہ وہ پچیس لاکھ روپیہ کی حقیر رقم

اپنے بزرگوں کی عزت وثروت کا سودا کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ انجان پردیسی لوگ جو مذہب رنگ ونسل وضع قطع سے بالکل مختلف تھے۔ اپنی تجارتی بساط پر سیاسی داؤ پیچ اسطرح سے کھیلتے رہے کہ ہندوستان کے تمام سیاسی رسومات دیکھاتے چلے گئے۔ وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ سنگ بر آوردہ لوگ جن کو اپنی تہذیب وتمدن، علم وحکمت پر بہت فخر تھا، حیران ہوکر رہ گئے۔ مگر تعجب اس بات کا تھا کہ سارا ہندوستانی معاشرہ جن کے دائرے میں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے انگریزوں کی مکاری اور چالبازی کو سمجھ نہ سکے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مٹھی بھر انگریز ہمارے ملک پر قابض ہو گئے۔ چند خودغرض لوگوں نے اپنے معمولی عارضی فائدے کے لئے بڑے نقصانات کی طرف توجہ نہ کی اور سونے کی چڑیا صدیوں کے لئے انگریزوں کے قبضے میں آ گئی۔ ان مفاد پرست ہندوستانیوں کے عقل وشعور پر علامہ اقبال نے بھی ماتم کیا ہے :

ؔ ''جعفر از بنگال وصادق از دکن

ننگِ ملت، ننگ دین، ننگِ وطن''

بادشاہ سلامت کو ظلِ سبحانی سمجھنے کا عقیدہ دل و دماغ پر اسقدر حاوی تھا کہ عوام بادشاہ سلامت کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے کے عادی تھے۔ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے بعد شاہ عالم کا شاہی اقتدار برائے نام تھا وہ ہر کام کمپنی کے اشارے پر انجام دے رہے تھے انگریزوں کو محکمۂ دیوانی کی سپردگی پر کسی نے کوئی آواز نہیں اٹھائی اور رعایا کمپنی کے کارکنوں کی زیادتی اس لئے برداشت کرتے رہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کارکن بادشاہ کی طرف سے معمور کئے گئے ہیں۔ دیوانی قانون میں استمراری بندوبست نافذ کر کے اور بھی جلے پر نمک چھڑ کا گیا۔ انگریز زمیندار بنگال بہار میں نیل کی کھیتی کے مالک بن گئے۔(۱)

مثل مشہور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے اسی طرح وہ ہندوستانی عوام

---

(1) Nehru Jawaharlal, "Glumpses of Worl History" , P-426.

جنہوں نے انگریز حکام کے ہاتھوں ظلم اور جبرَ سہے۔ دراصل وہ اتنے ہی قصور وار تھے کہ ان کو حکومت کے معاملے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔ امراء و وزرا جیسا چاہتے تھے کرتے تھے اور ان کی غلطیوں کی سزا بیچاری رعایا برداشت کرتی تھی۔ رعایا میں زیادہ تر آبادی کاشتکاروں کی اور مزدوروں کی تھی یہ لوگ راج کاج کے معاملوں سے ہمیشہ بے خبر تھے اس وقت دیہاتی کسانوں کی آبادی ہندوستان میں تین چوتھائی سے زیادہ تھی اسی لئے آبادی کا بڑا حصہ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا تھا۔

ہندوستان میں ہندو مسلم مشترکہ معاشرے کی بنیاد اس وقت پڑی جب مسلمانوں میں بارہویں صدی عیسوی میں اپنی حکومت ہندوستان میں قائم کی۔ اگرچہ دنیا کے دو بڑے مذہبی فرقے ہند اور مسلمان پہلی مرتبہ یکجا ہوئے اس طرح دنیا کے دو فرقے جن کا تہذیب و تمدن جدا گانہ تھا، ہمسایوں کی طرح رہنے لگے اور ایک دوسرے سے ربط ضبط کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

ہندوستان کی دیہاتی آبادی پر حکومت کے ردّ بدل کا کوئی اثر بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کاشتکار لوگ اپنے کاموں میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ ان کو یہ پتہ نہ تھا کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے۔ پٹھانوں کا راج کتنے دنوں چلا یا مغل کب دہلی پر بیٹھے ان باتوں سے دیہی آبادی کو کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ کاشتکار چاہے ہندو ہو یا مسلمان دونوں کے روزانہ کے مشغلے یکساں تھے۔ حکومتیں جوار بھاٹا کی طرح آتی جاتی رہیں۔ بادشاہ بدلتے رہے مگر کسان جہاں تھے وہیں رہے۔ کھیتی کی غرض سے کسان کا رشتہ کسی موڑ پر بھی ڈھیلا نہیں ہوا۔ نیکی اور صلح پسندی جو دیہاتی ماحول کی دین ہے کاشتکاری شناخت بن گئی۔ سیاسی فوج بندی سے ان دنوں کا شتکار کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ہمدردی اور مہمان داری میں کاشتکاروں کی برابری دوسرے پیشے والے نہیں کر سکتے تھے۔

تعلیم کی عام کمی کی وجہ سے وہ معاشی ، سیاسی اور اقتصادی میدان میں ہمیشہ سے پسپا ہوتے رہے اگر چہ جنگ آزادی میں مہاتما گاندھی کی رنہمائی میں چلنے والی تحریک میں کاشتکاروں نے جان اور مال کی بڑی قربانی دی پھر بھی قومی آزادی کا فائدہ کاشتکار طبقے کو ضرروت کے مطابق نہیں حاصل ہوا۔ سیاسی رہنما اس حقیقت کوتسلیم تو کرتے رہے مگر غلبہ ہمیشہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا ہی رہا۔ اس کی خاص وجہ تعلیم کی کمی تھی وہ اپنے حقوق کوتسلیم کرانے میں ناکام رہے۔ وہ صورت حال جواوپر بیان کئے گئے ہیں وہ موجودہ دور کے پس منظر کو پیش نظر رکھ کرتحریر کی گئی ہے۔ اگر انیسویں صدی کے کاشتکاری نظام کا تصور کیا جائے تو جو کچھ تاریخ بتاتی ہے وہ یہی ہے کہ کاشتکاروں کی زندگی حیوانوں سے برائے نام ہی بہتر تھی۔ جس طرح صبح آنکھ کھلتے ہی جانور پیٹ بھرنے کی تگ ودو میں لگ جاتے ہیں اور سارادن اسی فکر میں لگے رہتے ہیں اسی طرح کسان بھی صبح سے شام تک اناج پیدا کرنے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ بقول جواہرلال نہرو ’’دنیا کے افلاس زدہ ملکوں میں ہندوستان کے لوگوں کی حالت بدتر تھی اور انسانی تہذیب وتمدن جاگیردارانہ انداز پر قائم تھا جو بیسویں صدی کے آغاز تک باقی رہا۔‘‘(۱)

یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ تہذیب وتمدن کی جگہ سرمایہ دارانہ تہذیب وتمدن نے لے لیا تھا کیونکہ مغربی ممالک میں جاگیرداری پر سرمایہ درای غالب آچکی تھی اور جاگیردار زیادہ خوشحال ہوگئے تھے۔ مشرقی ملکوں میں اس وقت صنعتی ترقی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ وہ جاگیرداری کے نشے میں چور تھے اور وہ حالات جو مشینوں کے ذریعہ ایجاد ہوئے ان سے صنعتی پیداوار میں بے حد اضافہ ہوا اور دستکاری سے حاصل پیداوار اس کے مقابلے میں برائے نام رہی مثلاً سوتی کپڑا جو کارخانوں میں تیار ہوتا تھا وہ مقدار اور خوبی میں اس سے کہیں بہتر تھا جو

---

(۱)’’میری کہانی‘‘ حصہ دوم، جواہرلال نہرو، ص ۱۰۵

ہندوستان میں ہاتھ سے بنا ہوا کپڑا اپایا جاتا تھا۔ اسی طرح گجرات اور ڈھاکے میں کپڑوں کی جو صنعت تھی اس کو نقصان اٹھانا پڑا۔ چنانچہ مشینوں کے مقابلے میں یہ صنعتیں ختم ہوگئیں یا پھر جان بوجھ کر انگریزوں نے اسے پنپنے نہیں دیا۔ اس طرح باہر سے آئے ہوئے تاجر پیشہ لوگ زیادہ طاقت ور اور خوشحال ہو گئے چنانچہ یہ برطانوی سلطنت کا غلبہ ہندوستان میں بڑھتا چلا گیا اور وہ دھیرے دھیرے غلام بنتے چلے گئے۔

انیسویں صدی کا دور برطانیہ کی سلطنت کے لئے مفید ثابت ہوئی اور ایشیائی ملکوں میں نو آبادیاتی نظام اپنے بربریت کے ساتھ قائم رہا۔ ہندوستان ایران اور عرب جیسے قدیم تہذیب یافتہ ملک زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے اور جدید تہذیب یافتہ مغربی ممالک کی غارت گری کا شکار ہو گئے۔

مغربی علوم کا چرچا ساری دنیا میں ہو گیا۔ انگریزی زبان اور انگریزوں کی عظیم سلطنت جس میں سورج نہیں ڈوبتا تھا اتنے ترقی یافتہ ہو گئے کہ زیادہ تر قومیں ان کی تہذیب وتمدن کو پسند کرنے لگے اور مشرقی تہذیب وتمدن بے جان اور پژمردہ ہو کر رہ گئی۔ لہٰذا انیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیب وتمدن کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

بابِ دوم

انیسویں صدی
کا نظام تعلیم

(۱) سرکاری اسکول، کالج، یونیورسٹی

(۲) غیر سرکاری دینی مکاتیب، مدارس

(الف) سرکاری :(اسکول، کالج، یونیورسٹی)

انیسویں صدی کے نظام سے متعلق بہت کم مواد تاریخی کتابوں میں دستیاب ہیں اس نظام تعلیم کی نشونما برطانوی عہد میں ہوئی۔ اس کے میں تعلیم کی باگ ڈور دیسی نظام تعلیم کے تحت تھی لیکن جلد ہی مشنریوں نے مغربی علوم کی تبلیغ اور انگریزی زبان وادب کے متعلق لوگوں میں ایک طرح کا ذوق وجذبہ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ سرکاری حکام اور کچھ روشن خیال ہندوستانی جو اس طرح کی تعلیم سے سرفراز ہو چکے تھے اور اس کے قدردان بھی تھے ان کے ساتھ ملکر اس نظام تعلیم کی تبلیغ واشاعت میں ساتھ ہو گئے۔ جن کی وجہ سے اس نظام تعلیم نے بہت ہی جلد ترقی کر لی۔ سب سے پہلے تو یہی وکٹورین عہد کے انگریز کو اس بات پر مکمل یقین تھا کہ ان کی زبان وادب، اور ان کی تعلیم کے طریقے دنیا بھر میں سب سے بہتر تھے اور یہ ہندوستانیوں کے لئے بہت ہی مناسب ہوگا کہ وہ اس کو ہو بہو اپنا لے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے کے ہندوستانی اپنے اور مغربی تمدن کے تقابل سے کچھ مبہوت ہو گئے تھے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ملک کے لئے برطانوری نمونوں کی نقل سے اچھی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ اس نئے نظام تعلیم کے تحت طلبا اور طالبات کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہونے کے آثار نظر آرہے تھے۔ جس سے اس نظام تعلیم کی اہمیت اور مقبولیت بہت ہی زیادہ ہو گئی۔

سید نوراللہ بار ایٹ لا نے اپنی تصنیف ''تاریخ تعلیم ہند'' میں لکھا ہے کہ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں ایسی دیسی تعلیم سے متعلق معلومات کا ماخذ ناکافی ہے

اور نامکمل ہے۔(۱) ہمارے خیال میں جو کچھ معلومات فراہم ہوئیں وہ بھی شک کے دائرے میں رہی ہیں۔ یہ معلومات بھی اس حصہ کی ہیں جہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط تھا اور باقی ملک میں کیا صورت حال تھی اس کی کوئی تاریخی اطلاع نہیں ہے۔ جو معلومات ایسٹ انڈیا کمپنی نے فراہم کی ان کو بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں سمجھنا چاہئے۔ بات یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اپنے علاقے میں تعلیم کا انتظام کرے اسی کے متعلق ہر وقت کمپنی کے گورنر جنرل کو تعلیم کے بارے میں ہدایتیں دی گئی تھیں۔ لہٰذا گورنر جنرل نے بمبئی، مدراس اور کلکتہ پریسیڈنسی کے حکام کو مقامی آبادی کی تعلیمی صورت حال کے بارے میں جائزہ لینے کے لئے حکم دیا تھا۔ اس موقع پر اعلیٰ حکام نے اپنے ماتحتوں کے ذریعہ گھر گھر جا کر بچوں کی تعلیم کا جائزہ لینے کے لئے کہا اور یہ بھی ہدایت دی کہ بچوں کے والدین اور مدارس کے اساتذہ سے مل کر یہ تحقیقات کرائی جائیں کہ کس عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور ان کا معیار تعلیم کیا ہے۔

مذکورہ بالا اطلاعات مدارس اور کلکتہ پریسیڈنسی میں کسی قدر صحیح طور پر فراہم ہوئیں، کیونکہ وہاں پر تعلیم یافتہ ذمہ دارانہ لوگوں نے کیا کیا تھا۔ لیکن بمبئی پریسڈنسی میں جو کچھ معلومات فراہم کی گئیں وہ بعد میں ناقابل اعتبار پائی گئی۔ بمبئی میں یہ کام کم تعلیم یافتہ نچلے طبقے کے ملازمین کے ہاتھ میں تھا۔

تعلیم کے سلسلے میں کمپنی ۱۸۱۳ء تا ۱۸۵۴ء کے دستاویزوں کے متواتر احکامات ملتے رہتے تھے کہ اپنے علاقے میں بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری کمپنی کی ہوگی اور اخراجات بھی کمپنی کو برداشت کرنے ہونگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائرکٹروں نے چارٹر کے مطابق احکامات جاری کردیئے۔ لیکن اخراجات کا بندوبست نہیں کیا۔ کمپنی کے کارکنوں نے مجبوراً ایسے مدرسوں کو کچھ امداد بھی دیئے جن کو مقامی لوگ پہلے سے چلا رہے تھے۔ اور کچھ چندہ فراہم کرنے کے اسباب

---

(۱) تاریخ تعلیم ہند، سید نور اللہ، لاہوتی پرنٹ ایڈز، پہاڑی املی جامع مسجد، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲

مہیا کر دیئے تھے۔ اس سلسلے میں زیادہ تر کام مشنری کے ان پادریوں نے کیا جو ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی خاطر آئے تھے۔ اور جنہوں نے جگہ جگہ اسکول کھول کر بظاہر تعلیم کا جال پھیلا دیا تھا۔ دراصل اس کے پردے میں وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ مشن کے ہی لوگوں نے یا تو مقامی اسکولوں میں شرکت کر کے اپنا کام جاری رکھا یا پھر اپنے اسکول کھول لیئے۔ اس طرح سرکاری اسکول تو برائے نام ہی قائم کئے گئے لیکن امدادی اور مشن کے اسکولوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شروع میں ایسے اسکول صرف ابتدائی تعلیم کے لئے مخصوص تھے۔ جن میں تعلیم مقامی زبان میں زیادہ اور انگریزی زبان میں صرف اس قدر تھی کہ بچے انگریزی زبان کے ابتدائی حروف تہجی سیکھ لیں اور کسی قدر عیسائی مذہب سے واقف ہو جائیں۔ ایسے اسکولوں کی تعداد اگر چہ بہت زیادہ تھی مگر ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ نیز انگلینڈ سے اس قسم کی ہدایتیں ملتی رہتی تھیں کہ انگریزی زبان اور عیسائیت کی تبلیغ پر زور دیا جائے تا کہ مقامی لوگ انگریزی تعلیم سے مانوس ہو جائیں اور ان کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ثانوی اسکول جن میں آٹھویں یا دسویں درجہ کی تعلیم ہوتی تھی زیادہ تر کھولے گئے۔ لیکن اخراجات کی دقت درپیش تھی۔ اس کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ اس طرح کے مشن اسکول بھی چلائے جائیں اور عیسائی مشن کے اخراجات سے مدرسوں کی ضرورت کی تکمیل کی جائے۔ ثانوی اسکولوں کے لئے باصلاحیت استادوں کی ضرورت تھی اور باصلاحیت استاد اس زمانے میں انگریز ہی ہو سکتے تھے۔ جو عیسائی مشنریوں میں سے ہی تلاش کر لئے جاتے تھے وہ لوگ کم خرچ اور بالانشین ہوتے تھے۔ ثانوی اسکولوں کے ساتھ کالج کا بھی قیام عمل میں آیا اور ایسے بڑے ادارے زیادہ تر مدراس اور بمبئی پریسڈنسی میں قائم کئے گئے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ انگلینڈ میں عام تعلیم کی ذمہ داری حکومت کی نہیں تھی

بلکہ پرائیویٹ انجمنیں اور خیراتی ادارے کے ذمہ تھی اور اسی وجہ سے یہ اسکول چیریٹی اسکول کہلاتے تھے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر بھی یہی چاہتے تھے کہ تعلیم کی ذمہ داری ہندوستان میں کمپنی کی نہ ہو مگر پارلیمنٹ کے چارٹر کی رو سے یہ ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔ نیز یہ بھی حکم تھا کہ کمپنی اپنے کارخانوں میں پادری رکھے اور ہر جہاز میں پانچ ٹن کا ایک چپلن رکھا جائے۔ کمپنی کو اپنی تمام چھاونیوں اور فیکٹریوں میں اسکول قائم کرنے کی ہدایت بھی دی تھی۔ دراصل کمپنی سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ عام طور سے عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ کرے مگر اپنے ہندو ملازمین میں عیسائی مذہب پھیلائے اور کم سے کم عیسائی بچوں اور ہندوستانی بیویوں سے پیدا ہوئے کمپنی کے سپاہیوں کے بچے اور اینگلو انڈین بچوں کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقدس فریضہ سمجھے۔(۱) انگلینڈ میں چیریٹی اسکول غریب اور یتیم بچوں کے لئے قائم کئے گئے تھے مگر ہندوستان میں کمپنی کے ذریعہ کھولے گئے اسکولوں کا نام بھی چیریٹی اسکول پڑ گیا۔ ابتدا میں خیراتی اسکول پرتگالی زبان میں چلتے تھے کیونکہ کارخانوں میں زیادہ تر ملازم پرتگالی ہوتے تھے مگر جلد ہی یہ خیراتی اسکول انگریزی زبان میں بھی چلائے جانے لگے اور اس کے تعلیمی اخراجات متروکہ جائدادوں عطیوں اور گاہ بہ گاہ کمپنی کی امدادی رقم سے پوری کی جاتی تھی۔ اس طرح کا پہلا اسکول مدراس میں سینٹ میری چیریٹی اسکول (Sent Marry Charity School) تھا اور دوسرا لیڈی کیمبل فیمیل آرفن (Lady Cambel Female Orfan) بمبئی میں قائم کیا گیا۔ یہ اسکول مانی ٹوریل سسٹم سے چلتا تھا۔ اس سسٹم کی نقل بعد میں انگلینڈ میں بھی ہوئی۔ ہندوستان میں اس طرح کا طریقہ قدیم مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں رائج تھا۔ اس طریقہ سے اچھی صلاحیت والے بڑے طالب علم چھوٹے درجے کے طالب علموں کو پڑھاتے تھے۔ اور اس طرح استاد کا قیمتی وقت بچ جاتا تھا یہ ایک فخر کی بات تھی کہ اپنے تعلیمی نظام پر گھمنڈ کرنے والے مغربی ماہرینِ تعلیم کو قدیم مدرسوں میں

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص۵۸

رائج طریقۂ کار کی افادیت کا احساس ہوا۔ اور یہ طریقہ نہ صرف ہندوستان میں کمپنی کے اسکولوں میں رائج کیا گیا تھا بلکہ انگلینڈ کے چیریٹی اسکولوں میں بھی کیا گیا۔

مِشن کے پادریوں نے انہی اسکولوں میں بڑی محنت اور لگن سے کام کیا تا کہ ان پر ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا الزام عائد نہ ہو اور عام لوگوں میں پادریوں کا اثر و رسوخ قائم ہو جائے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی نیت پر شک نہ ہو اور تجارت کو نقصان نہ پہنچے۔ اس لئے عیسائیت کی تبلیغ کھلم کھلا نہ ہوئی مگر اسکولوں میں تعلیم کی آڑ میں مِشن کا یہ کام جاری رہا۔

۱۸۵۵ء میں خیراتی اسکولوں کی تعداد دو ہزار آٹھ سو دس اور طلبا کی تعداد ایک لاکھ پچپن ہزار سترہ تھی۔ ثانوی اسکولوں کی تعداد دو سو اکاسی اور طلبا کی تعداد سات ہزار پانچ سو تیس تھی۔ (۱) اسکول جانے والے طلباء کی یہ تعداد اگرچہ زیادہ تھی۔ مگر آبادی کے لحاظ سے چار پانچ فیصد سے زیادہ نہ تھی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مغلیہ سلطنت کا سارا علاقہ برطانوی حکومت کے قبضے میں آ گیا اور تعلیم کا نظام بھی نئے سرے سے جاری ہوا۔ دیہات میں مکتب یا اسکول کھولے گئے قصبوں میں ثانوی اسکول قائم ہوئے۔ بڑے شہروں میں کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں جن میں اعلیٰ تعلیم کا اہتمام تھا۔ یونیورسٹیاں زیادہ تر امتحان لیکر ڈگریاں دیتی تھیں۔ مگر تعلیم یونیورسٹی کے ماتحت کالجوں میں دی جاتی تھی۔ ان میں کچھ اقامتی کالج اور یونیورسٹیاں بھی تھیں۔

مکتبوں سے لے کر کالجوں تک زیادہ توجہ انگریزی زبان پر رہی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے حکم نامے کے ذریعہ عوام کو یہ پیغام دیا کہ کسی بھی مذہبی معاملات میں حکومت کو دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، پھر بھی کچھ لوگوں کے دلوں میں شبہات باقی تھے۔ عام طور پر

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص۳۵۱

ہندوستانیوں نے انگریزی تعلیم کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا۔لہٰذا انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان سے نفرت کا جذبہ کافی عرصے تک ہندوؤں میں کسی قدر کم اور مسلمانوں میں زیادہ ہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہات بے بنیاد نہ تھے۔سرسیّد اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھتے ہیں کہ ''مشنری اسکولوں میں امتحانات مذہبی کتابوں سے لیا جاتا اور جو لڑکا عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتا اس کو انعام ملتا تھا''۔ (۱) ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ دیہاتی مکتبوں کے قیام کو لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مکتب عیسائی بنانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ڈپٹی انسپکٹر آف پولس کو لوگ اس زمانے میں کالا پادری کہتے تھے اور ان کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔یہ افسران بھی داخلے کے لئے حاکمانہ انداز اختیار کرتے اور کہتے تھے کہ اسکول میں داخلہ سرکاری حکم کے مطابق لازمی قرار دیا گیا۔یہ بات اور زیادہ شک پیدا کرتی تھی کہ حکومت اپنے عیسائی مذہب کی تبلیغ میں ایسے حصہ دار ہے جو چند وسیع النظر اہل علم ہندوستانی انگریزی تعلیم کو مفید مانتے تھے، لیکن کٹر مذہبی قسم کے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم سے بچوں میں عیسائیت سے لگاؤ ہو جائے گا اور کم عمر کے بچے اپنے مذہب سے بیگانہ ہو جائیں گے لیکن کچھ مسلمانوں نے ان اسکولوں کی پڑھائی کے لئے عالموں سے فتوے حاصل کر لئے چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو اس زمانے کے ہندوستان کے جیّد عالم تھے ان سے بھی فتویٰ مانگا گیا۔مگر شاہ صاحب نے ان اسکولوں میں داخلے کو جائز ٹھہرایا۔بشرطیکہ وہاں پر کھلم کھلا مذہبی تبلیغ نہیں کی جاتی ہو، اسی شک کو دور کرنے کے لئے سرسیّد کو بھی اپنی زبان اور قلم کا بے پناہ زور صَرف کرنا پڑا۔ان کا یہ ماننا تھا کہ انگریزی زبان اور جدید سائنس کی تعلیم مذہب کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی اور اس دور میں اس تعلیم کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

---

(۱) اسباب بغاوت ہند، سرسیّد احمد خاں (جلد دوم)، ترمیم واضافہ، فوق کریمی، محبوب المطابع، برقی پریس دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۶۳

اگر چہ سرسیّد اوران کے رفقاء جدید سائنس کے بڑے پیرو کار تھے مگر مشنری اسکولوں میں جو حالات تھے ان سے بدظن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پادریوں کے طریقۂ کار سے بچوں کے اعتقاد میں کمزوری پیدا ہونی لازمی ہے۔ اس لئے ایک خاص تقریر میں انہوں نے مسلمانوں کو تنبیہہ کی اور کہا کہ :

''مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا اور ان کو غیرت نہیں آئی۔'' (۱)

اسی طرح ایک اور تقریر میں انہوں نے کہا کہ :

''میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کے قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔'' (۲)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسیّد انگریز اساتذہ اور منتظمین کالج کے طریق کار جو اس وقت رائج تھے اس سے مطمئن نہ تھے۔ مشرقی عقائد اور تہذیب وتمدن کی پامالی کا خطرہ اس زمانے میں ہمیشہ موجود تھا، کیونکہ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی مغربی تہذیب کے اتنے گرویدہ ہو چکے تھے کہ اپنے مذہب اور کلچر کو بھی بھول گئے تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے دہلی کالج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال اور مولوی کریم الدین (مصنف واقعات ہند) کے بھائی عمادالدین نے اپنے مذہب کو بدل لیا تھا اور عیسائی ہو گئے تھے۔ اس

---

(۱) ''اسباب بغاوت ہند'' سرسیّد احمد خاں (دوسرا ایڈیشن)، ص ۶۴

(۲) ایضاً ص ۶۳

واقع کا اثر سرسیّد کے دل و دماغ پر بہت ہوا۔ سرسیّد یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن کریم اور دوسرے ہاتھ میں جدید فلسفہ و سائنس اور سر پر کلمہ طیبہ کا تاج ہو۔ چنانچہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام اسی مقصد کے تحت رکھا گیا تھا۔ دینی تعلیم اور نماز کے لئے بھی ضروری تاکید کی گئی اور جدید علوم فنون کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ اقامت گاہوں (ہاسٹلوں) میں رہنے والے طلبا کے لئے سارے انتظامات کئے گئے ۔ ہالوں اور ہاسٹلوں میں مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ لباس اور بود و باش کے قاعدے بنائے گئے تاکہ طلبا مشرقی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ مذہبی اصولوں پر بھی عمل پیرا ہوں۔

انیسویں صدی سے قبل بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اثر ورسوخ والے علاقے میں تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج اٹھارہویں صدی عیسوی میں قائم ہو چکے تھے۔(۱) مگر نظام تعلیم جدید کالجوں سے مختلف تھا۔ فرسودہ مضامین غیر معیاری استاد پڑھاتے تھے ۔ یونیورسٹی ایکٹ ۱۸۵۷ء کے مطابق تین یونیورسٹیاں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں قائم ہوئیں۔ ان تینوں میں تعلیمی طریقے اور دیگر انتظامات کیمبرج اور آکسفورڈ (لندن) یونیورسٹی کے طرز پر تھے۔ لیکن وہاں کے قواعد وضوابط پر خاطر خواہ عمل نہیں ہو سکا۔ یہ تینوں الحاق یونیورسٹیاں تھیں جو صرف امتحان لے کر ڈگری دیتی تھیں اور تعلیم ان یونیورسٹیوں سے ملحقہ کالجوں میں دی جاتی تھیں۔(۲) پیشہ وارانہ تعلیم کے ڈپلوما لائسنسی دیئے جاتے تھے۔ یونیورسٹیاں اعزازی ڈگری ایل۔ ایل۔ بی دینے کی مجاز تھیں۔ ان یونیورسٹیوں سے ملحق کالج (Affiliated) تھے۔ جہاں اعلیٰ تعلیم کا اہتمام تھا۔ ان کالجوں میں کچھ سرکاری کالج تھے اور کچھ وہ کالج بھی تھے جن کو مقامی کمیٹیاں چلاتی تھیں ان کالجوں کو سرکار سے مدد ملتی تھی۔ دو یونیورسٹیاں

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ بار ایٹ لا، ص ۲۲۰

(۲) ایضاً، ص ۲۲۰

مذہبی بنیاد پر قائم کی گئیں۔ شمالی مغربی صوبے میں دو کالجوں میں ایک لکھنو کا کنگ کالج اور دوسرا علی گڑھ کا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا۔ بعد کو یہ یونیورسٹیاں بن گئے۔ مدراس کے تین کالج تھے۔ پچائیپا کالج اور وزیانگرم اور ٹن نیولی کے ہندو کالج۔ اینگلو اورینٹل کالج کے بانی سر سیّد احمد خاں تھے۔ پچائیپا کالج ایک ہندو رئیس پچئی اپّا کے ورثے سے کار خیر کے سرمائے سے بنا تھا اور وزیانگرم کالج پہلے ۱۸۵۷ء میں ہز ہائی نس مہاراجہ آف وزیانگرم کے بنائے ہوئے ایک اسکول کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ اور ٹن نیولی کالج کی بنیاد ۱۸۶۱ء میں پڑی تھی۔ ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ڈگریاں بھی دوسری سرکاری اور غیر سرکاری یونیورسٹیوں کے مساوی مانی جاتی تھیں۔ ان کالجوں کے پرنسپل عام طور سے یورپین ہی ہوا کرتے تھے۔

انگلینڈ میں ملکہ وکٹوریہ کا عہد جو ۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۲ء تک رہا وہ اپنی ہمہ گیر ترقی کیوجہ سے سنہرا دور کہلاتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں بہت سے ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کے باغیوں کو عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔ (۱) اور تعلیمی نظام میں اصلاح کی گئی۔ ۱۸۸۲ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی اس میں ایک شعبہ مشرقی علوم کی ترویج و ترقی کا تھا۔ الٰہ آباد یونیورسٹی ۱۸۲۷ء میں قائم ہوئی یہ یونیورسٹی بھی مشرقی علوم میں اعلیٰ درجات کی سند عطا کرتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں گورنر جنرل کی کاؤنسل میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے انضمام کا ایکٹ پاس ہوا۔ مقامی حکومت نے یونیورسٹی کی ہیئت کا بڑے غور و فکر سے جائزہ لیا اور خاص طور پر اس مسئلے پر غور کیا کہ جرمن یونیورسٹیوں کی طرح اس یونیورسٹی کو بھی امتحان لینے اور نصاب مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسروں اور پرائیویٹ استادوں پر مشتمل ایک اسٹاف بھی رکھنا چاہئے۔ اس قسم کی یونیورسٹیوں کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لفٹیننٹ گورنر نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے یونیورسٹی کو اپنی سرگرمیاں جو اب ملک کی ذہنی ترقی میں بتدریج اپنا مقام حاصل کر رہی ہیں

---

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند''، سید نور اللہ، ص ۲۱۸

تدریس کے طریقوں اور تعلیم کے مقاصد، ملک کی ضرورتوں، حالات اور اس کے رجحان طبع کے مطابق بنانے کی طرف رکھنی چاہیے۔(۱) انیسویں صدی میں کل ملا کر پانچ یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔کلکتہ یونیورسٹی ایل۔ایل۔بی کی ڈگری دینے کی مجاز تھی۔

یونیورسٹیوں کے قیام اور انڈین ایجوکیشنل کمیشن پچیس برسوں میں کالجوں کا فروغ بہت تیز رفتاری سے ہوا۔یہ تو کچھ ثانوی تعلیم کی غیر معمولی ترقی اور کچھ حکومت کی ہمت افزائی کی وجہ سے تھا۔یونیورسٹیوں کے پہلے میٹریکولیشن امتحان میں صرف دوسو اُنیس طالب علم کامیاب قرار دیئے گئے۔(۱۸۵۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں ایک سو باسٹھ طالب علم، ۱۹۵۹ء میں بمبئی یونیورسٹی میں اکیس طالب علم اور ۱۸۵۷ء میں مدراس یونیورسٹی میں چھتیس طالب علم تھے)۔لیکن ۸۲۔۱۸۸۱ء میں صرف برطانوی ہند سے چوہتر سوانتیس (۷۴۲۹) طالب علم میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھے اور ان میں سے ۲۷۷۸ طالب علم کامیاب ہوئے۔اس زمانے میں میٹریکولیشن پاس کرنے والے امیدواروں کی بہت بڑی تعداد یونیورسٹیوں میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔اس کا خاص سبب وہ مادی فائدے تھے جو یونیورسٹی کی سندیں رکھنے والوں کو حاصل ہو سکتے تھے۔اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان کالجوں اور اس کے ساتھ ان میں داخلوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔وکٹورین عہد میں جو تعلیمی ترقی ہوئی اس کی تفصیل مندرجہ ذیل چارٹ سے ہوتی ہے۔(۲)

نام صوبہ	۱۹۵۷ء میں کالجوں کی تعداد	۱۸۸۲ء میں کالجوں کی تعداد
بنگال	۱۵	۱۷
بمبئی	۳	۶
شمالی مغربی صوبہ	۵	۱۱
مدراس	۴	۲۵
پنجاب	ـ	۲
سنٹرل پراونس	ـ	۱
میزان	۲۷	۶۲

(۱) کیونکیونل ریویو آف دی پراگریس آف ایجوکیشن ان انڈیا، جلد ا۔۱۸۹۷ء۔۱۹۰۲ء، ص ۱۵۴

(۲) ''تاریخ تعلیم ہند''، سید نوراللہ، ص ۲۲۱

اس عہد میں کالج کی تعلیم کے فروغ میں ایک اور عیب پیدا ہوگیا کہ ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۲ء کے درمیان ہونے والی تیز رفتار توسیع کی وجہ سے تعلیم کا معیار گر گیا۔ مگر اسے بعض ماہرین تعلیم نے مختلف نقطۂ نظر سے دیکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ توسیع معیار قابلیت جو تعداد کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ اور اس مفکرین کی جماعت میں زیادہ تر سرکاری حکام اور مشنری تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

''درحقیقت ان کی (انڈین ایجوکیشن کمیشن کی) اس منزل پر حکومت کے اخراجات کو کم کرنے اور مقامی اور نجی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی یہ خاص پالیسی، بنیادی طور پر کالج کی ذہنی توانائی کو مضبوط اور عمیق بنانے کے مقصد سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ ان کی تجویز کی ہوئی پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نشو ونما میں گہرائی اور مضبوطی کے بجائے پھیلاؤ بڑھتا گیا اور ان کی اس پالیسی کی بنا پر اگلے بیس برسوں میں جو کالج وجود میں آئے وہ کمزور تھے ان کا عملہ ناکافی تھا اور یہ طالب علموں کی ضرورتوں کی طرف انفرادی توجہ بھی نہیں مہیا کر سکتے تھے اور نہ ہی یہ علمی اور ادبی مضامین کے وہ متنوع نصاب ہی مہیا کر سکتے تھے جو بنگال کے صحت مند نشو نما کے لئے ضروری تھے۔ ۱۸۸۲ء کے بعد کے بیس برسوں کی خصوصیت کالجوں کا تیز رفتار قیام تھا جن کا انحصار زیادہ تر یا پورے طور پر فیسوں پر تھا اور یہ درس وتدریس کے مرکزوں کے بجائے امتحان کی تیاری

کرانے والے اداروں کی طرح چلتے تھے۔''(۱)

دوسری طرف زیادہ تر ہندوستانیوں پر مشتمل ماہرین تعلیم کی ایک جماعت تھی جو سمجھتی تھی کہ ترقی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ایک ملک کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ معیار کے بلند کرنے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔اس نقطۂ نظر کو جی۔کے۔گوکھلے کے الفاظ میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا :

''حکومت کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ چند کالجوں میں دی جانے والی تعلیم جب تک اس وقت کی اعلیٰ ترین تعلیم نہ ہوگی بیکار اور مضرت رساں ثابت ہوگی ۔ ہمارے گریجویٹوں کی ذہنی کامیابیوں کو تعلیم کی افادیت کی واحد اور اہم ترین کسوٹی بھی نہیں سمجھنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں 'مائی لارڈ' اور یہ میرا محکم عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مغربی تعلیم تمام تر قابل ذکر بھی ہے اور مفید بھی۔موجودہ حالات میں اگر یہ اعلیٰ ترین ہوسکتی ہے تو یہ اور بھی اچھا ہے لیکن اگر یہ اعلیٰ ترین بھی نہیں ہے تب بھی اسے محض اس بنیاد پر رد نہیں کردینا چاہئے ۔کسی قوم کی زندگی چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، صنعتی ہو یا ذہنی ایک نامیاتی کُل ہوتی ہے اور کسی ایک رخ میں کسی نمایاں ترقی کی توقع اس وقت تک نہیں کرنی چاہئے جب تک کہ عوام کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ہمہ جہت حرکت کا آزادانہ موقع نہ ملے۔ میرے نزدیک ہندوستان کے موجودہ حالات میں مغربی تعلیم کا

(۱) ''رپورٹ'' جلد۱، ص۵۹۔۶۰، بحوالہ تاریخ تعلیم ہندص۲۷۲

> عظیم ترین کام علم کا فروغ اور مغرب کی زندگی کے کردار وافکار کی اعلیٰ ترین اور بہترین خصوصیات کو رچانا بسانا نہیں ہے بلکہ ہندوستانی ذہن کو فرسودہ نظریات کی غلامی سے نجات دلانا ہے۔ اس مقصد کے لئے اعلیٰ ترین ہی نہیں بلکہ ہماری مغربی تعلیم مفید ہے۔"(۱)

انیسویں صدی کی تعلیمی صورت حال اور اسکولوں کے قیام کے سلسلے میں مِشنری تنظیموں کا بڑا عمل دخل رہا۔ مِشنری تنظیموں میں ہر جگہ مذہبی تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی بہانے سے جاری رکھا گیا۔ اگر چہ کمپنی کے ڈائرکٹروں اور پارلیمنٹ کے چار ضابطے میں یہ بات واضح تھی کہ ہندوستان میں کمپنی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جارر کھے اور جہاں تک ہو سکے مذہبی تعلیم کی کوششوں میں اتنا زور نہ دکھایا جائے لیکن مقامی طور پر کمپنی کے کارکن ان احکام کو عملی جامہ نہیں پہناتے تھے کیونکہ اخراجات کے معاملے میں کمپنی تعلیم کے مدّ پر کوئی بڑا خرچ اٹھانے کے لئے تیار نہ تھی ان کا یہ ماننا تھا کہ غیر ملک کے باشندوں کو کمپنی تعلیم دلانے کی ذمہ داری کسی طرح نہیں لے سکتی تھی۔ اس کش مکش میں بڑی بحثیں سرکاری اجنبیوں اور مِشنری کے درمیان ہوتی رہیں۔ مشنری والے تعلیم میں حصہ بٹانے کے لئے اس شرط پر تیار ہوتے تھے کہ ان کو مذہب کی تبلیغ کا موقع ملنا چاہیے۔ اسی کشمکش میں تعلیم کا کام مثبت انداز سے نہیں ہو پایا۔ ثانوی اسکولوں میں تعلیم قدرے مناسب طریقے سے دی جاتی اور پرائمری اسکولوں میں تعلیم کا کام برائے نام ہی رہا۔ اسی زمانے میں ثانوی اسکولوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور تعلیم کے لئے استادوں کا انتظام بھی کسی قدر معقول تھا۔

مذہبی تعلیم کے بارے میں سرکاری طور پر یہ حکم تھا کہ والدین اپنے بچوں کو جس طرح کی

---

(۱) ''اسپیچیز ،،ص ۳۵_۲۳۴بحوالہ تاریخ تعلیم ہند، ص ۲۲۸

تعلیم دینا چاہتے تھے اسی طرح کی تعلیم کا انتظام حکومت نے فراہم کیا لیکن کمپنی سرکار کو یہ پسند نہیں تھا کہ سرکاری خرچے پر مذہبی تعلیم دی جائے۔ مشنری والے بھی کہتے تھے کہ غیر اہل کتاب (ملحد) عوام میں عیسائی تعلیمات کی اشاعت کی خاطر مشن کو ہندوستان کے غیر عیسائی نوجوانوں کے لئے ابتدائی اور ثانوی اسکول الگ قائم کرنا چاہیے۔ کلکتہ اور بمبئی میں ہونے والی مشنری کانفرنس میں یہ کہا گیا کہ ملحد بچوں کے لئے ایک وسیع تعلیم نظام چلانا غلط ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسکول میں دنیاوی تعلیم مشنری کا کام نہیں ہے کیونکہ انگلینڈ میں بھی گرجوں کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے خرچ پر کسی بھی قوم میں عام تعلیم کو فروغ دیں۔ سوائے اس کے کہ اس کے ذریعہ عیسائیت کی تبلیغ ہو۔ مشنریوں کے ذمہ ادب، ریاضی، نیچرل سائنس پڑھانا نہ تو فرض تھا اور نہ ہی انہیں اس قسم کا کوئی حکم نامہ ملا تھا۔ ملحدوں میں عیسائی تعلیمات کی تبلیغ اور دیسی گرجوں کی سرپرستی کرنا مشنریوں کا بنیادی فریضہ تھا اور اسے متحرک اور فعال بنانا بھی۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ جو چیز اس مقصد کی تکمیل نہیں کرتی انہیں اجنبی تصور کیا جانا چاہئے۔ مشنری والوں کو یہ ڈر تھا کہ مذہبی تعلیم اسکولوں سے خارج ہو کر اختیاری رہ جائے گی۔ یہ حکم بھی تھا کہ تمام مضامین جو سرکاری منشور کے تحت آتے ہیں اسے ہر روز اسکول میں شروع کے پانچ گھنٹوں میں پڑھایا جانا چاہئے۔ اور اگر مذہبی تعلیم کا پڑھایا جانا ضروری ہو تو اسے چھٹے گھنٹے میں پڑھایا جانا چاہیے۔ جبکہ چھٹے گھنٹے میں بچے تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور مشن والوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ امتحان پاس کرنے والی سیکولر تعلیم کو فروغ دیں اور علم کی پیاس کے خواہش مند نوجوان طلبا کو اس بہانے سے مذہبی تعلیم میں پھنسایا جائے۔ جہاں تک عیسائی مذہب قبول کرنے کا سوال ہے ایسے طلبا کی تعداد مشنری اسکولوں میں برائے نام ہے۔ اونچی تربیت حاصل کئے ہوئے مشنریوں میں جنہیں مشن کے کام میں لگایا جاتا ہے وہ اسکول کے بند کمروں میں محدود ہو کر کمزور ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بیکار

ہو جاتے ہیں ۔ اس طرح مشنریوں نے اپنا رخ آدی باسیوں ، پہاڑی قبیلوں اور دوسری پس ماندہ ذاتوں کی طرف موڑلیا۔ اور شہروں میں تعلیم کا کام جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور طالب علموں میں سے جو لڑکے کم عمر کے ہوتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے۔ اور تمہیں نجات دلانے والا کون ہے اور اگر وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے تو اس پر ان کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا ان سب باتوں سے عوام میں انگریزوں کے تئیں خراب تاثر پیدا ہو رہا تھا۔ یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے بچوں کو کیوں مشنری اسکولوں میں داخلہ دلواتے تھے۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے لیکن اس کے اسباب میں سے ایک اہم سبب مفلوک الحال تھی جس کے بنا پر ان اسکولوں میں ہندوستانی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے میں دلچسپی رکھتے تھے تاکہ ان کی مالی پریشانی میں کمی آجائے اور معیشت و روزگار بھی حاصل ہو۔ ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان انگریزی حکومت سے کبیدہ خاطر تھے لیکن باوجود اس کے وہ تعلیمی پالیسی کو اپنا رہے تھے۔

دیہاتی مکتبوں کے کھلنے سے سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کے لئے یہ مکتب قائم کئے گئے تھے۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر ہر گاؤں اور قصبوں میں گھوم گھوم کر بچوں کو مکتب میں داخل کرانے کی اپیل کرتے تھے۔ عوام سمجھتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب کرسچن بنانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ ذی شعور جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے بچے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام ومسائل، اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے۔ اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ تھا کہ مذہبی علوم جو ہندوستان میں اس وقت رائج تھا اس کو معدوم کر دیا جائے تاکہ آئندہ کو عیسائی

مذہب کے فروغ میں زیادہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۱۸۵۴ء کے بعد حکومت اور مشنریوں نے اپنے تعلیمی اداروں میں بڑے پیمانے پر اضافہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تعلیم میں سرکاری اور مشنری تنظیموں کی اس پابندی نے سارے تعلیمی میدان کو نجی ہندوستانی تنظیموں کے لئے کھول دیا اور انہیں عوام کے بڑھتے ہوئے تعلیمی مطالبات کی تکمیل کا پورے طور سے ذمہ دار بنایا۔ اسی دوران ہندوستانی تنظیم کو خودمختاری اور نشو و نما کی مکمل آزادی دینے کا سہرا حکومت کے سر ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق ہمت کی اور کافی قربانیاں دینے کے بعد اپنے ہم وطنوں کو پڑھانے کا کام اپنے ذمہ لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ عوام کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کیا بلکہ اپنی اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ تعلیم کے شوق کو اور آگے بڑھایا۔ ۱۸۸۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مشنری ہندوستانی تنظیم کے مقابلے میں آگے تھے۔ لیکن اگلے کچھ برسوں میں ہندوستانی نجی تنظیم میں اس قدر اضافہ ہوا کہ مشنریوں کے انتظام میں چلنے والے تقریباً ۳۷ کالجوں کے مقابلے میں ہندوستانی نظام کے تحت چلنے والے کالجوں کی تعداد ۴۲ ہوگئی تھی اور نجی ثانوی اسکولوں کی بڑی تعداد بھی ہندوستانیوں کے کنٹرول میں تھی۔ ۱۸۸۲ء کے بعد مخلص ہندوستانی کارکنوں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان لوگوں نے نہایت معمولی معاوضے پر کام کئے اور اپنے مدرسے اور اسکول قائم کئے۔ انہوں نے نئی قومی زندگی کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۸۵۴ء کی پہلی دستاویز تھی جس نے گرانٹ ان ایڈ کی با قاعدہ اسکیم کو اپنانے کی سفارش کی تھی۔ اور اس عہد کی تمام دستاویزوں میں گرانٹ ان ایڈ پر زور دیا گیا۔ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نے اس ہدایت پر جلد ہی عمل درآمد کر کے گرانٹ ان ایڈ کے کچھ قاعدے مرتب کئے اور تعلیم کی بڑھتی ہوئی خواہش کو پورا کرنے لئے وجود میں آنے والے پرائیوٹ اسکولوں کا معائنہ کرنا اور ان کو مالی امداد دنیا شروع کر دیا۔

۱۸۵۴ء سے ۱۸۸۲ء تک ''گرانٹ ان ایڈ'' (grant in aid) کا جو نظام رائج تھا اس کی خامیوں کی نشاندہی اسطرح کی جاسکتی ہے۔

۱۔ نئی نجی تنظیموں کو ملنے والی گرانٹ ان ایڈ کی پالیسی ٹھیک ہوتی تو اچھے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ نجی تنظیموں کو مالی امداد نہیں ملی۔

۳۔ گرانٹ ان ایڈ کا فائدہ ان اسکولوں کو زیادہ ملا جن کو مشنری چلاتے تھے۔

۴۔ گرانٹ ان ایڈ کے معاملے میں نجی اداروں سے مشورہ نہیں ہوتا تھا۔

۵۔ پبلک امتحانات اسطرح ہوتے تھے کہ اسکولی نصاب تعلیم اور درسی کتابیں یکساں طور پر رکھنے کے لئے مجبور تھے۔ جس کی وجہ سے نجی اسکول آزاد طریقے سے ترقی نہیں کر سکتے تھے۔

۶۔ نجی اسکولوں کی طرف سے سرکاری حکام کا رویہ ہمدردانہ نہیں تھا۔ وظیفے عموماً سرکاری اسکول کے طالب علموں تک محدود تھے۔ ملازموں کو چھٹنی کے وقت شروعات امدادی اسکولوں سے ہوتی تھی۔

(i) عام تعلیمی مسائل کے بارے میں نجی اور سرکاری اسکولوں کے منیجروں میں صلاح مشورہ ہونا چاہیے۔

(ii) طالب علموں میں مقابلے کا موقع دیا جانا چاہیے۔

(iii) امتحانوں میں ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کے ساتھ غیر سرکاری اسکولوں کے استادوں کو امتحانوں میں شریک ہونا چاہیے۔

(iv) حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے وظیفے اور انعام سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کے بچوں کو یکساں ملنا چاہئے۔

(۷) کسی غیر سرکاری اسکول کی امداد بند نہیں کرنا چاہیے۔ (۱)

ان کے علاوہ اور بھی مفید سفارشیں تھیں جن کے نتیجے میں نجی تنظیم والے اسکولوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی۔ مشنری اسکولوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ غرض یہ نجی ہندوستانی تنظیم یہ تھی کہ نئی تعلیمی پالیسی سے یہ ادارے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود تعلیم میں حکومت کا رول زیادہ مناسب نہیں رہا جس کی وجوہات درج ذیل ہیں :

(۱) حکومت اور عوام زیادہ قریب نہیں ہو سکی۔

(۲) حکومت نے نجی اداروں کی نگرانی برائے نام کی۔

(۳) حکومت نے اپنے اسکولوں میں زیادہ خرچ والے نصاب تعلیم مہیا کیے جن کا انتظام نجی اسکول نہیں کر سکتے تھے۔

(۴) اس زمانے میں حکومت کی اصل کوشش نجی تنظیموں کی امداد اور نگرانی تھی۔ مالی امداد کبھی قابل اطمینان نہ تھی جو اکثر ناکافی ہی رہی۔ جہاں تک نگرانی کا سوال ہے ڈیپارٹمنٹ نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ اور اس نرم رویے سے بہت سے بے کار اسکول بھی وجود میں آ گئے اور گرانٹ ان ایڈ سے ضروریات کے مطابق فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس زمانے میں حکومت کی اصل سرگرمی نجی تنظیموں کی مالی امداد اور نگرانی تھی۔ اسکولوں میں عام طور پر دی جانے والی امداد ناکافی تھی۔ جہاں تک دوسرے مقصد کا تعلق ہے۔ ڈیپارٹمنٹ نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ جو اسکول امداد نہیں مانگتا اس پر کس قسم کا کنٹرول بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر عام معائنے، طالب علموں کے امتحانات تک محدود تھا کہ حکومت سے ملنے والی امداد صحیح جگہ استعمال ہو رہی ہے یا نہیں۔

---

۱ تاریخ تعلیم ہند، سید نور اللہ، لاہوتی پرنٹ ایڈ پہاڑی املی جامع مسجد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲-۲۱۱

(ب) غیر سرکاری : (دینی مکاتب، مدارس)

انیسویں صدی کے دینی مکاتب کی صورت حال کا جائزہ لینے سے پہلے ہم مشرق ممالک بالخصوص ہندوستان کے تناظر میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وہاں علمی و تعلیمی ذوق وشوق اس سے پہلے کس منزل پہ تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تہذیب وتمدن اور علم وفن کی روشنی مشرقی ممالک میں مغربی ملکوں سے صدیوں پہلے پھیل چکی تھی اور علوم وفنون کی تعلیم وتربیت کے دروازے کھل چکے تھے۔ قدیم ہندوستان میں پاٹلی پتر (پٹنہ) ،تکشلا اوراوجین وغیرہ میں عظیم علمی درس گاہیں موجود تھیں۔ یہاں سے غیر ملکی طلبا تک مستفید ہوتے تھے۔ بغداد، قاہرہ کی قدیم درس گاہوں سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ اشوک آعظم اور راجہ وکرمادتیہ کے عہد میں چین، ایران اورعرب ممالک سے عالموں اور ماہرین فن کثرت سے ہندوستان میں آئے۔ اس سے قبل بھی یہ سلسلہ استوار تھا۔

زمانہ وسطیٰ میں اکبر آعظم کا عہد قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ کہلاتا تھا اور یہی علم و ادب کا بھی سنہرا دور تھا۔ اکبر آعظم کے بعد بھی سارا مغلیہ عہد علم وفن کے عروج کا روشن زمانہ کہلاتا ہے۔ مختلف زبانوں کی بیشتر کتابوں کے تراجم عربی، فارسی، سنسکرت میں ہوئے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مغلیہ سلطنت کا بانی بابر صاحبِ تلوار ہی نہیں بلکہ صاحبِ قلم بھی تھا۔ اس کی کتاب ''تزکِ بابری'' ایک یادگار تصنیف ہے۔ اکبر خود ان پڑھ تھا مگر اس کے نورتنوں میں علم ابوالفضلؔ اور فیضیؔ جیسے باکمال جیّد عالم تھے۔ فیضیؔ کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قرآن کریم کی

تفسیر بغیر نقطے کے لکھی۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی مشہور عالم دین بھی اکبر کے عہد میں تھا۔ جہانگیر کی تصنیف وتزک جہانگیری بھی ان کی علمی دوستی پر روشنی ڈالتی ہے۔ شاہ جہاں کا بڑا لڑکا دارشکوہ کئی زبانوں کا عالم تھا اور دوسری بلند پایا تصنیفوں کے علاوہ سنسکرت کے مشہور شاعر کالی داس کے ناٹک 'شکنتلا' کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا تھا۔ اس ناٹک کے دوسری زبانوں میں ترجمے داراشکوہ کی فارسی ترجمے سے کئے گئے اورنگ زیب خود بھی جید عالم تھا۔ فتاویٰ عالمگیری شریعت کی مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ بیگمات میں نور جہاں ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ غرض یہ کہ مغلیہ عہد میں علوم وفنون کا عام چرچا تھا اور عالموں کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ علمی لیاقت اور شرافت کا معیار بھی تصور کیا جاتا تھا۔ مغلیہ عہد کے امیروں میں عبدالرحیم خان خاناں، ملک محمد جائسی بلند پایہ عالم اور عالی مقام شاعر تھے۔ امیر خسرو کی فارسی مثنویاں 'مولانا روم' کی مانند تھیں۔ ان کی پہیلیاں قدیم اردو میں لاجواب ہیں۔ اردو شاعری میں میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ وغیرہ بلند پایہ شاعر عہد مغلیہ کی نمایاں ہستیاں تھیں۔ اسی عہد میں لکھنو، حیدرآباد، رام پور، لاہور، پٹنہ وکلکتہ میں علم وادب کا عام چرچا تھا ہر طبقے میں علم وادب کے ماہرین موجود تھے۔ اگرچہ درس وتدریس کا منظّم اہتمام نہیں تھا۔ مکاتیب ومدارس زیادہ تر شہروں میں قائم تھے۔ تعلیم یافتہ والدین خود اپنے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ بعض استاد مقامی لوگوں کی مدد سے مدرسے قائم کر لیتے تھے۔ جہاں شہر اور محلے کے طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔

انیسویں صدی تک جس میں مغلیہ حکومت کا بتدریج زوال ہوا اس وقت تعلیم کا شوق عوام وخواص میں پایا جاتا تھا اور بعض غریب ماں باپ کے بچے علم کی تکمیل کے بعد اپنے مدارس کھول کر تعلیم کو ذریعہ معاش بنالیتے تھے۔ استادوں کی عزت اور قعت کا یہ عالم تھا کہ والدین اساتذہ

کے سامنے کوئی چوں چرا نہیں کر سکتے تھے۔ اگر چہ ان مدارس میں تعلیم پرانے فرسودہ طریقوں پر رائج تھی۔ پھر بھی والدین کو یہ بات تسلیم تھی کہ وہ اپنے بچوں کو جاہلوں کے مقابلے میں بہتر سمجھتے تھے اور معاشرہ بھی ایسے تعلیم یافتہ بچوں کی قدر کرتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ کرنے میں کتنی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے :

> ''عام طور پر تعلیم کا رواج تھا......زیادہ تر پنڈت مندوں میں نجی پاٹھ شالائیں (اسکول) کھولے ہوئے تھے۔ جہاں بچے معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھتے تھے......چھپی ہوئی کتابیں نہیں ہوتی تھیں۔ لکڑی کی تختیوں پر حروف تہجی لکھا دیئے جاتے تھے۔ جن کو بچے زبانی یاد کرتے تھے۔ ذہنی استعداد سے زیادہ سبق زبانی ازبر کرا دیا جاتا تھا......عموماً بچے دس بارہ سال کی عمر تک تعلیم پاتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم پچیس برس کی عمر تک رائج تھی۔''(۱)

ہندو شاستروں میں برہمچاری کی عمر پچیس سال تک تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہی مختص کی گئی تھی۔ مسجدوں میں ملّا یا مولوی بھی دینی مدارس قائم کر لیتے تھے اور ناظرہ قرآن شریف کے علاوہ دینی مسائل کی بھی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ بچے روزہ، نماز وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیں۔ اس کے علاوہ فارسی یا اردو میں معمولی تعلیم دی جاتی تھی بعض والدین اپنے بچوں کو خود پڑھاتے تھے یا پھر معلم کو گھر بلا کر تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ بعض صاحب حیثیت علم کے شوقین افراد اپنے یہاں مدرسہ قائم کر کے شہر یا قصبے کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔ اس کام کو ایک کارِثواب سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ ایسے مدرسوں میں غریبوں کے بچے مفت

---

۱ تاریخ تعلیم ہند، سید نور اللہ، لاہوتی پرنٹ ایڈز پہاڑی املی جامع مسجد دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۵۷۔۵۲

تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ان نجی مدارس کی تعلیم کا معیار استاد کی صلاحیت پر ہوتا تھا۔ عام طور پر استاد معمولی لیاقت کے ہوتے تھے۔ ان مدارس کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں :

۱۔ نیچی ذات والے بچے داخلہ نہیں لے پاتے تھے۔

۲۔ لڑکیوں کی تعداد بھی برائے نام ہوتی تھی۔

۳۔ معمولی پڑھائی لکھائی کے علاوہ کچھ حساب بھی یعنی گنتی پہاڑے وغیرہ سکھائے جاتے تھے۔

۴۔ استاد کے معاوضے میں نقد وجنس دونوں کا رواج تھا۔

۵۔ استاد کو سوسائٹی میں عزت ملتی تھی۔

۶۔ ان مدرسوں میں سخت سزائیں دینے کی عام روایت تھی اس لئے طلبا استادوں سے بہت خائف رہتے تھے اور والدین بھی سزا کے معاملے میں چوں چرا نہیں کرتے تھے۔

وکٹورین عہد کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ وہ تبدیلی تھی جو مشرق میں مذہب، فلسفے اور ادب کے متعلق مغربی رویہ سے ہوئی تھی۔ یہ تبدیلی کم وبیش ۱۸۵۴ء تک جاری تھی۔ ایسے لوگ جن کا یہ خیال تھا کہ مشرقی فلسفہ مذہب اور ادب کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ میکالے نے ان سب کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ لارڈ آک لینڈ نے اس تبدیلی کو ایک محدود حلقے میں رہنے دیا۔ ۱۸۵۴ء کی دستاویز میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مشرقی زبانوں کا مطالعہ مفید ہوگا کیونکہ قدیم تاریخی بنیادوں پر مشرقی زبانوں کا مطالعہ ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ مگر ان سب باتوں کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ مشرقی سائنس اور فلسفے میں بڑی بھیانک غلطیاں ہوئی ہیں مگر یہ رویہ ۱۸۵۴ء کے بعد ختم ہونا شروع ہوگیا۔ ذیل کے اقتباس میں سید نور اللہ بار ایٹ لا نے ان باتوں کی نشاندہی کی ہے :

''۱۸۰۱ء میں اپنیشدوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اسے ایک فرانسیسی عالم اے۔ ڈبلو پیغان نے اورنگ زیب کے سب سے بڑے بھائی دارشکوہ کے ایک فارسی ترجمے سے فرانسیسی زبان میں منتقل کیا تھا۔ یہ ترجمہ کسی طرح جرمنی کے عظیم فلسفی شوپنہار کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اسے پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور اسی کے ذریعہ مغربی فلسفے کا اثر مغرب میں شروع ہوا۔ اسی تحریک نے وقت کے ساتھ قوت حاصل کی اور اب وہ ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہو چکی تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں سنسکرت کے ایک دوسرے بڑے عالم سر ولیم جانس سنسکرت تخلیقات کو انگریزی زبان میں منتقل کر کے انہیں مقبول بنا رہے تھے ان کا کیا ہوا کالی داس کی 'شکنتلا' کا ترجمہ ادبی فن کا ایک شاہکار تھا...... انیسویں صدی کے عظیم ترین متشرق میکسمولر نے بڑی خدمت انجام دی ان کا عظیم کارنامہ ویدوں کا ترجمہ تھا...... نتیجہ یہ ہوا کہ کلاسیکی زبانوں کا تنقیدی اور سائنٹفک مطالعہ وکٹورین عہد میں کالج کی تعلیم کا نمایاں پہلو بن گیا...... اس سے قدیم تاریخ اور مذہب کے بارے میں شروع زمانے کی ناواقف حکام اور مشنریوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بعد دونوں تہذیبوں کا امتزاج شروع ہو گیا۔'' (۱)

اس امتزاج سے اس عہد میں ہندوستانی قومی زندگی میں نئی قیادت پیدا ہوئی جس میں

---

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نور اللہ، ص ۲۴۴-۲۴۳

پنڈت ایشور چند ودیا ساگر، کیشپ چندر سین، سوامی وویکانند، جسٹس ایم۔ جی راناڈے، پنڈت مدن موہن مالویہ، دادا بھائی نوروجی، سرسیّد احمد خاں اور بہت سے دوسرے لوگ سامنے آئے۔ ان لوگوں نے جگہ جگہ پر دیسی اسکول کھلوائے اور رضا کارانہ طور پر تعلیمی ایجنسیوں اور انجمنوں کی بنیاد ڈالی۔ مثلاً سرسیّد احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ عام لوگوں میں تعلیم کا شوق پھیلانے کی کوشش کی۔ مدراس کے صوبے میں ہندوؤں کی تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جاتی تھی اس کا جائزہ بیلاری کے کلکٹر نے اسطرح سے پیش کیا ہے :

ا۔ ہندو بچوں کی تعلیم کا آغاز عام طور پر پانچ برس کی عمر سے ہوتا ہے۔ بچہ جب پانچ برس پورے کر لیتا ہے تو جس اسکول میں اسے بھیجا جانیوالا ہوتا ہے وہاں کے استاد اور طالب علموں کو گھر بلایا جاتا ہے۔ تمام لوگ گنیش کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ استاد بچے کے پاس ایک طرف بیٹھتا ہے۔ خوشبوئیں لگانے اور چڑھاوے چڑھانے کے بعد مورتی کے سامنے ایک اشلوک پڑھتا ہے بچہ اس کے ساتھ ساتھ دہراتا ہے۔ اس کے بعد چاولوں میں دیوتا کا نام انگلی سے لکھواتا ہے۔ پھر گھر والے استاد کو اپنی حیثیت کے مطابق گرو دکچھنا (تحفہ) دیتے ہیں۔ اس کے دوسرے دن بچہ خود اسکول جانے لگتا ہے۔

۲۔ اسکول میں بچے پانچ سال تک رہتے ہیں غریبی یا کچھ دوسرے اسباب کی بنا پر والدین اکثر بچے کو اسکول سے اٹھا لیتے ہیں اسطرح بچہ جو تعلیم حاصل کرتا ہے وہ برائے نام ہی ہوتی ہے۔ اکثر بچے چودہ پندرہ سال کی عمر تک اسکول جاتے ہیں روزانہ کے کام میں سبھی اسکولوں میں پروگرام ایک جیسا رہتا ہے اسکولوں کے کھلنے کا وقت عام طور پر چھ بجے کا ہوتا ہے۔ جو بچہ پہلے آتا ہے اس کے ہاتھ پر گیان کی دیوی کا نام لکھ دیا جاتا ہے اور جو بچہ بعد میں آتا ہے اس کے ہاتھوں پر فرضی نشان بنا دیئے جاتے ہیں۔ جو بچہ جتنی دیر سے آتا ہے اتنی ہی قمچیاں اس کے ہاتھ پر ماری

جاتی ہیں دیسی اسکولوں میں سخت سزائیں دی جاتی ہیں کام چور بچوں کو کوڑے سے پیٹا جاتا ہے یا پھر بیٹھک لگوائی جاتی ہے۔ یہ سزائیں نہایت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

۳۔ بچوں کی استعداد کے حساب سے درجہ بندی کی جاتی ہے ان جماعتوں کی تعداد عموماً چار ہوتی ہے اور قابلیت کے حساب سے ترقی دی جاتی ہے۔ اسکول میں داخل ہو کر بچے کو سب سے پہلے حروف تہجی سکھائی جاتی ہے۔ ابتدا میں بچے اپنی انگلی سے زمین پر لکھ لکھ کر یاد کرتے ہیں۔ پھر ان کو تختی یا سلیٹ پر تحریر سکھائی جاتی ہے۔

۴۔ کم استعداد بچے مانٹیروں کی نگرانی میں رہتے ہیں۔

۵۔ جب بچہ مختلف حروف ملا کر لکھنا سیکھتا ہے تو آواز کے حساب سے حروف علّت ملانا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہات کے جانوروں اور پھلوں کے نام سکھائے جاتے ہیں سو تک کی گنتی اور پہاڑے زبانی یاد کرائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد روپیہ پیسہ کی جمع باقی کے آسان قاعدے سکھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح گز اور انچ کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد صحیح عدد کی کسریں (Fraction) سکھائی جاتی ہیں لمبائی اور وزن کے پیمانے سکھائے جاتے ہیں۔ دن میں دو مرتبہ بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے مانیٹروں سے پڑھوایا جاتا ہے اور تمام بچے اسے دہراتے ہیں۔

۶۔ مختلف قسم کے رسم الخط کو پڑھنا اور ان حروف کو سمجھنا جو پہلے پڑھ چکے ہیں۔ کہانیوں اور داستانوں کا مطالعہ اور مختلف قسم کی نظموں کو یاد کرنا یہ سب دیسی تعلیم کے ضروری حصے ہیں۔ ان سب کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ الفاظ کو صحیح طرح ادا کر سکے۔ مضامین اور نظموں کو ٹھیک ڈھنگ سے پڑھ سکیں۔ ان دیسی اسکولوں میں جس طریقے سے اور جتنے کم وقت میں بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے اور بڑی جماعت کے طالب علموں سے چھوٹی جماعتوں کے کام کو چلایا

جاتا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔(۱)

صوبہ بمبئ کے تعلیمی جائزے ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۵ء تک کے مطابق گورنر نے جو تعلیمی سروے شروع کیا اس کے اشارے پر تمام کلکٹروں کو سرکولر بھیجے گئے تھے جس میں دیسی تعلیم سے متعلق معلومات فراہم کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ رپورٹیں پورے صوبے کا احاطہ نہیں کرتیں لیکن موجودہ اعداد وشمار کی بنیاد پر صوبہ بمبئ میں دیسی تعلیم کے سروے اس وقت کے مطابق حسب ذیل تھے۔

(i) زیادہ تر مدرسے مندروں میں، نجی گھروں میں اور چھپروں کے نیچے لگتے تھے یا پھر بچے خود استاد کے گھر پر جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ مدرسے عام طور پر مستقل نہیں ہوتے تھے۔ ان مدرسوں میں طالب علموں کی تعداد دو سے ڈیڑھ سو تک ہوتی تھی۔ اس لئے اوسط تعداد کا اندازہ فی اسکول پندرہ لگایا گیا۔ اصولی طور پر یہ مدرسے کسی خاص فرقے کے نہیں ہوتے تھے۔ نیچی ذاتوں کے بچوں کے علاوہ سب فرقوں کے بچے داخل ہوسکتے تھے۔

(ii) استاد زیادہ تر برہمن تھے۔ اس پیشے سے ان کا تعلق ان کی برادری کی عزت کی وجہ سے تھا۔ کچھ دوسری برادری کے بھی استاد ہوتے تھے۔ ماہانہ تنخواہ اوسطاً تین اور پانچ روپیہ کی درمیان مقرر ہوتی تھی۔ تنخواہ کی کمی کو دوسرے طریقوں سے بھی پورا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان استادوں کی علمی لیاقت نا قابل اعتماد تھی۔

(iii) ابتدائی اسکولوں میں ہریجنوں کے علاوہ تمام دوسرے طبقوں کے طلبا آتے تھے ان میں تیس فی صدی برہمن تھے۔ دوسرے طبقے کے بچے مثلاً سونار، بنیے وغیرہ ہوتے تھے۔ طالب علموں کا ۷۰ فیصدی حصہ ترقی یافتہ طبقوں کا تھا۔ ان کی عمر چھ اور چودہ برس کے درمیان ہوتی تھی۔ اسکولوں میں پڑھنے کی مدت گجرات میں دو تین سال اور دوسرے علاقوں میں تین چار

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص۲۹۔۲۷

سال تک کی تھی۔

(iv) ریاضی اور پہاڑے بچوں کو اس لئے سکھائے جاتے تھے کہ وہ رزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے سیدھے سادے سوالوں کا جواب زبانی لگانے کے قابل ہو جائیں۔ اس وقت کتابوں کا یکسر فقدان تھا۔ تعلیمی سامان بھی معمولی اور بے ڈھنگا ہوتا تھا۔ اور سزائیں عام طور پر سخت ہوتی تھیں۔

(v) عورتوں کی تعلیم صوبے کی کسی اسکول میں نہیں تھی۔ اس زمانے میں عام اسکول صرف لڑکوں کے لئے ہوتے تھے۔ عورتوں کو گھروں پر تعلیم کے معمولی موقع مل جاتے تھے۔

(vi) بہت سے دیسی اسکول تھے جہاں صرف مسلمان طالب علم پڑھتے تھے اور ان اسکولوں کی نگرانی بھی مسلمان استاد کرتے تھے۔ ان میں فارسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اور بعض اسکولوں میں ہندوستانی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ مسلمان بچے عام ہندو اسکولوں میں بھی جاتے تھے۔

(vii) کچھ رپورٹوں میں اعلیٰ تعلیم کے ہندو اسکولوں کا ذکر ملتا ہے احمد نگر میں ایسے سولہ اسکول اور پونا میں ایک سو چوسٹھ اسکول تھے۔(۱)

ایڈم نے اپنی دوسری رپورٹ میں راج شاہی کی ناٹور کی تفصیلی رپورٹ لکھی ہے۔ تھانے (ناٹور) کی کل آبادی ایک لاکھ پچانوے ہزار دو سو چھیانوے تھی۔ جس میں ایک لاکھ انتیس ہزار چھ سو چالیس مسلمان تھے۔ اور پیسٹھ ہزار چھ سو چھپن ہندو تھے۔ جہاں ایڈم کو کل ستائس اسکول ملے جن میں طالب علموں کی تعداد دو سو باسٹھ تھی جن میں دس اسکول بنگالی تھے۔ یہاں طالب علموں کی تعداد ایک سو سڑسٹھ تھی۔ تئیس طالب علم چار فارسی اسکولوں میں تھے۔ قرآن پڑھانے کے لئے گیارہ عربی مدرسے تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً دو سو اڑتیس گاؤں میں رہنے والے پندرہ سو اٹھاسی خاندان تھے جن میں دو ہزار تین سو بیالیس افراد پڑھنے کے لئے بھیجے

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نور اللہ، ص ۳۱-۳۳

جاتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ گھروں پر تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد پبلک اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں سے تقریباً نو گنا زیادہ تھی۔ پبلک کے لئے بنے ہوئے ابتدائی اسکولوں میں داخلے کے اوسط عمر آٹھ سال تھی اور اسکول چھوڑنے کے عمر چودہ برس تھی۔

ایسے دیسی کالج نہیں تھے جنہیں مسلمان چلاتے ہوں۔ تعلیم نسواں کا تقریباً وجود ہی نہیں تھا۔ ناٹور ضلع میں بالغوں کی تعداد مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق اسطرح تھی :

۔ ہندو کالجوں میں استاد	۔	۳۹
۔ پڑھے لکھے لوگ جو استاد نہیں تھے	۔	۸۸
۔ کالجوں میں طالب علم	۔	۳۹۷
۔ جن لوگوں نے نوشت وخواند کی منزلوں سے آگے تعلیم حاصل کی	۔	۳۰۲۵۵
۔ وہ لوگ جو دستخط کر سکتے تھے	۔	۲۳۴۲
۔ کل تعداد	۔	۶۱۲۱

اس حساب سے مردوں کی پوری آبادی میں خواندگی کی شرح ۶٫۱ فی صد عورتوں کو شامل کر کے کل آبادی میں خواندگی کی شرح ۳٫۱ فی صد تھی۔

دیسی تعلیم کے متعلق ایڈم کی تیسری رپورٹ زیادہ اہم ہے اس سلسلے میں انہوں نے مرشد آباد، بیر بھوم، بردوان، جنوبی بہار اور تر ہوت کے ضلعوں سے اعداد وشمار جمع کئے گئے تھے اور ایڈم نے جو اعداد وشمار خود اکٹھا کئے ان پر وہ زیادہ بھروسہ کرتا تھا اور جو اعداد وشمار ایجنٹوں سے کرائے ان پر اسے اعتماد نہیں ہوتا۔ ایڈم نے لکھا ہے کہ :

''گو کہ مجھے یقین ہے کہ مجھے جو جوابات ملتے ہیں وہ عام طور پر
معتبر ہیں لیکن پھر بھی میرے پاس اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے
کہ وہ بالکل بے عیب ہیں۔ میرے ایجنٹ ہر ضلع کے تمام گاؤں
میں نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے گاؤں کی تعداد ہزار تک پہنچتی ہے اور
انکوائری کو حدود سے زیادہ طول دیئے بغیر یہ بات جسمانی طور
پر ممکن بھی نہیں تھی اسی لئے وہ یا تو اپنے ذاتی علم پر اکتفا کرنے
پر مجبور تھے یا پھر اس معلومات پر یقین کرنا پڑتا تھا جو دوسروں
سے حاصل ہوئی تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ جس بات کی تصدیق
کرنے کی جرأت کرسکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی
جس میں کوئی دیسی ادارہ نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ یہ بات ٹھیک
ہے کہ مجھے بعض اوقات ایسی مثالیں ضرور ملی ہیں کہ بعض
ادارے پہلے شمار میں نظر سے اوجھل رہ گئے تھے۔''(۱)

ایڈم نے دوسری بات یہ دیکھی کہ بعض دفعہ لوگ انکوائری سے اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے گھر کی عورتوں کی صحیح تعداد کو چھپایا اور اکثر تو اسکولوں اور کالجوں نے بھی خوفناک تفتیش سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا۔(۲) لیکن ان خامیوں کے اعتراف کے باوجود دیسی تعلیم سے متعلق ایڈم کو جو کچھ اعداد و شمار فراہم ہوئے اس اعداد و شمار کا خلاصہ اسطرح پیش کیا گیا ہے۔(۳)

---

(۱) ''ایڈم کی رپورٹ'' کلکتہ ایڈیشن، ص ۲۱۹

(۲) ایضاً، ص ۲۲۰

(۳) تاریخ تعلیم ہند، سید نوراللہ، ص ۴۳-۴۲

جدول نمبر۱

مدرسے

مدرسوں کی تعداد

ضلع	بنگالی	ہندی	سنسکرت	فارسی	عربی زبان	عربی	انگریزی	لڑکیوں کے لئے	میزان
مرشدآبا	۶۲	۵	۲۴	۱۷	......	۲	۲	۱	۱۱۳
بیربھوم	۴۰۷	۵	۵۶	۷۱	......	۲	۲	۱	۵۴۴
بردوان	۴۲۹+۱ چھوٹے بچے	......	۱۹۰	۹۳	۳	۸	۳	۴	۹۳۱
جنوبی بہار	......	۲۸۶	۲۷	۲۷۹	......	۱۲	۱	......	۶۰۵
ترہت	......	۸۰	۵۶	۲۳۴	......	۴	......	......	۳۷۴
میزان	۱۰۹۹	۳۷۶	۳۵۳	۶۹۴	۳	۲۸	۸	۶	۲۵۶۷

جلد نمبر۲

طالب علم

طالب علموں کی تعداد

	بنگالی اور ہندی	سنسکرت	فارسی اور عربی	انگریزی	لڑکیاں	کل میزان
مرشدآبا	۱۰۸۰	۱۵۳	۱۰۹	۲۶	۲۸	۱۳۹۶
بیربھوم	۶۳۸۲	۳۹۳	۴۹۰	۷۳	۱۱	۷۳۵۰
بردوان	۱۳۱۹۰	۱۳۵۸	۹۷۱	۱۳۰	۱۷۵	۱۵۸۱۴
جنوبی بہار	۳۰۹۰	۴۳۷	۱۴۸۶	۲۳	......	۵۰۹۳
ترہت	۵۰۷	۲۱۴	۵۹۸	......	......	۱۳۱۹
میزان	۲۴۲۵۰	۲۵۵۵	۳۶۵۴	۲۴۲	۲۱۴	۳۰۹۱۵

اوپر کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ عربی اور فارسی کے پانچ سو پچیس اسکولوں میں کل تین ہزار چھ

سو چوون بچے پڑھتے تھے۔اوسط کے حساب سے فی اسکول سات طالب علم تھے جو طلبہ کے تعلیمی شوق کی کمی کو ظاہر کرتی ہے۔سنسکرت اسکول تین سو ترپن میں دو ہزار پانچ سو پچپن طالب علم تھے یعنی دس بچہ فی اسکول اوسط آتا ہے۔ بنگالی اور ہندی اسکول ایک ہزار ننانوے تھے۔جن میں چوبیس ہزار دو سو پچاس طالب علم پڑھتے تھے یعنی فی اسکول چوبیس طالب علم اوسط رہا۔ظاہر ہے کہ بنگالی ہندی اسکولوں میں ہندو طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی۔ فارسی عربی اسکول جہاں مسلمان طلبا ہی پڑھتے تھے ان کی تعداد بہت کم تھی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یا تو تعلیم کا شوق کم تھا یا ان کی مالی حیثیت اتنی کم تھی کہ وہ تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔جس کے نتیجے میں مسلم معاشرہ پستی کی طرف جا رہا تھا اور دوسری قوموں کے مقابلے میں اس کی حالت نہایت افسوس ناک تھی۔اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے آج کل کے کالجوں سے ملتے جلتے تھے ان اداروں میں عموماً مذہبی تعلیم جو اس زمانے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جاتی تھی۔ان کا اصل مقصد مولوی اور پنڈت تیار کرنا تھا ان اداروں کی عام لوگوں میں بڑی عزت تھی۔حقیقت یہ ہے کہ خاص کردار، قدامت پرستانہ مزاج، دقیانوسی نظریات اور فرسودہ طریقہ تعلیم کی بنا پر تعلیمی نظام کے کمزور اور غیر مفید حصہ بن کر رہ گئے۔عوام میں تعلیم کو پھیلانے والی ایجنسی دیسی ابتدائی مدرسے معمولی قسم کے مفید ادارے تھے۔ان میں دی جانے والی تعلیم کارآمد ہوتی تھی۔اس تعلیم نے مولویوں اور پنڈتوں کی روحانی ضرورت تو پوری نہ کر سکی مگر زمینداروں اور کاشتکاروں کی روزمرہ کی ضرورتوں کو ضرور پورا کیا۔اسے کوئی مذہبی احترام حاصل نہیں ہوا اس لئے سرکاری اور غیر سرکاری آمدنی کا سہارا اس کے پاس نہیں تھا۔یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مقابلے میں ان اسکولوں کے طالب علموں میں چھوٹی سی تعداد لڑکیوں اور دوسری ذاتوں کی بھی تھی جو ان اسکولوں میں پڑھتے تھے۔

دیسی ابتدائی اسکولوں کے کچھ پہلو قابل توجہ ہیں۔ ان اسکولوں میں سامان بہت سادہ اور معمولی ہوتا تھا۔ اپنی کوئی عمارت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی تدریس کبھی استاد کے گھر میں ہوتی تو کبھی کسی درخت کے نیچے۔ اسکول عام طور پر چھوٹا ہوتا تھا طالب علم کی تعداد دس پندرہ تک ہوتی تھی۔ داخلوں کے لئے وقت مقرر نہیں تھا۔ سینئر لڑکوں سے جونیئر لڑکوں کو پڑھوانے کا طریقہ اسکولوں میں عام تھا۔ نصاب بہت محدود تھا۔ اس میں پڑھنا، لکھنا، حساب اور بہی کھاتہ سب شامل تھا۔ اس کے متعلق ایڈم نے یقینی طور پر ہندوستان میں نظام تعلیم دیسی زبانوں کی ہی بنیاد پر قائم کرنے کی سفارش کرتے ہوئے کہا ہے کہ :

> ''اعلیٰ یا ادنیٰ تمام قسموں کے موجودہ دیسی ادارے عوام کے کردار کو بلند کرنے اور بہتر کرنے کے سب سے اچھے ذرائع ہیں اور یہ کہ اس مقصد کے لئے ان اداروں کو استعمال کرنا سب سے زیادہ آسان، سب سے زیادہ محفوظ، سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ سستہ طریقہ ہوگا۔ تعلیم جیسے موضوع کے لئے دیسی ذہن کو جس تحریک کی ضرورت ہے اسے پیدا کرنے اور اپنی نشو ونما کے لئے خود ہی اپنی سعی کو بروے کار لانے کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے یہی منصوبہ سب سے زیادہ موثر ہوگا جس کے بغیر دوسرے ذرائع بھی بروئے کار نہ آسکیں۔''(۱)

دیسی مدرسوں میں تعلیم کی حالت اسطرح کی تھی جو بعد میں یہ دیسی مدرسے ختم ہوتے گئے اور ان کی جگہ پر سرکاری اسکول قائم ہوتے گئے۔ ان میں بھی مسلمان بچوں کی تعداد اوسطاً کم

---

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص ۵۳۔۵۴

ہوتا گیا کیونکہ سرکاری اسکولوں میں کتابیں اور دوسری تعلیمی ضروریات کی چیزوں کے اخراجات زیادہ ہی تھے۔ اسطرح ابتدائی تعلیم سے لیکر کالج کی تعلیم تک مسلمان پستی کی طرف اور ہندو ترقی کی طرف گامزن ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دنوں بعد سرکاری ملازمتوں میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے اور مسلمان سرکاری نوکریوں سے محروم ہوتے چلے گئے۔

یہ بات بھی سچ ہے کہ ملازمت کے علاوہ اور دوسرے کاروبار میں بھی ہندو فرقے کے افراد زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں تجارت پیشہ اور ہنرمند بھی تھے۔ جب کہ مسلمانوں میں تجارت پیشہ لوگ برائے نام ہی تھے اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے ایسے ہنر نہ سیکھ سکے جن میں تعلیم کی ضرورت ہوتی ہو۔ مثلاً انجینئر، ڈاکٹر وغیرہ جیسے پیشے ہندو ہی دستیاب کر سکے۔ مسلمان صرف مزدور کی حیثیت سے سوسائیٹی کا بوجھ بنتے تھے۔

انیسویں صدی کے نظام تعلیم کے اس جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان قوم ہندوؤں کے بہ نسبت زیادہ پس ماندہ تھی۔ نئی تعلیمی بیداری ہندوؤں میں پہلے آئی اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اور سماج کو زیادہ بیدار کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً تجارت ،صنعت و حرفت میں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ بیدار ہو رہے تھے۔ انگریزوں کی لائی ہوئی تعلیمی پالیسی کو مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ اپنا رہے تھے ان تمام وجوہات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی تعلیمی بیدرای اس وقت آ چکی تھی لیکن ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ سر سیّد احمد خاں کی علمی ذہانت اور غور و فکر نے مسلمان قوموں میں تعلیمی بیداری لانے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ انہوں نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنی قوم کی فلاح کے لئے ایک تعلیمی ادارے قائم کئے چنانچہ اس ادارے نے مسلمانوں کے لئے بڑا اہم فریضہ انجام دیا۔ اور اس طرح ہندوؤں کی تعلیمی بیداری کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں میں بھی تعلیمی بیداری کی شمع

سر سیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ میں روشن کی اور نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اب مسلمان بھی اپنے آپ کو علمی میدان میں مستحکم محسوس کرر ہے ہیں۔لیکن اس ادارے سے تمام امت مسلمہ جو ہندوستان میں بستے ہیں، کی تعلیمی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی ہے۔

باب سوم

سرسیّد کا تصور
تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت دو الگ الگ چیزیں ہیں صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بھی بنتا ہے۔ جیسا کہ بولنے میں یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت۔ مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔ بقول سر سیّد احمد خاں :

> ''تعلیم و تربیت دو متفرق چیزیں ہیں اس کو ہم معنی سمجھنا ایک قسم کی بھول ہے یعنی کہ جو کچھ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کے لائق کر دینا اس کی تربیت ہے۔ مثلاً جو قوتیں اللہ تعالیٰ نے ہم انسان میں رکھی ہیں اس کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔''(۱)

سر سیّد کے نظریہ تعلیم پر گفتگو کرنے سے پہلے اس عہد کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور تعلیمی حالات پر ایک نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر سر سیّد کی علمی بصیرت اور ان کے نظریہ تعلیم کی واقعی اہمیت پورے طور پر واضح نہ ہو سکے گی۔

سر سیّد احمد خاں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اس وقت محکومی کا دور تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور نکل کر سات سمندر پار کی ایک قوم کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ سلطنت مغلیہ اب بھی باقی تھی مگر عملاً اس کا اقتدار صرف لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھا۔ انگریز رفتہ

---

(۱) ''انتخاب مضامین سر سیّد''، مرتبہ عتیق احمد صدیقی، سر سیّد اکیڈمی، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۷

رفتہ سارے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لیتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار کیا گیا ان کی عزت و اقبال مندی کو گہن لگ گیا۔

زوال کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ غدر مسلمانوں کی مزید تباہی کا سبب بنا۔ اس ہنگامے نے مسلمانوں کی رہی سہی سیاسی شاخ بھی ختم کر دی۔ سلطنت مغلیہ جو برائے نام باقی تھی حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ بغاوت کے جرم میں پوری مسلم قوم کو نا قابل تصور ظلم و ستم کا تختہ مشق بنایا گیا جو معزز تھے انہیں ذلیل وخوار کیا گیا۔ جو صاحب حیثیت تھے ان کو مفلس و قلاش بنا دیا گیا، ان کے گھر اور مال و اسباب لوٹ لئے گئے ان کی جاگیریں چھین لی گئیں۔ ان کو عہدوں سے برطرف کر دیا گیا اور جب آتش انتقام اس سے نہ بجھی تو قتل و غارت گری کا وہ طوفان حشر خیز برپا کیا کہ بڑے بڑے اصحاب، عزو جاہ، ارباب علم و دانش اور صاحبان جبر و دستار بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اس خوف ناک دار و گیر کا انجام یہ نکلا کہ مسلمانوں کا ملی وجود پارہ پارہ ہو گیا۔ جو قوم صدیوں تک معزز و محترم تھی وہ ذلت و نکبت کے عمیق غار میں جا گری جس سے نکلنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی زوال دراصل انکے ذہنی و اخلاقی زوال کا نتیجہ تھا۔ سر سیّد کے عہد میں مسلمانوں کی جو زبونِ حالی اور علمی بے مائیگی تھی اسکا نقشہ خود سر سیّد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :

'' اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔ مشکل تو یہ تھی کہ قوم کو قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا جن کا تکبر وغیرہ سے ہر ایک پھولا ہوا ہے۔ دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ علم و انشا کی وہ خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن قلموں تک

ملانے اور دور انکار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کو لکھنے پر منحصر ہے۔فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی، مضمون تو بحز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہوتا اور وہ بھی نیک جذبات انسانی کو بظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تہذیب الاخلاق کے خلاف ہیں علم دین تو وہ خراب ہوا ہے کہ جس کی حد نہیں اس سے معصوم، سیدھے سادے بچے اور نیک طبیعت والا پیغمبر جو خدا کا احکام بہت سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے جاہل، ان پڑھ یا بادِنشین عرب قوم کو پہنچائے تھے ان میں وہ نقطہ چینیاں اور باریکیاں گڑھی گئیں اور وہ مسائل فلسفیانہ اور دلائل منطقیانہ ملائے گئے ان میں سچائی، صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔ یہ مجبوری تو لوگوں کو اصل احکام جو قرآن اور معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنے پڑے اور زید وعمر کے بنائے اصولوں کی پیروی کرنی پڑی علم ومجلس اور اخلاق و برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریق پر پڑ گیا جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔‘‘(۱)

ان دردناک حالات میں بھی مسلمان اپنی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے اور اپنے نظام تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ سرسیّد احمد خاں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کیا اور اس کی انتہائی پیچیدہ

---

(۱) تہذیب الاخلاق سرسیّد نمبر، اکتوبر ۱۹۹۸ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ص ۵۵

سیاسی ماحول میں مسلم قوم کو مذید زوال سے محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ان سارے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔اس کے لئے عملی قدم کے طور پر انہوں نے فاتح قوم کو اپنے لئے ماڈل قرار دیا اور انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے جہاں وہ بہت ہی قریب سے انگریزی قوم کی ترقی کے اسباب کی چھان بین کر سکتے تھے۔وہ انگلستان میں قیام کے دوران مغربی علوم اور فکر و فلسفے سے بے حد متاثر ہوئے۔وہ مسلمانوں میں اس روشنی کو پھیلانا چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم سے آراستہ ہوں اور سائنسی طرز فکر اختیار کریں۔روایتی رسم و رواج اور قدامت پرستی کر ترک کردیں۔مغربی طرز فکر و معاشرت کو اپنائیں،مغرب کی روشن خیالی پیدا کریں اور معاملات زندگی میں عقل و استدلال کو رہبر بنائیں۔

سرسیّد انگلستان سے واپس آ کر تبدیل شدہ قدرے رومانی کردار تھے ماضی سے زیادہ مسلمانوں کی حال اور مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانا چاہتے تھے۔وہ مسلمانوں کی سماجی اور ذہنی حالت میں تیز رفتار تبدیلی کے آرزومند تھے۔سرسیّد انگلستان سے زندگی کا یہ اصول بھی ساتھ لائے تھے کہ تعلیم اور سائنٹفک تلاش و تحقیق کسی قوم کی ترقی کی ضمانت ہیں۔تعلیم سے ان کی مراد جدید مغربی علوم بشمول سائنس تھی۔انہوں نے اسی احساس کے تحت ایک تحریک شروع کی اور چونکہ اس تحریک کا مرکز علی گڑھ تھا اس لئے یہ علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔یہ تحریک محض علمی یا سیاسی تحریک نہ تھی بلکہ یہ خاص طرز زندگی بھی تھی جس کے اوصاف میں خوش گفتاری، خوش باشی،خوش پوشی اور آزاد خیالی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔علی گڑھ تحریک کے اثرات اردو کی ادبی اور ثقافتی زندگی پر نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔انکی ترویج و اشاعت میں سائنٹفک سوسائٹی،انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا بہت بڑا دخل ہے اور نئی نسل کو فکر جدید سے

روشناس کرانے میں ان کی بہت بڑی اہمیت ہے۔سرسیّد نے اپنے خیال کی ترویج واشاعت کے لئے سب سے پہلے ۱۸۶۴ء میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی ۔علمی منصوبوں کا ایک دوسرا منصوبہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے منظر عام پر آیا۔اس کا اجرا ۱۸۶۶ء میں ہوا۔یہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی چھپتا تھا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ ملک میں سنجیدہ اور تعمیری جذبے کی اشاعت کی جائے اور جدید خیالات و افکار سے مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے۔

سرسیّد کو قیام انگلستان کے دوران وہاں کے دو جرائد ''اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر'' نے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ وہ انہی کی طرز پر ۲۴؍دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔اس رسالے کا مقصد دراصل اپنی قوم میں ذہنی انقلاب اور جدید تعلیمی تقاضوں کا شعور پیدا کرنا تھا۔اس کے ذریعہ وہ قومی اخلاق کو بھی بہتر بنانا چاہتے تھے۔اس پرچہ سے مذہبی امور میں فکر ونظر کی آزادی اور جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا۔

سرسیّد کے تعلیمی نظریات کی نشونما میں مغربی علوم اور سائنسی طرز استدلال اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی کی گہری بصیرت کا بڑا دخل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مغربی تہذیب ومعاشرت اور حکومت وقت سے وفاداری کا جذبہ بھی کارفرما ہے اسی لئے سرسیّد کے تعلیمی نظریات کے فروغ میں سیاسی اور تعلیمی عوامل پورے طور سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

سرسیّد کے تصور تعلیم کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کو ایک عظیم مقصد سے مرتب کیا اور وہ تھا سیاسی وسماجی زبون حالی کا ازالہ اور معاشرتی وثقافتی ترقی کا حصول۔ انہوں نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ کسی قوم کی تنزلی کو دور کرنے کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تعلیم کے اشاعت میں دلچسپی لی جائے اور مختلف علوم وفنون کے فروغ پر توجہ دی

جائے۔اس ضمن میں سرسیّد کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

''انسان کے قوی جب ضعیف ہو جاتے ہیں اور اعتدال مزاج جب درہم برہم ہو جاتا ہےتو وہ متعدد متضاد بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی حال قوم کا ہوتا ہے۔ جب اس کو تنزل ہوتا ہے تو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا ہے بلکہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راست بازی، دیانت داری، دولت، Civilization، تمکنت، متانت سب چیز میں ہوتا ہے اور جو لوگ اس کے اصلاح کے درپہ ہوتے ہیں وہ حیران ہو جاتے ہیں کہ کس کس چیز کا اعلاج کریں۔

''دل ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم'' مگر جب غور کی جاتی ہے تو بجز تعلیم و تربیت کے اور کوئی اس کا علاج نظر نہیں آتا۔''(۱)

اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت سے سرسیّد کا اصل مقصد ان کی ملی وقومی زندگی کی تعمیر اور ان کی پروقار سماجی حیثیت کی بحالی تھی۔ سرسیّد احمد خاں نے مدرستہ العلوم یا ایم۔اے۔او کالج اس لئے قائم نہیں کیا کہ لوگوں کو ڈگری مل جائے اور وہ سرکاری ملازمت کے اہل بن جائیں لیکن اس کے ساتھ انہوں نے یہ وضاحت کی کہ اس ادارہ میں ایسے علوم فنون کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے کہ اس سے استفادہ کرنے والے خود معاش کے ذرائع پیدا کر سکیں۔سرسیّد نے اسی نیک خواہشات کے تحت یہ ادارہ قائم کیا اور جب وہ اپنے مقصد میں دھیرے دھیرے کامیاب ہونے لگے تو بعض لوگوں نے ان پر اور ان کے ادارے پر تنقید کرنا شروع کر دیا۔لیکن اس سے سرسیّد کے مقصد (Mission) کو وہ نہیں روک سکے بلکہ سرسیّد نے مدرستہ العلوم کے مقصد قیام پر ایک معترض کا جواب دیتے ہوئے

---

(۱) خطبات سرسید، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، جلد۲۔مجلس ترقی ادب لاہور، ب ت۔ ص۲۸۶-۲۸۵

لکھا ہے کہ :

''جناب من! آپ نے مقصد مدرستہ العلوم پر غور نہیں فرمایا اس کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان علوم وفنون میں ایسی تعلیم پا جاویں کہ بلا ذریعہ نوکر خود اپنے بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور چونکہ مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لئے مستقل مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔''(۱)

سرسیّد کا مقصد ہی تعلیم تھا جس نے ان کے تصور کو وسعت و جامعیت عطا کی ان کے افکار وخیالات اور تعلیمی مِشن کے مختلف مراحل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ وہ ایک ایسے نظام تعلیم کے داعی والم بردار تھے جس میں قدیم وجدید دونوں کا امتزاج پایا جائے اور جس میں مشرق ومغرب دونوں کی روایت کا پرتو نظر آئے۔ بلاشبہ وقت کے تقاضوں اور نئے زمانہ کی ضروریات کے تحت سرسیّد کے تعلیمی تصورات میں جدید تعلیم خصوصی حیثیت حاصل تھی اور ایم۔ اے۔ او۔ کالج کی درسیات میں عصری علوم فنون کی اہمیت اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ان کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہوئی۔ سرسیّد نے اپنے ایک خطبہ میں جدید تعلیم کے اہتمام پر زور دینے کے بعد مشرقی تعلیم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ :

''اسی کے ساتھ ہم کو عربی کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے جو قطعہ نظر اس کے وہ مسلمانوں کی زبان ہے ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی زبان ہے جس کی قدر کی جا سکتی ہے اور کسی طرح علمی زبان کے دائرہ سے علیحدہ نہیں رہ سکتی اور مسلمانوں کی ضروریات

---

(۱) مکاتب سرسیّد احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین خان) فرینڈ بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۱۶-۳۱۵

سے خارج نہیں رہ سکتی ...... مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینا بھی ادنیٰ
درجہ کی یا اوسط درجہ کی یا اعلیٰ درجہ کی ہم پر فرض ہے کیونکہ مختلف
اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنا دیا ہے وہ صرف اسلام ہے اگر
ہم اس کی فکر نہ رکھیں تو وہ قومیت قائم نہیں رہ سکتی۔''(۱)

سرسیّد کے تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بھی مندرجہ بالا خیالات کی روشنی ملتی ہے جن کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسا جامع و وسیع تصور علم رکھتے تھے انہوں نے اپنے اسی تصور علم کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۰ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا چھوٹا سا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

''ہر ضلع میں کم سے کم ایک مدرسہ قائم کرنا چاہئے جن سے ہر قسم
کے مطلب و مقاصد پورے ہوں کیونکہ تمام لوگوں کے مقاصد
ایک ہی سے نہیں ہوتے اگر کوئی شخص مولوی، محدث وفقیہ بننا
چاہے تو مولوی بننے کا موقع بھی اس میں موجود ہو۔ اگر کوئی
شخص بڑا ریاضی داں بننا چاہے تو وہ بھی اس میں اپنا مقصد
حاصل کر سکے اور اگر کوئی شخص علوم و زبان انگریزی میں تحصیل
کامل کرنا اور عہد ہائے جلیلہ گارنمنٹ کو حاصل کرنا چاہے تو وہ بھی
کر سکے۔ جب ایسا انتظام اور سلسلہ قائم ہو جاوے گا تب
مسلمانوں کی تربیت دینی اور دینوی ترقی کی توقع ہوتی
ہے۔''(۲)

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۵۰۔۲۴۵

(۲) ایضاً ص۲۵۶

مسلمانوں میں علوم وفنون کے فروغ اور تعلیم کی اشاعت کے لئے سرسیّد نے جو مہم چلائی اس کا اصل مظہر مدرسہ العلوم تھا۔ دراصل سرسیّد ایسا مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے جو تین مدرسوں پر مشتمل ہو، اول وہ جس میں انگریزی پر خاص زور دیا جائے اور تمام علوم وفنون انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں۔ دوم وہ جس میں جملہ علوم وفنون کے لئے اردو ذریعہ تعلیم ہو البتہ ہر طالب علم تین زبانوں (انگریزی، عربی و فارسی) میں سے ایک بطور ثانوی زبان اختیار کرے۔ تیسرا عربی اور فارسی کا مخصوص مدرسہ جس میں اول الذکر دونوں مدرسے کے وہ فارغین حاصل کریں جو عربی و فارسی اور متعلقہ علوم میں امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہوں۔

سرسیّد احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۷۷ء میں اس نے ایم۔اے۔او۔کالج کی شکل اختیار کی اور ۱۹۲۰ء میں یہ مسلم یونیورسٹی بن گئی۔ اس ادارہ میں شروع سے ہی جدید تعلیم کے ساتھ عربی و فارسی، زبان وادب، منطق وفقہ، دینیات وتمدن جیسے مضامین اس کی درسیات کا حصہ بنے اور السینہ مشرقیہ متعلقہ مضامین کی تعلیم کے اہتمام کے لئے اورینٹل ڈیپارٹمنٹ (شعبہ علوم مشرقیہ) قائم ہوا۔ ویسے سرسیّد کے ذہن میں دینیات کی تعلیم کا بہت ہی وسیع و جامع تصور تھا۔ وہ دینیات کی تعلیم میں نیا پن پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ دینیات کی تعلیم سے ان کی مراد تفسیر، حدیث، فقہ، وصول حدیث، وصول تفسیر، علم عقائد، علم تعلیم کا اہتمام تھا۔ انہوں نے دینی تعلیم میں جدیدیت لانے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے۔

دینیات کے علاوہ عربی و فارسی زبان وادب کی درسیات میں بھی سرسیّد جدت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان مضامین کی تعلیم سے مراد محض مختلف زبانوں کی واقفیت پہنچانا نہیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان مضامین کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ طلباء میں زبان کی اصلیت اس کی نشونما اور

تاریخ کے گہرے مطالعے کا ذوق بڑھے اور ان میں تنقیدی شعور بیدار ہو۔

سرسیّد درسیات میں جدید علوم کے ساتھ قدیم علوم کی شمولیت کے بھی قائل تھے۔لیکن وہ اس بات پر خاص زور دیتے تھے کہ قدیم علوم بھی نئے انداز اور جدید اسلوب کے مطابق پڑھائے جائیں تاکہ نظام تعلیم میں ہم آہنگی قائم رہے اور معاشرہ کی نئی ضروریات کی تکمیل کے لئے ان علوم کی صلاحیت کو بہتر طور پر استعمال کیا جاسکے۔

مجموعی طور پر سرسیّد کے خطوط، خطبات ومقالات کے مطالعہ سے ان کی یہ خواہش وکوشش نمایاں ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لئے مختلف حلقوں سے کوشش کی جائے۔اوران سب میں آپس میں نہ صرف تال میل ہو بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ بھی فروغ پائے۔مدارس میں دینی تعلیم کے حصول کو اصل مدعا قرار دیا جائے۔

انگریزی زبان اور عصری علوم کے کچھ منتخب مضامین جزوی طور پر شامل نصاب کئے جائیں۔عصری تعلیم گاہوں میں جدید علوم وفنون پر خاص توجہ صرف کی جائے اور اس کے ساتھ السنہ مشرقیہ اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔

دینی مدارس کے طلبا کو یونیورسٹیوں یا اعلیٰ تعلیم کے جدید اداروں میں تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں اور عصری جامعات کے طلبا کے لئے دینی علوم میں اختصاص وامتیاز کی خاطر دینی مدارس میں تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔

سرسیّد تعلیم میں مکمل آزادی کے قائل تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم ان کے ہاتھ میں رہے وہ خود اپنی تعلیم کے مالک ہوں اور بغیر کسی مداخلت کے اپنی قوم میں علوم وفنون کو فروغ دیں۔چنانچہ انڈین ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا :

''جب تک لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت

مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے...... تعلیم کو حکومت کی گرفت سے آزاد ہونا چاہئے۔''(۱)

تعلیم کے سلسلے میں سر سیّد کا یہ خیال ہی کچھ اہم نہیں ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچوں کی تعلیم کا خود اپنا نظم قائم کرنا چاہئے۔ اس حقیقت کے باوجود سر سیّد نے جدید علوم وفنون کے حصول اور مغربی طرز تعلیم اپنانے پر خاص زور دیا۔ انہوں نے بہت واضح انداز میں یہ خیال پیش کیا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد صحیح معنوں میں اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ان کا نظم خود انکے ہاتھوں میں ہو اور جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گا اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے۔ انہیں اس سے بھی اتفاق نہیں تھا کہ مسلمان اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں تعلیم کے لئے بھیجیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کو سخت ناپسند کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کے لئے باعث شرم سمجھتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ سر سیّد کا نقطۂ نظر صرف اسکولوں یا بچوں کی تعلیم تک محدود تھا بلکہ اعلیٰ تعلیم سے متعلق بھی یہی تصور رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس سطح پر بھی ان کا اپنا نظام تعلیم ہو جس پر نہ حکومت کا کنٹرول ہو اور نہ یونیورسٹی کی بالادستی قائم ہو۔ وہ ۱۸۹۴ء میں جالندھر میں اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:

''اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے میں ہوگی۔ یونیورسٹی کی غلامی سے ہمیں آزادی حاصل ہوگی ہم اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بے غیر یونیورسٹی کی غلامی کے ہم اپنی قوم میں علوم پھیلا دیں گے۔ فلفسہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر ہوگا۔''(۲)

---

(۱) علی گڑھ تحریک، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ص ۳۱۷، بحوالہ سر سیّد احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، پروفیسر عتیق احمد صدیقی

(۱) خطبات سر سیّد، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، جلد ۲۔ ص ۲۷۶

واقعہ یہ ہے کہ سرسیّد کا یہ اپروچ ان کے اصل تصور تعلیم سے جڑا ہوا ہے۔ سرسیّد کے تصور تعلیم میں قدیم وجدید دونوں کی جھلک ملتی ہے اور مشرقی ومغربی روایات کا پرتو پایا جاتا ہے اور ان سب سے اہم یہ کہ اس کا مقصد قومی وملی زندگی کی تعمیر قرار دیا گیا ہے اس تصور کو صحیح معنوں میں اسی وقت عملی جامعہ پہنایا جاسکتا ہے جب تعلیم کا انتظام خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں میں ہو اور حکومت یا بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو۔ سرسیّد کے خیال میں حکومت کے تعلیمی اداروں سے تعلیم کا وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا ہے جو اصلاً اس سے مطلوب ہے اس لئے ان اداروں میں تعلیم کا خاص مقصد طلبا کو سرکاری ملازمت کے لئے تیار کرنا یا ان کے معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔ وہاں ارباب اقتدار کو نہ تو طلبا کی تربیت سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ ان کی اخلاقی زندگی کی تعمیر کی کوئی فکر ہوتی ہے۔

مزید برآں سرسیّد نے جہاں مدرستہ العلوم کے قیام کی ضرورت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے وہاں بھی اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ ان کے ذہن میں جو تعلیم کے اغراض ومقاصد ہیں وہ سرکاری اداروں سے پورے نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ ایک نیا مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جائے اور جس میں تعلیم کے ساتھ تربیت اور علمی ترقی کے ساتھ اخلاقی زندگی کی تعمیر کا بھی اہتمام ہو۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے قائم کرنے کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ طلبا مختلف علوم وفنون کو نئے ڈھنگ اور جدید اسلوب کے مطابق حاصل کریں ان میں مطالعہ وتحقیق کا وہ ذوق چڑھے جو مغرب میں پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کالج کی زندگی میں ان کے اندر وہ ڈسپلن قائم ہو اور اصول وضوابط کی پابندی پیدا ہوجائے جن کا مشاہدہ وہ خود آکسفورڈ وکیمبرج کی یونیورسٹیوں میں کر چکے تھے۔ اس مقصد کے تحت سرسیّد نے کالج میں ہندوستانی اساتذہ کے ساتھ یوروپین اسٹاف بھی مقرر کیا اور درس وتدریس کے کام میں بھی

مشرقی ومغربی روایات کوفروغ دینا چاہا۔اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستانی ویورپین اساتذہ کے باہمی میل جول وتعلقات کے زیراثر بھی جدید وقدیم تعلیم کے امتزاج کو وسعت دینی چاہی۔اس انتظام سے نہ صرف مشرقی علوم وفنون کے ماہرین کوایک دوسرے کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع فراہم ہوا بلکہ وہ ایک دوسرے کی علمی خدمات وتحقیقات سے مستفید بھی ہوئے۔ دراصل سرسیّد کا منتہائے مقصود مسلمانوں میں مختلف علوم وفنون کی اشاعت عصری تعلیم میں دلچسپی پیدا کرنا اورعلمی وتحقیقی ذوق کوفروغ دینا تھا۔اس راہ میں انہیں جو چیز مفید ومناسب نظرآئی (خواہ اس کاتعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے) اسے قبول کرنے سے گریزنہیں کیا بقول خلیق احمد نظامی :

''وہ چاہتے تھے کہ مشرق کی ہرعمدہ چیز کو باقی رکھا جائے لیکن مغرب کی بھی کسی چیز کے حاصل کرنے میں گریز نہ کیا جائے۔''(۱)

سرسیّد احمد خاں کے نزدیک ایسی تعلیم بالکل بےسود تھی جس سے عقل انسانی کوشگفتگی و شادابی اوراس کے روحانی واندرونی قویٰ کوتوانائی حاصل نہ ہو جب عقل انسانی کوشگفتگی حاصل ہوگی تو وہ انسانی مسائل پرغورکرے گی،ان کا حل تلاش کرے گی،انسانوں کی مشکلات کودور کرے گی،اس کے لئے آسانیاں وآسائشیں فراہم کرے گی،اس کی مادی قوتوں کی تکمیل کرے گی،قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں تک رسائی حاصل کرے گی،قدرت کے عطیات کونعمت تصورکرانکی قدرکرے گی،ان کے صحیح استعمال کا پتہ لگائے گی،اس کی نت نئ صورتیں بخشے گی اور ان کومفید سے مفید بنائے گی جیسا کہ عتیق احمد صدیقی نے لکھاہے کہ :

''سرسیّد تعلیم کوزندگی کےنشوونما کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے یعنی

(۱)''سرسیداورعلی گڑھ تحریک''،خلیق احمد نظامی،ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص۱۱۴

تعلیم کو زندگی کے نشو نما میں معاون ہونا چاہئے ۔ انہوں نے تعلیم کو مشرق اور مغرب کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جمود و حرکت، زوال و ارتقاء اور پس روی و پیش روی کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس تعلیم کے داعی و نقیب ہے جو جمود کے بجائے حرکت، زوال کے بجائے ارتقاء اور پس روی کے بجائے پیش روی میں مددگار ہو اس سے ذہن کے دریچے کھلے، مخفی صلاحیتوں کے سر بند چشمے اس سے جاری ہو سکیں، اس سے نظر میں وسعت و بلندی پیدا ہو، وہ توانائی پیدا ہو جو قدرت میں بکھری ہوئی نعمتوں کو اپنے قابو میں لا سکے، حسن تدبیر کا وہ فن حاصل ہو جو مضرات کا دفعیہ کر سکے، جس سے تمام قوم کی آسودگی اور شائستگی اور اقبال کو ترقی ہو۔ نیز عمدہ ہنر اور فن اور نیک اخلاق وغیرہ قوم کو حاصل ہوں۔"(۱)

سرسیّد نے تعلیم کے حصول کے لئے دو چیزوں کو ضروری قرار دیا اول یہ کہ ایسی نصاب تشکیل دی جائے جو مختلف علوم فنون کا جامع ہو یا جس میں قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج پایا جائے دوسرے یہ کہ تعلیم کے ساتھ طلباء کی مذہبی و اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا جائے ۔ سرسیّد اسی نقطۂ پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ہم کو گزشتہ و حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقہ متعین کرنا چاہئے جس سے علم دین و دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔"(۲)

(۱) فکر و نظر، سرسیّد نمبر، اکتوبر، ۱۹۹۲ء لیتھو آفسیٹ، اچل تال، جی ٹی روڈ علی گڑھ، ص ۲۳

(۲) مقالات سرسیّد، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۱۱-۳۱۰

سرسیّد نے اسی جامع تصور کو اپنے قائم کردہ ادارہ مدرستہ العلوم یا ایم۔اے۔او۔کالج میں پوری طرح جلوہ گر کرنے کی کوشش کی۔اس میں شک نہیں کہ جدید دور کے مطالبات اور نئے دور کے تقاضوں کے تحت انہوں نے اس ادارے میں جدید تعلیم کو زیادہ اہمیت دی اور اس کی درسیات میں اصل علوم وفنون کا حصہ غالب رکھا۔لیکن مشرق و مذہبی علوم وفنون کی تعلیم کے اہتمام سے وہ کبھی غافل نہ رہے۔انہوں نے شروع سے ہی ایم۔اے۔او۔کالج کے نصاب میں جدید علوم کے ساتھ عربی و فارسی زبان وادب، منطق وفقہ، دینیات واسلامی تاریخ وتمدن جیسے مضامین کو شامل کیا ان کی تدریس کا باقاعدہ انتظام کیا۔یہ سب کچھ اس لئے بھی تھا کہ سرسیّد مسلمانوں میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔جو مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتیں نمایاں کرسکیں۔جو جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ قدیم علمی وثقافتی ورثہ کی بھی حفاظت کرسکیں۔

سرسیّد کا تصور تعلیم بڑا ہی جامع اور ہمہ گیر تھا وہ ایک ایسا صالح اور فعال تصور رکھتے تھے جو فرد کو اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بناتا ہو۔وہ ایسے افراد تیار کرتا ہے جو معاشرتی زندگی میں بوجھ نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے افادیت کے حامل ہوتے ہیں اس ضمن میں سرسیّد کا خیال تھا کہ :

> ''انسان کی روح بغیر تعلیم کے اس چتکبرے سنگ مرمر کے
> چٹان کی مانند ہے جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا
> اس کو تراش کر شڈول نہیں بناتا اس کو پالش اور حلا سے آراستہ
> نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اس میں چھپے رہتے ہیں
> اور اس کی خوشنمائی سے اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے

ظاہر نہیں ہوتے یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر نیکی اور ہر قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہوسکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی و ابدال، نیک و عقلمند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہیں۔ وحشی قوموں پر بھی اچھی باتیں ہوتی ہیں لیکن ان کی وحشیانہ نیکیاں نہایت ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوئی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہوسکتی ہیں۔ میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قومی استقلال دیکھتا ہوں پر بے دھنگا، ان میں صبر و قناعت بھی ہے اور غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین و دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں۔''(۱)

تعلیم سے سر سیّد احمد خاں کا مقصد قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا۔ وہ مغربی تعلیم کو سائنسی علوم کے حصول کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کے تجربی ہونے کی طرف

(۱) تہذیب الاخلاق، سر سیّد نمبر، جلد ۱۸، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹

اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجد اور خانقاہوں
کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور
عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہے اور ان کو تسلیم نہ
کرے۔مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس
زمانے کے فلسفہ اور حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔
اب مسائل طبعی تجربے سے ثابت کئے جاتے ہیں اور ہم کو
دکھائے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جو قیاسی دلائل
سے اٹھا دیئے جائیں۔''(۱)

سرسیّد احمد خاں نے اپنے دور کے ہندوستان کے تمام سیاسی، سماجی اور معاشی خرابیوں کا علاج تعلیم میں پایا۔ انہیں یقین تھا کہ لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو لوگ غیر مہذب زندگی جینے پر مجبور ہو جائیں گے وہ ایسا نظام تعلیم چاہتے تھے جو عوام کے لئے ہو اور قوم کا ہر ایک بچہ پڑھنے لکھنے کی سہولت سے محروم نہ رہ سکے۔ ان کی نظر میں انفرادی تعلیم کے بجائے قومی تعلیم کی زیادہ اہمیت تھی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

''جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت
مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی
تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر
بخوبی کر سکتے ہیں۔ بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے
کہ ہم کو اپنی اولاد میں تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے مگر یہ

---

(۱) سرسیّد کے لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ سراج الدین، قومی بازار کشمیر، ۱۸۹۰ء، ص ۲۸

ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے

۔ جہالت اور نا تربیتی وبا کی مانند ہوئی ہے جب تک تمام شہر اس

سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔

کسی علم کے پڑھ لینے سے انسان تربیت یافتہ نہیں ہو جاتا جب

تک کہ اس کے لئے ایک بہت بڑا گروہ اس کے ہم جنسوں کا

جس میں اس کا میل جول ہو تربیت یافتہ موجود نہ ہو۔ پس

خوب سمجھ لو کہ جو شخص قومی تعلیم و تربیت پر متوجہ نہ ہوگا درحقیقت

اپنا اور اپنی اولاد کا نقصان کرے گا۔''(۱)

اجتماعی اور قومی تعلیم کا تصور جو آج عام ہے اس کے زمانے میں بالکل اجنبی اور نیا تھا لیکن انہوں نے بہت پہلے اس کی معنویت تسلیم کر لی تھی۔ وہ مدرسوں اور کالجوں کی مروجہ تعلیم کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ کتابی اور روایتی ہوتی تھی۔ وہ ایسے مدارس کی ضرورت پر اصرار کرتے تھے جو مفلس محتاج اور نالائق بنانے کے بجائے انسان میں قومی، وطنی اور ملی شعور کی نشو ونما کر سکے اور یہ صرف لائق اور صاحب کردار اساتذہ کی نگرانی میں ممکن ہے۔

سر سیّد احمد خاں نے تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑا۔ انہوں نے تعلیم اور انفرادی زندگی کے حوالے سے سماجی اور اقتصادی پہلو پر زور دیا۔ اور اسے معاشی بہبود کا ذریعہ قرار دیا۔ انہوں نے سرکاری ملازمتوں اور حکومت کے دفاتر چلانے کے لئے بابو تیار کرنے پر قناعت کرنے کے بجائے تجارت اور دوسرے پیشوں کو ترجیح دی اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب دلائی۔ تا کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ کمپنیاں قائم ہوں اور اس سے ملک کی اقتصادی حالت بہتر بن سکے۔

سر سیّد احمد خاں کا یہ خیال تھا کہ تعلیم کا بندوبست خود ہندوستانی جب تک اپنے ہاتھ میں نہ

---

(۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، طبع ۱۹۳۷ء، ص ۱۵

لیں گے تب تک اس کا انتظام قابل تسفی نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لے اسوقت تک اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ سرسیّد کے خیال میں :

''تعلیم سے ہماری مراد موافق عرف عام کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔

عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو۔ یہ ہے کہ ان کے ذہن میں سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل خندۂ ناتراش سے پڑھا لکھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوتی ہو زندگی کے کاروبار میں اس کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہوتی ہے۔''(۱)

سرسیّد تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی ہر طرح سے ترقی چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک قومی ہمدردی اور تعلیم لازم وملزوم اور ایک دوسرے کے بغیر اپنے مفہوم میں مکمل نہیں ہوتے۔ وہ دینی علوم کے فروغ کے بھی خواہش مند تھے مگر انہوں نے اپنا سارا زور جدید تعلیم پر صرف کیا ان کا خیال تھا کہ اس میں مہارت حاصل کرنا وقت اور حالات کا تقاضہ ہے حالانکہ مسلمان اسوقت انگریزوں سے سخت بیزار تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم مسلمانوں کو گمراہ کر دے گی۔ اور اسی خیال کے سبب سرسیّد کو سخت پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور لوگوں نے ان کو ملحد،

---

(۱) مضامین سرسیّد، مع تبصرہ از نسیم قریشی۔ مرتبہ عزیزالدین اختر، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، ب ت۔ ص ۶۵

کافر کہہ کر پکارا مگر اس مرد درویش کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر بھی لغزش نہیں آئی۔

سر سیّد کی تعلیمی تحریک کے کئی مقاصد تھے اولاً وہ یہ چاہتے تھے کہ قدیم روایتی تعلیم اور اس کا نظام فرسودہ ہو چکا ہے جدید تحقیقات اور نئی روشنی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی جب کہ جدید تعلیم میں سائنس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی سے مادی ترقی کی بھی راہیں کھل جاتی ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس زمانے کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن میں مہارت حاصل کر سکے۔ انہوں نے جدید علوم کو جو اصل میں مسلمانوں سے سیکھے ہوئے علوم کی ترقی یافتہ شکل میں ہیں دوبارہ حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جن لوگوں نے ہم سے علم لئے ہیں اور ان کو ترقی دی ہے اب ہم ان سے وہی علوم لیں اور ان کے سیکھنے میں کوشش کریں ہماری آئندہ نسلوں کو اور ہمارے واسطے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے اور ایسا ہی کرنا ہم پر لازم ہے تاکہ ہم جدید علوم سیکھیں جن میں کہ روز بہ روز ترقیاں اور کارآمد چیزیں موجود ہیں۔''(۱)

سر سیّد کے تصور تعلیم کا دوسرا اہم ترین عنصر یہ تھا کہ تعلیم کے ساتھ طلباء کے تربیت کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے اس بات میں ان کا واضح موقف یہ تھا کہ ایک جامع نصاب کے مطابق عمدہ سے عمدہ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت کا اہتمام نہیں ہے تو وہ تعلیم مفید نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے شخصی و قومی زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ جو اس سے اصلاً مطلوب ہے ان کی نظر میں اس مقصد سے ہم کناری کے لئے تربیت کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم کے لئے جان کی ہے۔ سر سیّد کا نقطۂ نظر ان

---

(۱) مضامین سر سیّد، مع تبصرہ از نسیم قریشی، ص ۲۵

کی ایک تقریر کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے :

''یہ حالت تو صرف تعلیم کی تھی مگر صرف تعلیم سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیا صرف تعلیم سے انسان انسان بن جاتا ہے؟ اور''کمثل الحمار یحمل الاسفارا'' سے زیادہ مرتبہ پاسکتا ہے؟ کیا صرف تعلیم سے قوم قوم بن جاتی ہے؟ کیا صرف تعلیم سے قوم دنیا کی قوموں میں عزت پاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں ۔ بلکہ جب تک وہ انسان نہ بنے اور قوم قوم نہ بنے اس وقت تک موجز نہیں ہوسکتی۔ پس ہم مسلمانوں کو تعلیم سے زیادہ وہ چیز کرنی ہے جس کو ہم تربیت کہتے ہیں اور جو قوم کو قوم بننے کے لئے ایسی ہے جیسے جان بدن کے لئے ۔ اور بے غیر اس کے قوم کا قوم بننا محالات سے ہے۔''(۱)

اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سرسیّد تربیت کو تعلیم کا لازمی عنصر تصور کرتے تھے اور وہ اس میں یقین رکھتے تھے کہ اس کے بغیر نہ تو صحیح طرز پر انفرادی زندگی کی تعمیر ممکن ہے اور نہ اجتماعی زندگی کی تشکیل اور سماجی وثقافتی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ وہ برملا کہتے تھے کہ جدید علوم وفنون کا اکتساب یا بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری کا حصول ایک شخص کو مہذب بنانے اور اسے سماج میں عزت و وقعت کا مقام دلانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ اسے ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے، بات چیت، باہمی سلوک وتعلقات اور مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ نہ آجائے۔ اور یہ چیز تربیت ہی سے ہاتھ آسکتی ہے۔

اس طرح سرسیّد طلبا کی تربیت کے ضمن میں بہت ہی وسیع وجامع تصور رکھتے تھے اس سے

---

(۱) خطبات سرسیّد جلد دوم،ص ۲۵۰

ان کی مراد ذہنی و جسمانی، تحریری وتقریری، مذہبی و اخلاقی، معاشرتی و معاشی، مختلف امور میں طلبا کی صحیح رہنمائی اور ان کی عملی مشق ہے۔ ان کی نظر میں طلبا کی صلاحیتوں کو صحیح رخ عطا کرنا اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے انہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانا اس تربیت کا خاصا ہے۔ تعلیم کے ساتھ تربیت پر زور دینے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ طلبا استادوں اور کتابوں کے ذریعہ جو کچھ اچھی باتیں سیکھیں انہیں روزمرہ کی زندگی میں برتنے کی عملی مشق کرائی جائے تا کہ وہ نہ صرف علوم و فنون کے ماہر بن کر نکلیں بلکہ ایک با اخلاق و با کردار انسان اور مہذب و متمدن ہستی کی حیثیت سے بھی معاشرے میں اپنا مقام بنا سکیں اور ملک و ملت کے لئے بہتر و مفید خدمات انجام دے سکیں۔ وہ تعلیم کو علم کے کسی خاص دائرے میں محدود کرنے کے مخالف تھے اس طرح تربیت سے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کسی ایک اور بعض امور میں طلبا کو تربیت دینے سے اس کا اصل مقصد پورا نہیں ہوسکتا ہے۔ سرسیّد نے مختلف مواقع پر اس حقیقت سے مسلمانوں کو روشناس کرایا۔ جہاں تک جدید تعلیم یا سائنسی علوم کے اکتساب کا تعلق ہے اس کا بخوبی اہتمام مختلف سرکاری اسکولوں و کالجوں میں موجود ہے اور ان کے دروازے مسلم طلبا کے لئے کھلے ہوئے ہیں لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج کے قیام کی ضرورت اسے لئے پیش آئی کہ ان میں مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ دوسرے وہاں تعلیم کے ساتھ تربیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے یا اگر ہے تو کسی خاص میدان یا محض امور معاش میں طلبا کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے اس ضمن میں سرسیّد فرماتے ہیں کہ :

''ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس
کے عقل اور ذہن میں ایک جدت پیدا ہوتا کہ جو امور پیش
آئیں ان کو سمجھنے کی بھلائی برائی جاننے کی اور عجائب قدرت

الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دیں اور امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا ہے کہ ہم کو تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اسقدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے۔ صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر نہایت بیجا ہے۔"(۱)

سرسیّد کو بخوبی اس بات کا احساس تھا کہ حکومت کے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم دونوں کی کفالت تھی۔ اس لئے انہوں نے بار بار اہل قوم کو اس جانب متوجہ کیا کہ وہ خود اس اہم مسئلہ پر غور کریں اور اس کا حل نکالیں۔ سرسیّد کی نظر میں اس کا واحد حل یہ تھا کہ مسلمان خود اپنا جامع نظام تعلیم و تربیت مرتب کریں اور انہیں عملی شکل دینے کے لئے اپنے اسکول و کالج قائم کریں۔ اسی ذریعہ سے وہ ایسا نظام تعلیم جاری کر سکتے ہیں جہاں ان کی مرضی کے مطابق طلباء کو مختلف علوم وفنون کو اکتساب کی سہولتیں فراہم ہونگی اور دینی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام ہوگا ورنہ محض حکومت کے بل بوتے پر یا کسی اور کے سہارے ایسا نظام تعلیم جاری نہیں ہوسکتا جو مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ وہ اس مسئلے پر لوگوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"اب اور کیا تدبیر ہے جس سے مسلمانوں کی بہتری اور بہبودی ہو اور ان میں عمومی تعلیم کا رواج ہوا اور اعلیٰ قسم کے مفید علموں کی خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیاوی بنیاد پر قائم ہے۔ ہر شخص اس کا جواب دے سکے گا کہ ایک ہی تدبیر باقی ہے اور وہ ہے کہ ہم

---

(۱) "سرسید اور علی گڑھ تحریک"، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص ۱۱۰

خود اپنی تعلیم وتربیت پر مستعد وآمادہ ہوں۔''(۱)

سرسیّد نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے ساتھ اہمیت وافادیت کو واضح کیا بلکہ اس کے لئے لائحہ عمل بھی پیش کیا۔ان کی نظر میں تربیت کا بہترین وموثر ذریعہ طلبا کے لئے اقامتی زندگی کا اہتمام اور دارالاقامہ کا قیام ہے۔اس لئے کہ اس نظام کے ذریعہ طلبا کو ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، کھیلنے کودنے اور مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتیں نمایاں کرنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔اقامتی زندگی اختیار کرتے ہوئے ان میں خود عملی طور پر برتنے کا سلیقہ نشو ونما پاتا ہے۔دوسرے باصلاحیت وتجربہ کار اساتذہ کی نگرانی سے مختلف امور میں ان کی تربیت کے مراحل بخوبی انجام تک پہنچتے ہیں۔سرسیّد نے دارالاقامہ یا بورڈنگ ہاؤس کو ایک مشین سے تعبیر کیا ہے جو قوم کے لئے کارآمد افراد تیار کرتی ہے۔انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ طلبا ہی اس مشین کے پرزے ہیں اس لئے اس کی مشین کی بہتر کارکردگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے پرزے ٹھیک ٹھاک چلیں۔

سرسیّد کے نزدیک طلبا کی ترتیب میں اقامتی زندگی کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اسے ایک کتاب سے تعبیر کیا جسے پڑھنا وسمجھنا اور بحفاظت رکھنا اور استعمال میں لانا یا اس سے بھرپور استفادہ کرنا ہی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا اصل مقصد ہے اور بہت واضح انداز میں متنبہ کیا کہ اگر کسی نے اس کتاب سے ناقدری کی تو تعلیم کے میدان میں اس کی ساری تگ ودو کا کچھ حاصل نہ ہوسکے گا اور اس کی زندگی بالکل بے مصرف ہو کر رہ جائے گی۔اس ضمن میں سرسیّد کا خیال ہے کہ :

''اے عزیزو! کالج لائف یائی زندگی یہی اصل کتاب ہے اور
اسی کا پڑھنا اور اس کا سمجھنا اصل فائدہ اور اصل مقصد زندگی کا

---

(۱) مقالات سرسیّد جلد ۸، ص ۱۰۵

اور اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور
اچھی طرح رکھا اور داغدار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی
جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے ورنہ اس کی زندگی اور
موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔"(۱)

اگر سرسیّد نے خود بھی ایم۔ اے۔ او کالج میں اس کتاب کی فراہمی اور اس سے استفادے کے بہتر مواقع موثر کرنے کی بھرپور توجہ دی۔ جہاں انہوں نے ایک جانب اس ادارہ میں ایک جامع نصاب تعلیم جاری کیا اور مختلف مضامین کی تدریس کے لئے ماہر تجربہ کار اساتذہ مقرر کئے۔ جن میں ہندوستانی یورپین عصری علوم کے ماہرین اور مشرقی علوم وفنون کے ترجمان بھی تھے۔ وہیں دوسری جانب دارالاقامہ میں طلبا کی تربیت کا ایک وسیع نظام قائم کیا اور رہن سہن، چال چلن، خوردونوش، لباس و پوشاک، نماز روزہ، کھیل کود ہر معاملہ میں ان کی نگرانی کا بخوبی اہتمام کیا۔ مزید برآں مختلف انجمن کلب وسوسائٹی کے ذریعہ طلبا کو تحریری وتقریری میدان میں اپنی صلاحتیں پروان چڑھانے کے مواقع میسر کئے اور اسطرح ان کے لئے بہت سی ایسی غیر درسی معروضیات جاری کی جن سے ان کی ذہنی وجسمانی مختلف قسم کی صلاحیتوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ لیکن تربیت کے جس پہلو پر سرسیّد نے سب سے زیادہ زور دیا وہ طلبا میں ڈسپلن پیدا کرنا تھا اور انہیں ہر معاملے میں نظم وضبط کا خوگر بنانا تھا سرسیّد کے زمانے میں کالج و بورڈنگ ہاؤس میں تربیت کے اس وسیع نظام کو چلانے کے لئے باقاعدہ ایک پورا عملہ ہوتا ہے جس میں سب سے زیادہ اہم ذمہ داری کالج کے پرنسپل کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مینیجر و نائب مینیجر بورڈنگ ہاؤس اور وارڈن وغیرہ اپنی اپنی سطح پر نگرانی کی خدمت انجام دیتے تھے اور ان سب سے قطع نظر سرسیّد کے قائم کردہ نظام تربیت کا امتیاز یہ تھا کہ طلبا اور کیمپس میں رہائش اختیار کرنے والے

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۶۰-۲۵۹

اساتذہ اس نظام میں شریک رہتے تھے اور اس کے کل پرزے بن کر ایک دوسرے کے تعاون سے ہاسٹل لائف کو اسطرح بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے کہ کالج کے طلبا تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے باب میں بھی مثال بن کر نکلیں اور خود اپنے اور ملک وملت کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔

کالج میں مختلف مضامین کی تدریس اور پرنسپل شپ کے لئے یورپین اساتذہ کی تقرری کا مقصد سرسیّد کو یہ تھا کہ طلبا عصری علوم بالخصوص انگریزی زبان کی بخوبی تحصیل کر سکیں۔ قدیم علوم فنون کو نئے مزاج وآہنگ کے ساتھ سیکھ سکیں۔ ان میں مطالعہ کا ذوق پروان چڑھے اور ان کے اندر اعلیٰ سطح کا ڈسپلن قائم ہو۔ یہ باب عام طور پر بہت ہی مقبول ہے کہ سرسیّد آکسفورڈ اور کیمبرج کے صورت حال سے کافی متاثر تھے اور وہ اپنے کالج میں بھی ان کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہاں پر یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ سرسیّد نے کالج میں ہندوستانی اساتذہ کی بھی تقرری کی اور تدریس و دارالاقامہ کی نگرانی وغیرہ کے لئے مشرقی علوم وفنون کے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کیں۔ ان میں مولوی محمد اکبر، علامہ شبلی، مولانا عبداللہ انصاری اور محسن الملک کے زمانے کے مولانا فراہی قابل ذکر ہیں۔ درحقیقت سرسیّد کالج میں مشرقی ومغربی دونوں روایات کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ ہندوستانی اور یورپین اساتذہ کے باہمی میل جول اور علمی ربط وتعاون سے اس تصور تعلیم کو عملی طور پر موثر بنانے کے خواہاں تھے جس کا سب سے نمایاں پہلو قدیم وجدید کا امتزاج تھا۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ سرسیّد طلبا کی دینی واخلاقی تربیت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس سے کالج کے تربیتی نظام کو ضروری جز تصور کرتے تھے۔ انہوں نے بہت ہی واضح انداز میں اس پہلو پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"طلبا کے اخلاقی و مذہبی خیالات درست رکھنے کی فرائض منصبی

> ادا کرنے کو اس ماحول کے ساتھ ایک یا دو مقدس عالم رکھنا چاہئے۔ جس کا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوتا کہ اس کے فیض و صحبت سے ان کی طبیعتیں ازخود نیکی و دینداری کی طرف مائل ہوں۔''(۱)

اس تصور کے تحت سرسیّد نے کالج میں دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی واخلاقی امور میں طلبا کی نگرانی کا ایک مستقل نظم جاری کیا اور اس اہم کام کے لئے ناظم دینیات کا منصب قائم کیا۔ ناظم دینیات کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ طلبا کی مذہبی واخلاقی زندگی کی پوری باریکی سے نگرانی کریں اور انہیں ایسی سہولیات بہم پہنچائیں کہ وہ کالج کے بعد کی زندگی میں دینی واخلاقی تقاضوں کو بحسن وخوبی پورا کرسکیں اور کالج کے بعد کی زندگی کے لئے اپنے آپ کو ایک بہ اخلاق انسان کی حیثیت سے تیار کرسکیں۔ اس ضمن میں یہ ذکر بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کے عقائد درست رکھنے، ان کو نماز و دوسرے مذہبی فرائض کا پابند بنانے، روزمرہ کی زندگی میں قرآن وسنت پر رہنے، حسن واخلاق وحسن وسیرت سے مزین کرنے اور ان میں دینی جذبہ بیدار کرنے کے لئے سرسیّد نے ناظم دینیات سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ خاص طور سے ارشاد و تلقین وعظ ونصیحت اور پیمائش کا طریقہ اختیار کریں۔ مثال کے طور پر طلبا میں نماز کی پابندی کو کس طرح یقینی بنایا جائے نماز کے وقت حاضری اور غیر حاضری کے ساتھ تادیبی کاروائی کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ :

> ''بہتر ہوگا کہ جو شخص حاضری لیتا ہے وہ ان کے نام سے جو بلا وجہ اکثر جماعت سے غیر حاضر ہوتے ہیں مولوی صاحب کو اطلاع کرے گا اور مولوی صاحب کسی وقت ان کو علیحدہ تخلیہ

---

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۲۵۱

میں بلا کر نصیحت کریں گے اور سمجھا دیں گے کہ نماز پڑھنی اور
جماعت میں شریک ہونا چاہیئے ۔ اگر کچھ نہیں تو اس طریقے
سے شوکت اسلام اور شوکت جماعت مسلمانان ثابت ہوتی ہے۔
غرض کہ اس قسم کی مشفقانہ نصیحتیں بقار آمد ہوں گی۔''(۱)

مزید برآں طلبا کی دینی و اخلاقی سرسیّد احمد خاں نے کالج میں درس قرآن کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ یہ درس کلاس شروع ہونے سے قبل اسٹریچی ہال یا کسی بڑے ہال میں منعقد ہوتا تھا اور تقریباً نصف گھنٹہ جاری رہتا تھا۔ کئی برس تک یہ خدمت علامہ شبلی نے انجام دیا۔ بعد میں کچھ عرصہ تک ناظم دینیات نے بھی یہ خدمات انجام دیں۔ علامہ شبلی کا یہ درس بڑا مفید اور موثر ہوتا تھا اور طلبا بڑی دلچسپی سے اس میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے فرماتے ہیں کہ ان میں قرآن پاک کا ذوق اس زمانے کی یادگار ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اس درس کے بارے میں اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ صبح کے وقت کالج شروع ہونے
سے قبل سب جماعتوں کے طالب علم اسٹریچی ہال یا کسی اور
بڑے ہال میں جمع ہو جاتے اور وہاں پر مولانا شبلی خوش الہانی
سے قرآن پاک کے کسی رکوع کی تلاوت فرماتے تھے اور
ترجمہ کر کے ہم لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ اتنے میں کالج کی گھنٹی ہو
جاتی تھی اور ہم سب اپنی کلاس میں چلے جاتے تھے۔''(۲)

---

(۱) خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۱۷۵
(۲) مشاہدات وتصورات، شیخ محمد عبداللہ، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، ص ۹۷

دینوی علوم کی طرح مسلمانوں کے خالص مذہبی علوم کی حالت بھی حد درجہ خراب تھی قرآن، حدیث اورفقہ کی جو تعلیم دی جاتی تھی وہ بالکل تقلیدی اور مصنوعی تھی قرآن مجید پر فکر کا دروازہ بند تھا جو کچھ طبری، اور بیضاوی نے لکھد یا وہ حرف آخر تھا۔اس سے انحراف دین سے انحراف کے ہم معنی تھا۔احادیث کی مذید جانچ پر کھ بھی ممنوع تھی۔ فقہی احکام نے احوال وظروف زمانے کے مطابق کسی ادنیٰ تبدیلی کا خیال بھی کفر کے مساوی تھا اس طرز فکر کی وجہ سے مذہبی علوم نہایت فرسودہ حالت میں تھی۔صدیوں سے ان میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا اور اس کی وجہ محض پرانی تقلید تھا۔

سرسیّد چاہتے تھے کہ دینوی علوم کی طرح دینی علوم میں بھی تعقل وتفکر کی عادت مسلمانوں میں پیدا ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی جو تفسیر لکھی اسکا واحد مقصد ان کے اُذہان کو تقلید کی بھاری زنجیروں سے آزاد کرنا تھا۔ اپنی تفسیر کے لئے انہوں نے عقل اصول وضع کیا۔وہ یہ تھا کہ ''فیچر ورک آف گاڈ قرآن مجید آف گاڈ'' ۔ Feature work of God Quran Majeed of God اس لئے دونوں میں عدم مطابقت نہیں ہوسکتی یعنی قرآن مجید میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو عقل انسانی اور قوانین فطرت کے خلاف ہو۔نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں تفسیری اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان خدا کی عبادت کے لئے پیدا ہوا خواہ یہ کہو کہ مذہب انسان کے لئے بنایا گیا دونوں حالتوں میں اتنا ضرور ہے کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کہ کوئی چیز ہو کہ وہ اس بار کو اٹھانے کا مکلّف ہو اور انسان میں وہ شئے کیا ہے عقل ہے۔اس لئے ضرورت ہے کہ جو مذہب اس کو دیا جائے وہ عقل انسانی کے مافوق نہ ہو۔اگر وہ عقل انسانی کے مافوق ہے تو انسان اس کا مکلّف نہیں ہوسکتا۔''(۱)

اس میں دورائے نہیں کہ قرآن کی تفسیر میں سرسیّد سے بعض فکری لغزشیں سرزد ہوئی ہیں جو ان کی حد

---

(۱) تہذیب الاخلاق ،سرسیّد نمبر، جلد ۱۷، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۸ء، ص ۵۸

سے بڑھی ہوئی عقلیت کی دلیل ہے ۔انیسویں صدی کے وسط میں عقلیت اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور سارے مغربی دنیا اس کے نشہ میں مخمور تھی۔اہل علم بڑی سے بڑی بات کو بھی عقل کے میزان میں تولے بغیر تسلیم نہیں کرتے تھے۔اس عقلیت کا اثر سرسیّد کے ذہن پر بھی تھا اور اسی لئے ان کی تفسیر میں اعتدال کا رنگ غالب ہے لیکن ان کی تفسیری لغزشوں سے قطع نظر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کی تفسیر نے اہل علم مسلمانوں کے منجمد ذہنوں کو متحرک کیا اور کورانہ تقلید کے بندھن کچھ ڈھیلے ہوئے اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔سرسیّد دینی اور دنیاوی علوم کی تفریق کے شدید مخالف تھے کیونکہ اس تقسیم سے دونوں طرح کے علوم مخلصین کے اخلاق کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

دنیاوی علوم کے فارغین کے اخلاق اس وجہ سے خراب ہوتے ہیں کہ وہ مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں جو انسان کے اندر نیک جذبات کی پرورش کا ایک بڑا وسیلہ ہے اور دینی علوم کے فارغین کے اخلاق اس وجہ سے فاسد ہو جاتے ہیں کہ ان کو مفید دنیاوی علوم نہیں پڑھائے جاتے جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت ابتر رہتی ہے۔اس معاشی بدحالی سے ان کے خیالات وعزائم پست ہو جاتے ہیں۔اس وجہ سے سرسیّد نے مدرستہ العلوم کے بنیادی اغراض میں مذہبی تعلیم کو بھی داخل کیا تھا اور نہایت ولولہ انگیز اسلوب میں اس خیال کا اظہار کیا ہے :

''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس ہمارے
بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔''(۱)

اوپر کی تمام تفصیلات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سرسیّد احمد خاں ایک بلند، وسیع و جامع تصور تعلیم کے داعی وعلمبردار تھے۔اس کا سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ تعلیم کو ایک عظیم مقصد کے ساتھ جوڑا گیا اور وہ ہے انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر اور سماجی و ثقافتی ترقی۔

---

(۱) تہذیب الاخلاق، سرسیّد نمبر، جلد ۱۷، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۸ء، ص ۵۸

دوسرے یہ کہ اس کے تحت تعلیم کے دائرہ کو کافی وسعت دی گئی۔ سرسیّد کی نظر میں صرف جدید علوم کی تحصیل تعلیم کی معراج نہیں ہے اور نہ ہی قدیم درسیات ونصاب سے علیحدہ رہنا تعلیم کا ماحصل ہے۔ تعلیم کے مقاصد کے بنیادی اصول کے لئے سرسیّد نے دونوں ہی قسم کے تعلیم کو ضروری تصور کیا لیکن اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور مسلمانوں کی سماجی بدحالی کے پیش نظر جدید تعلیم کے فروغ کو خاص اہمیت دی اور زمانے کے تقاضے اور معاشرہ کے ضروریات کے تحت انہوں نے قدیم علوم کے مضامین کو بھی نئے طرز و جدید اسلوب کے مطابق پڑھانے پر زور دیا۔ اس طرح سرسیّد کے نزدیک سماجی وثقافتی ترقی اور معاشرہ میں عزت ووقعت کا مقام حاصل کرنے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ درس وتدریس کا اہتمام کیا جائے اور جدید علوم فنون یا بی۔ اے وایم۔ اے کی کی ڈگری کے حصول کی سہولتیں فراہم کی جائیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ انہیں ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے، بات چیت، باہمی سلوک وتعلقات اور مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ سکھایا جائے بالفاظ دیگر جو کچھ انہوں نے استادوں سے یا کتابوں کے ذریعہ علم حاصل کیا اسے زندگی میں برتنے کی عملی مشق کرائی جائے۔ سرسیّد کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح تھا۔ تعلیم وتربیت کے موضوع پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے انہوں نے صاف صاف لفظوں میں یہ فرمایا:

> ''اے عزیز و اگر تعلیم کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس تعلیم سے قوم قوم نہ بنے وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں۔ پس انگریزی پڑھ لینا اور بی۔ اے، ایم۔ اے ہو جانا جب تک اس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فلنگ نہ ہو تو قوم کو قوم اور ایک معزز قوم نہیں بنا سکتے۔ اسلام نے اس قومیت کے بدلے جو

نسل یا ملک کے سبب گنی جاتی تھی اسلامی قومیت قائم کی ہے
جس نے کلمہ پڑھا خواہ وہ چین کا ہو یا جاپان کا، عرب کا رہنے
والا ہو یا ہندوستان کا سب آپس میں بھائی بھائی اور مسلمان
ہیں اور ایک قوم اسلام...... پس ہم کو اس بات کی فکر ہے کہ
ہماری قوم قوم نہ بنے اور معزز قوم ۔''(۱)

---

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۶۱۔۳۶۰

اردو دوست اشخاص کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

سرسیّد احمد خاں ایک بلند پایہ مفکر، مصلح اور جامع تصور تعلیم کے مبلغ اور علمبردار تھے۔ وہ حصول علم کو عبادت کا درجہ دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ہندوستانی عوام بطور خاص مسلمانوں کو جن صورت حال کا سامنا تھا سرسیّد اس کے عینی شاہد تھے ان کی دورس نگاہوں نے اس کا مداوا عصری تعلیم کے حصول اور انگریزی حکومت سے مفاہمت کی صورت میں تلاش لیا تھا۔ اور ان مقاصد کی تکمیل کے لیے عملی اقدام کی صورت میں انہوں نے علی گڑھ میں مدرستہ العلوم قائم کیا۔ یہی وہ ادارہ ہے جو ترقی کر کے آج علی گڑھ مسلم یونیوسٹی کے نام سے معروف ہے۔ اور اس عظیم الشان ادارے کی ایک درخشاں شاخ شعبۂ اردو روشنی کے منارہ کی مانند اپنی ضیا پاشی سے تشنگان علم کو سیراب کرنے میں مصروف کار ہے۔ اس شعبہ نے متعدد ایسی شخصیتیں پیدا کیں جنہوں نے سرسیّد کی تعلیمی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہمہ تن کوششیں کیں۔ سرسیّد کی تعلیمی تصورات کا دائرہ خاص وسیع ہے۔ غالباً اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اراکین شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ''سرسیّد احمد خاں کا نظریۂ تعلیم و تربیت'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ تیار کرانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس اہم کام کے لیے مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کو منتخب کر کے یہ ذمہ داری سپرد کی کہ یہ مقالہ استادِ گرامی پروفیسر محمد زاہد کی نگرانی میں مکمل کروں۔

''سرسیّد احمد خاں کا نظریۂ تعلیم و تربیت'' یہ وہ موضوع ہے جس پر اب تک بے شمار مضامین اور مقالات منظر عام پر آ چکے ہیں۔ سرسیّد اور ان کی خدمات کے سلسلہ میں مولانا الطاف حسین حالی (حیات جاوید) ، خلیق احمد نظامی (سرسیّد اور علی گڑھ تحریک)، نورالحسن انقوی (سرسیّد اور ہندوستانی مسلمان)، ثریا حسین (سرسیّد اور ان کا عہد) اور اختر الواسع (سرسیّد کی تعلیمی تحریک) کی اہم کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا متذکرہ بالا تصانیف جو اس مقالے کی تکمیل میں معاون ثابت ہوئی ہیں۔ استاد محترم پروفیسر اصغر عباس، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرنا باعث سعادت سمجھتا ہوں جنھوں

نے ''سرسیّد کی صحافت'' کے موضوع پر گراں قدر تحقیقی کام انجام دیا ہے۔اس مقالے کی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر ہندوستان اور پاکستان سے اس کے اب تک متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔میں نے اپنے تحقیقی کام کی تکمیل میں اس غیر معمولی تصنیف سے کسب نور کیا ہے۔سرسیّد کے نظریۂ تعلیم پر اب تک کوئی باضابطہ تحقیقی مقالہ نہیں لکھا جاسکا ہے۔برصغیر ہند و پاک میں سرسیّد اور ان کی تعلیمی نظریات و افکار پر غور وفکر کرنے والوں اور اپنے نظریات و افکار کو مضامین اور مقالات کی صورت دینے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے۔ان علماء اور دانشوروں کی موجودگی میں ایک طالب علم کے لیے اس موضوع پر تحقیقی کام انجام دینا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف تھا۔لیکن میں مشکور ہوں اپنے نگراں پروفیسر محمد زاہد کا کہ انہوں نے میری ہمت افزائی کی اور ان کے مشورہ سے میں نے ہر ممکن ذرائع سے مقررہ موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی کا سلسلہ شروع کر دیا۔باوجود یہ کہ موضوع سے متعلق مواد کی فراہمی میں گونا گوں مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ اس آزمائش سے عہدہ برآں ہونے کا شرف حاصل ہوسکا ہے۔توقع ہے کہ علمی اور ادبی حلقوں بالخصوص سرسیّد کی شخصیت، ان کے افکار ونظریات سے شغف رکھنے والوں میں یہ طالب علمانہ کوشش قابل اعتنا سمجھا جائے گا۔

''سرسیّد احمد خاں کا نظریہ تعلیم وتربیت'' کا مطالعہ کرنے کے لیے یہ امر ضروری سمجھا گیا کہ اس وقت یعنی انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورت حال کا اجمالی جائزہ لیا جائے تاکہ یہ بات واضح ہوسکے کہ سرسیّد نے کن حالات اور واقعات سے متاثر ہوکر اپنے نظریۂ تعلیم کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔سرسیّد کا نظریۂ تعلیم وتربیت پر کام کرتے وقت یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی گئی کہ مقررہ موضوع کا دائرہ خاصا وسیع ہے چنانچہ اس موضوع کے ساتھ انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کے ایک ایک پہلو پر تفصیل سے اظہار خیال کیا جائے۔اس سہولت کی خاطر مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

مقالہ کا پہلا باب ''انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورت حال'' پر مشتمل ہے۔اس

باب میں یورپ اور ایشیاء کی تہذیبی ،تمدنی ، سیاسی ، معاشی اور معاشرتی صورت حال پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور اس وقت کی تعلیمی صورت حال کا بھی قدرے تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالہ کا دوسرا باب ''انیسویں صدی کا نظام تعلیم'' کے عنوان پر مشتمل ہے۔اس باب کی وسعت اور اہمیت کے پیش نظر اس کو دو ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اس عہد میں سرکاری اسکولوں ، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اور دوسرے حصے میں نیم سرکاری اور غیر سرکاری یعنی دینی مدارس و مکاتیب کے تعلیمی طریقہ کار پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ہم عصر غیر سرکاری اسکولوں میں مروجہ تعلیمی صورت حال پر بھی بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں رائج الوقت تعلیمی نظام سے متعلق انگریز حکام کے نظریات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اس مقالے کا تیسرا باب ''سرسیّد کا تصور تعلیم و تربیت'' خصوصی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے تحت سرسیّد کے تعلیمی نظریات پر گفتگو کرنے سے قبل اس عہد کی سیاسی ، معاشی ، معاشرتی ، تمدنی اور تعلیمی صورت حال پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی سورش کے بعد سرسیّد کو جن حالات اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے سدِ باب کے لیے انہوں نے انگلستان کا سفر کیا اور قیام انگلستان کے دوران وہ جن چیزوں سے متاثر ہوئے اور اس ضمن میں انہوں نے جو علمی اقدام کیے ان کی روشنی میں ان کے تعلیمی تصورات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اپنی تعلیمی تحریک کے تحت انہوں نے ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی جس نے ۱۸۷۷ء میں ایم۔اے۔او۔کالج کی شکل اختیار کر لی اور یہی ادارہ ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہوا۔ سرسیّد نے اپنے ادارہ میں تعلیم کا جو طریقہ کار اختیار کیا اس پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سرسیّد کے تعلیمی نظریات کے ساتھ ساتھ ان کا نظریہ تربیت کو بھی بہت واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

مقالہ کا چوتھا باب ''سرسیّد احمد خاں کے اہم تعلیمی اقدام'' پر منحصر ہے اس باب کو پانچ

ضمنی حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔سائنٹفک سوسائٹی

۲۔تہذیب الاخلاق

۳۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ

۴۔مدرستہ العلوم/محمڈن اینگلواورینٹل کالج

۵۔ایجوکیشنل کانفرنس

سرسیّد کے ذہن میں ان اداروں کے قیام کے درپردہ جو مقاصد اور منصوبے تھے اس پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

مقالے کے پانچویں باب میں ''سرسیّد اور سیکولرزم'' کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ سرسیّد صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ غیر مسلموں کے لیے بھی یکساں تصور تعلیم رکھتے تھے اور ان کا دروازہ دونوں قوموں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا تھا جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا گریجویٹ ایک غیر مسلم (ایشوری پرساد) تھے۔سرسیّد نے دونوں قوموں کے درمیان حائل خلیج کو اپنے حسن تدبیر سے پاٹنے کی ہر ممکن کوشش کی۔وہ ہندوستان کو ایک ملک اور یہاں کے باشندوں کو ایک قوم خیال کرتے تھے۔

مقالے کے آخر میں ''کتابیات'' کی فہرست دی گئی ہے جس کے تحت ان کتابوں، رسائل وجرائد کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے جو اس مقالے کی تکمیل میں معاون اور مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

امید ہے کہ یہ طالب علمانہ کوشش سرسیّد کے نظریہ تعلیم وتربیت کو نئے انداز اور نئے زاویہ سے سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی اور ان کے نظریہ تعلیم کے متعلق بعض نئے گوشے بھی منظر عام پر آسکیں گے۔

میں اپنے استاد مکرم پروفیسر محمد زاہد کا بے حد مشکور وممنون ہوں جنھوں نے تحقیقی کام کے زمانے میں

میری قدم قدم پر رہنمائی کی۔ مجھے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر استاد محترم کی شفقت، محبت اور نظرِ عنایت شامل حال نہ ہوتی تو یہ مقالہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ اس سلسلے میں صدر شعبۂ اردو پروفیسر قیصر جہاں صاحبہ کا بہت ممنون ہوں جنہوں نے مشکل وقت میں اپنی قیمتی آرا سے سرفراز کیا اور بے پناہ شفقت اور محبت سے میری ہمت افزائی کی۔ علاوہ ازیں شعبۂ اردو کے اپنے تمام اساتذہ کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے تحقیقی کام کے دوران میری حوصلہ افزائی کی اور قیمتی مشوروں سے مستفیض کیا۔

ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر میں ڈاکٹر حافظ محمد الیاس لکچرر شعبہ نفسیات 'Psychology' اور ڈاکٹر محمد مقیم ریڈر شعبہ فلسفہ 'Philosphy' کا ذکر خیر نہ کروں جنہوں نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور انہی کی مساعی جمیلہ سے اس تحقیقی مقالے کی کمپوزنگ کا مرحلہ بآسانی طے ہوسکا ہے۔ اپنے دوستوں بالخصوص ڈاکٹر محمد علیم الدین، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر محمد موصوف، محمد ناصر علی، قمر عالم، صدر عالم، علی عمران عثمانی، فخر عالم، محمد اکرم خاں، محمد مونس، محمد اکرام الحق، جلال الدین اور فتح عالم کا شکریہ ادا کرنا واجب سمجھتا ہوں جنہوں نے میرے ساتھ ہمدردی، محبت اور دوستی کے رشتے کو ہمہ وقت روا رکھا۔

مولانا آزاد لائبریری میں صیغہ اردو کے اراکین محترم باقر علی خاں، محمد باقر حسین، محمد محسن جعفری، اور شعبۂ اردو کی سمینار انچارج محترمہ رابعہ سہیل میرے شکریے کے خاص طور سے مستحق ہیں جنہوں نے مواد کی فراہمی میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور حتی الامکان میری مدد فرمائی۔

آخر میں اس مقالے کے کمپوزیٹر میرے دوست محمد اشرف کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے مقالے کی کمپوزنگ میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

شمیم الدین

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۰؍ مئی ۲۰۰۴ء

بابِ اوّل

انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورتِ حال

انسان قدرتی طور پر مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ مدنی کے معنی ہیں شہر یا بستی بسا کر رہنے والا۔ انسان جان کی حفاظت اور باہمی امداد کی خاطر سماج میں رہنے کے خواہش مند ہوتا ہے اور اسی طرح وسیع وعریض معاشرہ تیار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ چھوٹے چھوٹے الگ الگ بستیوں میں رہتے ہیں وہ دیہاتی کہلاتے ہیں اور جو لوگ قصبوں اور شہروں میں رہتے ہیں شہری کہلاتے ہیں۔ انسانوں کی بنیادی ضروریات زندگی روٹی، کپڑا اور مکان ہیں۔ سر چھپانے کے لیے مناسب مکان، زندگی قائم رکھنے کے لئے موزوں صحت بخش غذا اور موسم کے مطابق جسم ڈھکنے کے لئے لباس کی ضرورت ہوتی ہے۔ معاشرہ کا اقتصادی اور اخلاق معیار جتنا بلند ہوگا افراد کی کارگزاریاں اسی اعتبار سے بارآور ہوں گی اور سوسائٹی میں خوشحالی آئے گی اور ساتھ ہی علم ودانش کو فروغ ملے گا۔

جب تہذیب وتمدن کا ذکر آتا ہے تو انسان کے ذہن میں ایک طرح کا تصور پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسان اپنی زندگی میں غذائی، رہائشی اور ستر پوشی کے معاملے میں بہتر سے بہتر بنانے کی مسلسل جدوجہد کرتا ہے اور زندگی کو آرام وسکون سے گزارنے کے لئے کیسے کیسے جتن کرنے پڑتے ہیں انہیں اعلیٰ تہذیبی ارتقاء سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ اس ضمن میں مذہبی افکار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ ہندوستان کی دو بڑے مذاہب کے پیروکار ہندو اور مسلمان کے باہمی میل جول سے جو معاشرہ وجود میں آیا اس پر اسلام اور ویددھرم کی چھاپ نمایاں ہیں۔ ہندوستان میں سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد نے بھی تہذیب وتمدن میں گل کاریاں

کی ہیں۔انیسویں صدی کے تہذیب وتمدن کے حالات اسی پس منظر میں زیر بحث آئیں گے۔

نظام قدرت میں تنازع البقا کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے قدرتی عناصر وحشی جانور، کیڑے مکوڑے جسمانی اذیت کا سبب بنتے رہتے ہیں مگر انسان نے اپنے فہم و دانش سے ان مخدوش طاقتوں کو زیر کر کے محفوظ راستے اختیار کئے ہیں اور اشرف المخلوقات کے خطاب کی لاج رکھی ہے۔ ہر قوم اور قبیلے نے اپنے ماحول کے لحاظ سے زندگی کے نظام کو ترتیب دیا ہے۔ اسی نظام زندگی کو عملی اصطلاح میں تہذیب وتمدن کہتے ہیں۔ یہ نظام جتنا پروان چڑھتا ہے اتنا ہی متعلقہ قوم کا درجہ بنی نوع انسان میں بلند ہو جاتا ہے۔تہذیب وتمدن ارتقا میں دانشور اور ارباب اقتدار کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اور مناسب قوانین اور ضابطوں پر عمل درآمد صاحبِ اقتدار لوگ ہی کرا سکتے ہیں۔عوام مقتدا لوگوں کی پیروی میں ہی اپنی سلامتی اور خیر و برکت سمجھتے ہیں۔

انیسویں صدی میں متضاد انقلاب یورپ اور ایشیاء میں برپا ہوئے ۔ یورپ نے انیسویں صدی تک بے پناہ علمی وفنی ترقی کی اور مشرقی یعنی ایشیائی ملکوں پر سیاسی ومعاشی زوال کے بادل چھا گئے ۔ پہلے ہم یورپ کے بارے میں تفصیلی تبصرہ کریں گے کیونکہ مشرقی ملک جیسے ہندوستان وغیرہ میں مغربی قوموں کی دست اندازی سے بڑے دوررس نتائج سامنے آئے۔

یورپ میں پندرہویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب کے بعد مغربی اقوام نے زندگی کے ہر میدان میں تیز رفتاری کے ساتھ قدم بڑھائے جو تاریخ میں بے مثال ہیں۔انیسویں صدی کے آتے آتے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، اسپین اور پرتگال وغیرہ دنیا کے سر برآوردہ ملک بن گئے ۔ جہاز رانی میں مہارت کی وجہ سے ان ملکوں نے ہزاروں میل دور ایشیائی اور افریقہ ممالک سے رابطہ قائم کرلیا۔ یہ رابطہ دو طرح سے فائدہ مند ثابت ہوا۔ایک تو یہ کہ مغربی ملکوں کی مشینی مصنوعات کو مشرقی ملکوں میں خاطر خواہ منافع پر فروخت کیا گیا۔ نیز مشرقی علاقوں سے

کچا مال ارزاں قیمت پر دستیاب ہوا۔جس کی وجہ سے یورپ والوں کے کارخانے دن دونی ترقی کرتے رہے اور مصنوعات کی بکری سے کارخانوں کے مالک مالا مال ہو گئے ساتھ ہی کارخانوں کے مزدوروں کو بے کاری کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑا۔(1)

کچے مال آسانی سے حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک نے نو آبادیوں کی شروعات کی۔اصطلاح میں نو آبادی اس علاقہ کو کہتے ہیں جہاں پر کوئی استبدادی طاقت اپنے ملک سے باہر حاکمانہ تسلط قائم کر لیتی ہے اور اس آبادی کے سپید وسیاہ کی مالک بن جاتی ہے۔

مشرقی ممالک میں نو آبادی کو قائم کرنے کا سلسلہ انہی مغربی ملکوں کو راس آیا جن کا جہازی بیڑا طاقت ور تھا۔ظاہر ہے کہ اپنے ملک سے دو ہزار میل کے فاصلے پر کسی خطے پر تسلط بحری قوت حاصل کئے بغیر دشوار تھا۔اگر چہ اکثر وبیشتر یوروپی قوموں نے علیحدہ علیحدہ نو آبادیاں قائم کیں لیکن انگلینڈ کو اس معاملے میں سب سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ہندوستان (بنگلہ دیش، پاکستان) لنکا، (برما) وغیرہ برٹش نو آبادیوں میں شمار کئے جانے لگے۔ بلکہ کناڈا، آسٹریلیا جیسے دور دراز وسیع علاقے پر یونین جیک (انگلینڈ کا جھنڈا) لہراتا تھا اور ان ملکوں کی حالت بھی نیم غلام ملکوں جیسی تھی جو برطانوی سامراج کا ایک حصہ کہلاتے تھے۔

انیسویں صدی میں مشرقی ممالک جیسے ہندوستان، برما، لنکا وغیرہ کی سیاسی اور اقتصادی حالت بدتر ہونے لگی تھی اگر چہ ہزاروں سال سے ہندوستان، ایران، چین شاندار تہذیب و تمدن کے مالک تھے اور ان تہذیب کا اثر ساری دنیا پر دیکھا جا سکتا تھا۔

بارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی تبدیلی واقع ہوئی۔مسلمانوں کی حکومت ۱۱۹۳ء میں دہلی پر قائم ہوگئی۔محمد غوری دلی کی حکومت اپنے

---

(1) Nehru Jawaharlal, "The glimpses of world history", New Delhi, 1996, P-430.

غلام قطب الدین ایبک کو سپرد کر کے اپنے وطن واپس چلا گیا اس طرح دلی پر پٹھانوں کی حکومت تقریباً تین سو تیس برس تک قائم رہی اس کے بعد ظہیر الدین محمد بابر ایک ترک قبیلے کا سردار دلی کی حکومت کو ابراہیم لودی سے چھین کر یہاں کا بادشاہ بن گیا۔ مغل خاندان نے ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت کی ۔ مغل خاندان میں سب سے زیادہ پسندیدہ، ہوشمند اور شاندار بادشاہ اکبر ہوا۔ جس نے تقریباً ساٹھ سال تک حکومت کی ۔ اگر چہ کچھ عرصے کے لئے شیر شاہ سوری، ہمایوں کے بعد دہلی کے تخت پر قابض رہا۔ مگر شیر شاہ کے کالنجر کی لڑائی میں مارے جانے سے دلی کا تخت پھر مغلوں کے قصبے میں آ گیا ۔ اور جلال الدین محمد اکبر، نور الدین جہانگیر اور شہاب الدین عرف شاہ جہاں تک بڑی شان شوکت سے حکومت چلی ۔ اورنگ زیب نے ۱۶۵۶ء میں اپنے والد شاہ جہاں کو قید کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اورنگ زیب کٹر مذہب پرست تھا اس لئے اس نے بعض ایسے قانون نافذ کئے جن سے ہندو رعایا ناخوش ہوگئی ان میں ایک جزیہ ٹیکس بھی تھا۔ یہ قانون ہندوؤں کو اس لئے ناگوار گزرا کہ وہ صرف ہندوؤں پر لگایا گیا تھا۔ ہندو مسلم باہمی رواداری کی جو روایت اکبر سے لیکر شاہ جہاں تک تھی وہ باقی نہ رہی ۔(۱) اکبر نے راجپوت جیسی بہادر اور خوددار قوم کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ راجپوت رانیاں محلوں کی رونق بن گئیں ۔ اور مذہبی تفریق بڑی حد تک حکومت کے راستہ میں حائل نہیں ہوئی ۔

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی ۔ اس کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ زوال کی متعدد وجوہات تھے ۔ بعض مورخین کے علاوہ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اورنگ زیب کو اس صورت حال کا ذمہ دار مانا ہے ۔(۲) کیونکہ اورنگ زیب اور اس کے مذہبی کٹر پن کو مورد الزام اس لئے ٹھہرایا گیا کہ انہوں نے غیر اسلامی رسمیں جو شاہ جہاں کے عہد تک

---

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India" P-27

(2) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", P-243.

حکومت کے کاروبار میں رائج تھیں ان کو اورنگ زیب نے ناپسندیدہ قرار دے دیا۔ اس طرح ہندوؤں کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بادشاہ ہندو مذہب کا مخالف ہے۔ جب کہ اکبر سے لے کر شاہ جہاں تک اس طرح کی بدگمانیوں کے آثار نمایاں نہیں تھے۔ جواہر لال نہرو نے بھی اپنی بایوگرافی جس کا ترجمہ ''میری کہانی'' کے نام سے اردو زبان میں کیا ہے لکھا ہے کہ اورنگ زیب کے جزیہ ٹیکس لگانے سے ہندو عوام نہایت برافروختہ ہوئے۔(۲) ہمارے خیال میں جزیہ ٹیکس کے علاوہ اور بھی متعدد اسباب تھے۔ ہندوستان کے متعصب تاریخ نویسوں نے اورنگ زیب کو ظالم اور کٹر مذہب پرست مسلمان بادشاہ کہہ کر کچھ زیادہ بدنام کیا ہے حالانکہ اس نے بہت سے مندروں کو جائدادیں بھی دی تھیں۔

ے ہمیں لے دے کر ساری داستان میں یاد ہے اتنا
کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

میرے غم خانے کی جب حالت رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے

مغل سلطنت کو بربادی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے تقریباً ایک سو پچاس سال لگے ان ڈیڑھ سو سال میں آخری ایک تہائی عرصہ انیسویں صدی پر مشتمل ہے جس میں شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی دور حکومت تھی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کو بغاوت کا ملزم ٹھہرایا اور انہیں تخت سے برطرف کر کے رنگون کے قید خانوں میں مقید کر دیا تھا۔ جہاں چند سال بعد ان کی وفات ہوگئی اور وہیں سپرد خاک کر دیئے گئے۔ اسی مضمون کا ایک نہایت دلگداز شعر ظفر بھی خود کہہ چکے تھے:

(2) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", P-271.

؎ ''کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں''

بہادر شاہ کا آخری دور بڑا دردناک تھا۔محلوں میں اور محلوں سے باہر آئے دن جاں نثاروں اور شہزادوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ ہر طرف چھوٹے سے لے کر بڑے تک بے اطمینانی اور پریشانی کے شکار تھے۔ سلطنت کے اراکین کو بھی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔دوسرے لوگ اس صورتِ حال سے اتنے متاثر نہیں تھے جتنے کہ دلی کے رہنے والے چھوٹے بڑے امیر فقیر اور صاحب حیثیت لوگ چراغ پا تھے۔دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے جتنا قتل عام دلی اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں کیا اس کی مثال تاریخ میں نہیں مل سکتی۔لاشیں جگہ جگہ بکھری پڑی تھیں۔دفن کی کوئی صورت نہیں تھی۔مردہ خور جانور لاشوں کو کھینچتے پھرتے تھے۔درختوں پر رسیاں باندھ کر ہزاروں لوگوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ان درختوں پر لٹکی لاشوں کو کوّے اور گدھ مدتوں تک اپنی خوارک بناتے رہے۔ دلی والے یا تو گھروں میں جان بچائے چھپے بیٹھے رہے یا پھر دلی چھوڑ کر بھاگ گئے۔انگریزوں کی طرف سے ان پر بے شمار ظلم کئے جاتے تھے ان کو ننگا کر کے ان کے پوشیدہ مقام کو پھندا ڈال کر رسی سے کھینچا جاتا۔ بے ہوش ہو جانے پر انہیں غلاظت سے بھرے ناند میں پھینک دیا جاتا۔ پوس اور ماگھ کی سردی میں انہیں ٹھنڈے پانی کے اندر غوطہ لگوایا جاتا۔جیل کے اندر بند قیدیوں کو اوڑھنے کے لئے صرف ایک کمبل اور کھانے کو ایک چپاتی دی جاتی۔وہ بھی کسی کو ملتی اور کسی کو نہیں ان کو کولہو میں بیل کی جگہ جوتا جاتا تھا۔اس تباہی کا نقشہ جوش ملیح آبادیؔ نے اپنی مشہور نظم ''سوداگروں سے خطاب''میں یوں کھینچا ہے :

کس زباں سے کہہ رہی ہو آج اے سوداگرو

دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو

لوٹتے پھرتے تھے تم جب کارواں در کارواں

سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں

تیسرے فاقے پہ اک گرتے ہوئے کو تھامنے

کس کا سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے''

انیسویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے استحکام کی وجہ سے ہندوستان میں کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ اس میں تہذیب وتمدن کے صحیح وسالم رہ جانے کا کوئی امکان نہیں تھا عام لوگوں کی زندگی آلام ومصائب کا شکار ہو چکی تھی۔ جان بچانے کے علاوہ روٹی کپڑا اور مکان کا خیال کرنا فضول تھا مسلمانوں کا جاگیردار طبقہ جو تہذیب وتمدن کا دعوے دار بھی تھا اور عمل پیرا بھی۔ اس طبقہ کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی کیونکہ اس طبقہ کی خوشحالی حکومت کی خوشحالی سے وابستہ تھی۔ جب حکومت ہی حال سے بے حال ہوگئی تو جاگیردار اور منصب دار بھی خود بہ خود تباہی کا شکار ہو گئے اور جہاں سر چھپانے اور جان بچانے کا موقع ملا وہاں پہنچ گئے۔ اس طرح معاشرے میں انتشار اور افراتفری پھیل گئی۔

مسلم تہذیب وتمدن کے سلسلے میں نہرو نے اپنی بایوگرافی میں لکھا ہے کہ شمالی ہندوستان میں صرف ایک مٹھی بھر متوسط طبقے کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ جن پر ایرانی زبان اور ایرانی روایات کا اثر ہے۔ اور عوام پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی تمدن، کی نشانی بظاہر یہ ہے کہ ایک خاص قسم کا پاجامہ جو نہ زیادہ لانبا ہو اور نہ زیادہ اونچا، ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کی تراش خراش اور داڑھی کا رکھنا، اور ایک لوٹا جس میں ایک خاص قسم کی ٹونٹی ہوتی ہے۔ اور عورتوں کا برقعہ مسلم

تہذیب وتمدن کی پہچان تھے۔اس کے برخلاف ہندوؤں میں دھوتی پہننے کا،سر پر چوٹیا رکھنے کا، اور ذرا مختلف قسم کا لوٹا رکھنے کا رواج ہے۔(۱)ہندومسلم مشترکہ تہذیب و تمدن نے ہندومسلمانوں کوقریب تو کیامگرشیر وشکر کی طرح گھل مل جانے کی نوبت نہیں آئی۔ مذہبی عقیدے اس کی راہ میں حائل ہوئے۔ ہندوستان میں ہندو معاشرہ اور مسلم معاشرہ عام طور پر مذہبی اثرات کے تحت کسی قدر محدود انداز میں تشکیل پاتا رہا۔مگر درمیانی طبقے کا کلچر جاگیردارنہ اور منصب دارانہ تھالہٰذاتہذیب وتمدن دونوں قوموں میں ایک ہی انداز سے پروان چڑھا۔

یہاں یہ واضح کردینا ضروری ہوتا ہے کہ جاگیردارنہ کلچر انیسویں صدی تک ہندوستان میں باقی تھا جب کہ یورپ میں جاگیرداری نظام اٹھارہویں صدی تک دم توڑ چکا تھااورسرمایہ دارانہ نظام نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ بڑے بڑے کارخانے والے دولت مند ہو گئے اوران سرمایہ داروں نے اپنی کاروبار کی بدولت سیاسی اقتصادی اور معاشی صورت حال کو اتنا متاثر کیا کہ حکومت انہی سرمایہ داروں کے اشاروں پر چلتی رہی۔کارل مارکس (۱۸۱۷ء ۔ ۱۸۸۳ء) نے سرمایہ داری نظام کے خلاف آواز بلند کیا اور داس کیپیٹل (Das Capital) کتاب لکھ کر سیاسی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔کارل مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف عام ذہنوں کو تیار کیا۔ڈاکٹرمحمد اقبال نے کارل مارکس کے فلسفہ سے متاثر ہوکرلکھا تھا :

''نیست پیغمبرو لے دارد کتاب (وہ پیغمبر نہیں مگر صاحب کتاب ہے) جواہرلال نہرو نے مارکس کے بارے میں کہا کہ ''وہ اجتماعی امور میں گہری بصیرت رکھتا تھا''۔(۲)

انیسویں صدی میں مارکس کی تعلیم کو لینن جیسے دلیر اور دیدہ ور انسان نے اتنا پروان چڑھایا کہ مارکس کا نظریہ کمیونزم کی شکل میں سرمایہ داری کے خلاف ایک عالمگیر تحریک کے طور پر

---

(۱) جواہرلال نہرو، ''میری کہانی'' حصہ دوم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۳۳۵

(۲) ''میری کہانی حصہ دوم'' جواہرلال نہرو، ص ۵۲۶۔

سامنے آیا۔ اس طرح زمینداری نظام اور ساہوکاری نظام کو نبی نوع انسان کے لئے لعنت سمجھا گیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر اقتصادی، تعلیمی، تمدنی، سیاسی، معاشی تمام میدانوں میں بربادی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ سارا تہذیبی اور تمدنی ڈھانچہ درہم برہم ہوگیا تھا اور ہر چھوٹے بڑے کی جان و مال اور عزت کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس لئے وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ تہذیبی اور کلچرل قدریں کتنی الٹ پلٹ گئیں تھیں۔ اس صورت حال میں ایک تہذیبی کرن اردو زبان کی شکل میں پھیل رہی تھی۔ اس زبان کی ترقی کا سارا راستہ فورٹ ولیم کالج کے بعد ہی شروع ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں ۱۸۰۱ء میں قائم ہوا اور بہت بڑا نثری سرمایہ اس کالج کے قیام کے بعد ہی اردو زبان میں فراہم ہونا شروع ہوا۔ یوں کہئے کہ اردو اسی دور میں علمی زبان کی صورت میں پروان چڑھی۔ سر سیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء نے اردو کو دنیا کی بڑی زبانوں کی صف میں لاکر بیٹھا دیا جو آگے چل کر سرکاری زبان کے درجے تک جا پہنچی۔

ثقافتی ارتقاء کا یہ ایک تاریخی کارنامہ ہے کہ اردو زبان اتنے تھوڑے عرصہ میں ایک معمولی پودے سے بڑھ کر تناور درخت بن گئی۔ ایسی مثال دنیا کے کسی حصے میں نہیں ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اردو کا رشتہ برج بھاشا سے استوار کیا اس کی تائید میں مولانا محمد حسین فرماتے ہیں کہ:

> ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردہ پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو اس کی

عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا
وطن ہے۔''(۱)

اور مسعود حسین خان کی جدید تحقیق کے مطابق اردو دلی اور اس کے گردونواح میں بولی جانے والی زبان جسے ہم اور آپ کھڑی بولی کے نام سے جانتے ہیں، یہی اردو کی بنیادی شکل ہے جو ایک ہندوستانی زبان ہے اور اس کا تعلق کسی غیر ملکی زبان سے نہیں ہے۔ فارسی اور کچھ عربی کے الفاظ کثیر تعداد میں اس لئے اردو میں شامل ہو گئے کہ فارسی ایک سرکاری زبان تھی اور اردو کو فروغ دینے والے بھی فارسی کے دلدادہ تھے۔ اور اردو زبان کی پیدائش کے سلسلے میں پروفیسر شیروانی نے اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''میں نے بعض تاریخی مفروضات کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی
کوشش کی ہے کہ کھڑی اور ہریانوی پنجابی مسلمانوں کے
داخلۂ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔''(۲)

فورٹ ولیم کالج میں اردو کو جو ترویج اور ترقی حاصل ہوئی اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اردو ایک عوامی زبان ہے اور عام لوگ اس کو آسانی سے پڑھ لیں گے اور سمجھ سکیں گے۔ فورٹ ولیم کالج میں انگریز افسران کو عام لوگوں کی زبان سمجھنے کے لئے جو طریقہ اپنایا گیا اس کا بنیادی مقصد غیر ملکی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکن کو اردو زبان کی تعلیم دینا تھا تا کہ عوام سے رابطہ قائم کرنے میں اس زبان کا سہارا لینے میں آسانی ہو۔ مگر بعض سیاسی مقاصد کے لئے دو زبانیں یعنی اردو اور ہندی علیحدہ علیحدہ بن گئیں۔ ناگری رسم الخط میں ہندی کو جو اس وقت اردو سے کوئی علیحدہ زبان نہ تھی سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے بوجھل کر دیا گیا اسی طرح فارسی رسم الخط میں لکھی جانے

---

(۱) پنجاب میں اردو حافظ محمود خاں شروانی، اپکار پریس لکھنؤ، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۵۴۔۵۵
(۱) مقدمہ تاریخ زبان اردو، مسعود حسین خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۹ء، ص ۲۰۱

والی سادہ زبان کو فارسی اورعربی الفاظ سے سجایا گیا۔اس سلسلے میں کچھ کام اردو مصنفوں نے کیا جنہوں نے اپنا سکہ جمانے کے لئے اردو کو سادگی کے راستے سے ہٹا کر گنجلک راہوں پر ڈال دیا۔ ''فسانہ عجائب'' اور ''باغ و بہار'' کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے چنانچہ اس کی مثالیں ان دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔سر سیّد جن کو اردو کا سب سے بڑا محسن قرار دیا جاتا ہے انہوں نے بھی خاص طور پر سادہ زبان کے استعمال پر زور دیا۔مولانا الطاف حسین حالؔی نے اپنی مشہور تصنیف ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں اس بات پر زور دیا ہے کہ زبان عام فہم اور سادہ ہونا چاہئے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر کے بعد اردو کا مقام اتنا بلند ہو گیا کہ اس نے عوام اور خواص میں اتنی مقبولیت حاصل کر لی کہ لوگ فارسی جیسی زبان پر اردو کو ترجیح دینے لگے۔فارسی تعلیم و تدریس کا رجحان دن بہ دن کم ہوتا چلا گیا۔یہاں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی نے اردو زبان کا اتنا بڑا تحفہ ہندوستان کو دیا جس کی مثال نہ پہلے تھی اور نہ ہی آئندہ امکان ہے۔مگر حقیقت یہی ہے کہ اردو جو ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی تابناک مثال ہے جو ایک دلکش بھاشا ہے۔

ے ''اردو زبان گلشن ہندوستان کی ہے
ہمدم وہیں رہے گی یہ مٹی جہاں کی ہے'' (ادیب کانگجوی)

مشترکہ تہذیب و تمدن کا تصور کہیں نہیں ملتا ہے وہ ہر صاحب نظر کے لئے اردو کی صورت میں موجود ہے۔ہندوستان نے انیسویں صدی میں دنیا کو دو غیر معمولی تحفے دیئے ایک اردو زبان اور دوسرا عدم تشدد کا نظریہ۔ان پر محبّ وطن ہندوستانی جتنا فخر کریں کم ہے۔

تہذیب و تمدن کے فروغ خاص طور پر تعلیمی، سیاسی اور اقتصادی حالات کو بڑا دخل ہوتا ہے۔جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انیسویں

صدی تک تعلیم کا انتظام سرکاری طور پر کم ہی تھا۔ لوگ اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لئے معلم کا انتظام خود کرتے تھے اور گھریلو مکتب قائم کرتے تھے۔(۱) سرکاری طور پر دو ایسے ادارے وجود میں آئے ایک دلی کالج اور دوسرا فورٹ ولیم کالج۔ جہاں پر تعلیم وتربیت کا انتظام تھا حالانکہ فورٹ ولیم کالج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارکنوں کو دیسی زبان سکھائی جاتی تھی۔ یہاں اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دلی کالج البتہ اس وقت کی مروج اعلیٰ تعلیم مہیہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ ملک کے کئی نامور لوگ یہاں سے تعلیم پا کر نکلے اور جنہوں نے تعلیم کی روشنی وسیع پیمانے پر پھیلائی۔ مرزا غالب کو اس کالج میں بطور فارسی کا استاد رکھنے کا ارادہ تھا مگر ان کی انانیت کی وجہ سے پورا نہیں ہوا۔ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر کے ہندوستان میں عام لوگوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام ان کے والدین پر منحصر رہتا تھا۔ بڑے زمیندار اور منصب دار اپنے بچوں کے لئے جو تعلیم کا اہتمام کرتے تھے وہ بڑے لوگوں کے بچوں تک محدود تھے۔ جاگیرداروں اور منصب داروں پر جب زوال آیا اور وہ اقتصادی طور پر بدحال ہو گئے تو گھریلو مکتب بھی برائے نام رہ گئے۔ تعلیم کی یہ کمی مسلمانوں پر زیادہ اثر انداز ہوئی اور سرسیّد احمد خاں نے اسی کمی کو محسوس کر کے اپنی تحریک کا آغاز کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ روایتی تعلیم سے اب خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے انگریزی تعلیم قطعاً ضروری ہے۔ اگرچہ عام مسلمانوں اور بعض علما نے انگریزی تعلیم کی بے حد مخالفت کی اور سرسیّد کو اپنے مقصد کے حاصل کرنے میں ناقابل برداشت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے جو بات دل میں ٹھان لی تھی اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔ یہاں تک کہ سب سے پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام سے جو فائدے حاصل ہوئے اس کا احساس لوگوں کو بہت بعد میں ہوا۔

---

(۱) حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، لاہوتی پرنٹ ایڈز جامع مسجد نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۲۳۰

(۹) انگریزی تعلیم کے ذریعہ ان علوم تک دسترس ہوئی جو سوائے انگریزی زبان کے کسی اور زبان میں نہیں تھے۔ نئی سائنسی ترقی نے جو دروازے کھولے اور نئی نئی ایجادات کا فائدہ بنی نوع انسان کو نظر آیا، اس کے حاصل کرنے کا راستہ صرف انگریزی تعلیم کی معرفت ممکن تھا۔ جیسے جیسے تعلیم کا شوق لوگوں میں پیدا ہوا ہر طبقے کے لوگ انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے پھر بھی مسلمانوں کی توجہ انگریزی تعلیم کی طرف ہندوؤں کے مقابلے میں دیر سے ہوئی اور وہ تعلیمی میدان میں ان سے تقریباً پچاس سال پیچھے رہ گئے اور اسی بات کا خمیازہ وہ اب تک بھگت رہے ہیں۔ (۱۰) برٹش حکومت نے بھی سر سیّد کی اس کوشش میں بہت معاونت کی اور لندن کے علمی حلقوں میں بے حد تعریف کی گئی۔ اعلیٰ احکام میں سر سیّد کی آو بھگت زیادہ سے زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ان کو 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا یہ خطاب انگریزوں کو بھی اعلیٰ خدمات کے لئے برٹش حکومت طرف سے عطا کیا جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں مسلمانوں میں عام طور سے تین طبقے ظہور پذیر تھے۔ ایک اعلیٰ طبقہ جس میں بڑے بڑے رؤسا اور منصب دار لوگ تھے جو راجہ یا نواب کہلاتے تھے جن کو بڑی بڑی جائدادیں ملی ہوئی تھیں ان جائدادوں سے بڑی معقول آمدنی ہوئی تھی اور عیش و آرام سے زندگی گزرتی تھی۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کی وجہ سے ایسے نوابوں اور راجاؤں کا مستقبل بھی دیرپا نظر نہیں آرہا تھا لیکن تہذیب وتمدن کا معیار صرف اسی طبقے میں برقرار تھا اور عام لوگ بھی اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ دوسرا طبقہ جو نچلے طبقے کے زمینداروں اور تعلقہ داروں کا تھا، وہ لوگ دیہات میں بھی رہتے تھے اور شہری آبادی میں مقیم تھے یہ وہ لوگ تھے جو چھوٹی چھوٹی جائدادوں کے مالک تھے لیکن اپنی زندگی کسی قدر آرام اور شان وشوکت سے گزارتے تھے۔ اس طبقے کی آمدنی کسانوں کی پیداوار میں سے ایک مقررہ رقم وصول کر کے حاصل ہوتی

تھی ان کے رہن سہن کا معیار اگر چہ اعلیٰ طبقے کے برابر بلند نہیں تھا پھر بھی جہاں تک ممکن تھا۔ یہ اپنے آپ کو نچلے طبقے سے بلند و برتر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ زمین کا لگان پیداوار کی نسبت سے کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریب آدمی زیادہ غریب اور زمیندار طبقہ زیادہ خوشحال تھا۔ آمدنی کی اس تفریق سے کسانوں کے بچے تعلیم سے محروم رہتے تھے اور زمینداروں کے بچے تعلیم پا کر سرکاری عہدے حاصل کر لیتے تھے۔ سرکاری عہدے دار زمینداروں سے بھی زیادہ مغرور تھے۔ اور عوام کو گری ہوئی نظر سے دیکھتے تھے۔ اقتصادی نا برابری، معاشی اور سماجی معاملات میں ابتری پیدا کرنے کے بنیادی اسباب یہی تھے۔ ظلم اور ناانصافی قدم قدم پر نظر آ رہی تھی۔ ایسے حالات میں تہذیب وتمدن کا ڈھانچہ چور چور ہو جانا ناممکن نہ تھا۔ جہاں تہذیب وتمدن کے کچھ آثار باقی تھے وہ بھی اقتصادی بدحالی کی وجہ سے کھوکھلے اور نمائش ہی رہ گئے۔ صرف خوشی اور غم کی تقریبات پر یا تہواروں پر ایسی رسوم ادا ہوتی تھیں۔ جن پر تہذیب وتمدن کی چھاپ ہوتی تھی۔

انیسویں صدی کی دو مشہور شخصیتیں جو علمی، اخلاقی اور سماجی اصلاح کے لئے آگے بڑھیں وہ راجہ رام موہن رائے ہندوؤں میں اور سر سیّد احمد خاں مسلمانوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوئے۔ راجہ رام موہن رائے بنگال کے رہنے والے تھے وہ سنسکرت، فارسی، عربی اور انگریزی کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے بنگال میں سماجی اصلاح کا کام کیا۔ ستی کا رواج جس میں ہندو عورت اپنے خاوند کے ساتھ چتا میں جل جاتی تھی اس کو بند کرایا اور قانونی طور پر جرم تسلیم کرا دیا اور بہت سی جاہلانہ رسمیں جو ہندو سماج میں تھیں ان کو ختم کرانے کے لئے تحریک چلائی لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے جگہ جگہ اسکول کھلوائے۔ ہندو مسلمانوں میں مذہبی کٹر پن کو مٹانے کی کوشش کی اور کہا کہ ہندو مذہب اور اسلام مذہب میں ٹکراؤ کی کوئی بات نہیں ہے

اور اس کے لئے برہمہ سماج کا مذہب ایجاد کیا جو زیادہ دن تک نہیں چلا۔(۱) اگر چہ رابندر ناتھ ٹیگور بھی برہمہ سماج میں یقین رکھتے تھے۔

مسلمانوں میں سر سیّد احمد خاں نے کچھ اس طرح کا اصلاحی کام کیا اور بیجا رسمیں جو مسلم معاشرے میں پھیلی ہوئی تھیں ان پر روک لگانے کی کوشش کی۔ وہ بھی راجہ رام موہن کی طرح اس خیال کے حامی تھے کہ بغیر انگریزی تعلیم حاصل کئے اور سائنسی علوم کو فروغ دیئے بغیر مسلم معاشرے کی فلاح و بہبود ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے انہوں نے جا بجا اسکول کھلوائے اور علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کرائے۔ سائنٹفک سوسائٹی بنائی جس کے ممبر پڑھے لکھے اور تہذیب یافتہ ہندو مسلمان دونوں قوم کے لوگ تھے۔ انہوں نے ساری زندگی اس بات پر صرف کردی کہ لوگ انگریزی زبان اور انگریزوں کی عادت اور خصلت پیدا کریں۔ تب ہی مسلمان دنیا کی دوسری قوموں کی برابری کر سکتے ہیں۔ اس کام میں ان کو بڑی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ساتھی اکثر ان کے راستے کا روڑا بن جاتے تھے۔ علماء میں سے چند ایک نے ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا۔ کچھ لوگ ان کو کرسٹان بھی کہنے لگے تھے۔ پھر بھی سر سیّد اپنے ارادے پر اٹل رہے اور مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کا کام مرتے دم تک کرتے رہے۔ آخر کار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے اتنی بڑی درسگاہ اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔(۱)

اب ہم اس طبقے کا ذکر کریں گے جو کہ تعداد میں بہت بڑا تھا لیکن حالات کو دیکھتے ہوئے سب سے زیادہ پستی اور مفلسی کی حالت میں تھا۔ یہ طبقہ دو طرح کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ایک وہ جو کھیتی کرتے تھے اور جن کی تعداد کل آبادی کے تین چوتھائی کے برابر تھی۔ دوسرے طبقے میں وہ لوگ آتے تھے جو نہ زمین رکھتے تھے اور نہ کوئی خاص ہنر ان کے ہاتھ میں تھا یہ لوگ مزدور کہلاتے

---

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", Fifth, eded. Calcutta, 1986, P-320.

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India", P243.

تھے جو کھیتوں میں کسانوں کی مدد کرتے تھے اور بدلے میں جنس یا نقد کی صورت میں مزدوری ملتی تھی ۔ انیسویں صدی میں عوام کی حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ دیہات میں زندگی کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے دیہاتی آبادی خوشحال تھی مگر انگریزوں کے ہاتھوں میں دیوانی وغیرہ آ جانے سے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارندوں کے ہاتھوں اندھادھند لوٹ مار ہونے کی وجہ سے یہاں کے کسان اور مزدور زیادہ تر ننگے بھوکے رہنے لگے۔ بنگال، بہار، اتر پردیش، راجستھان اور مدھیہ پردیش میں بار بار قحط کی بلا نازل ہوئی۔ جن میں لاکھوں لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں اور حکومت بالکل تماشائی نبی دیکھتی رہی۔ سارے ہندوستان میں پنجاب ایک ایسا علاقہ تھا جو کسی قدر خوشحال تھا اس کی وجہ تھی کہ پنجاب کے سکھ اور جاٹ بڑے محنتی ہوتے تھے اور اپنے کھیتوں سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کر لیتے تھے نیز قدرتی طور پر پنجاب میں پانچ بڑے دریا ستلج، ویاس، راوی، چناب، جھیلم اور سندھ علاقے کو سیراب کرتے تھے اور قحط کی صورت میں پانی کی کوئی قلت نہیں تھی۔ دریاؤں سے نکلی نہروں سے آبپاشی جاری رہتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پنجاب تک ایسٹ ایڈیا کمپنی کا کوئی اثر ورسوخ نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اس کا زیادہ تر کاروبار سمندر کے ساحلی علاقوں میں بندرگاہوں کے آس پاس ہی پھیلے ہوئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی تجارتی اور سیاسی کوشش شہر بمبئی، مدراس اور کلکتہ پریسیڈینسی تک محدود رکھی ۔ اس طرح جو کچھ بھی لوٹ مار ہوئی وہ انہیں علاقوں تک محدود رہی جہاں تک کلکتہ، بمبئی اور مدراس پرسیڈنسی کے اثر ورسوخ تھے۔

کسانوں اور مزدوروں کی معاشرتی زندگی ملک میں سب سے زیادہ خراب تھی۔(۱) یہ لوگ جو کچھ کھیتوں میں پیدا کرتے تھے اس کو بیچ کر سرکاری ٹیکس بڑی مشکل سے ادا کر پاتے

---

(۱) میری کہانی، جلد دوم، از جواہر لال نہرو، ص ۳۱۹

تھے۔کسان اپنی پیداوار کا قیمتی حصہ بیچ کر سرکاری ٹیکس اور مہاجنوں کا قرضہ ادا کر پاتے تھے۔وہ خود اور انکے بچے موٹے اناج پر زندگی گزارتے تھے۔ پیٹ بھرنے کے لئے بھرپور غذا اور جسم ڈھانپنے کے لئے ضروری کپڑے بھی نصیب نہیں ہوتے تھے۔خوراک کی کمی کے علاوہ بیماریوں سے بچنے کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ چیچک، ہیضہ اور پلیگ (طاعون) جیسی بیماریاں وبا کی شکل میں ہمیشہ پھیلتی رہتی تھیں اور ہزاروں جانیں ضائع ہوتی تھیں۔وبا سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔صحت عامہ کا محکمہ خاموش تماشائی بنا بیٹھا تھا۔

جہاں پر مذکورہ حالات اس طرح کی ہوں وہاں پر تعلیم کا ذکر بے معنی سا ہے۔دن بھر کی محنت کے بعد پورے خاندان کو دو وقت کی غذا بھی حاصل نہیں ہوتی تھی تو حصول تعلیم کی فرصت کہاں سے آتی۔ اس لئے دیہاتی آبادی علم سے بے بہرہ تھی۔تھوڑی بہت تعلیم مندروں و مسجدوں میں' پنڈت اور مولوی اپنے طور پر مذہبی اثر قائم رکھنے کے لئے جاری رکھتے تھے جو کہ کچھ خاص برادریوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ پنڈت اور مولوی لوگ بھی مذہب کی آڑ میں کسانوں کا استحصال کرتے تھے اور چند مذہبی رسمیں جن کا اصل مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا روزی روٹی کے چکر میں اپنا اُلو سیدھا کرتے رہتے تھے۔اسطرح ہندوستان کا کسان اور مزدور طبقہ دنیا کے سب سے زیادہ غریبوں میں گنا جاتا تھا۔(۱)

اس کے برخلاف اگر ہم یورپ کے معاشرتی نظام پر نظر ڈالیں تو وہاں کا کسان ومزدور طبقہ صنعتی انقلاب کے بعد کافی بیدار ہو چکا تھا اور وہ اپنے حق کے لئے تحریکیں چلاتا رہتا تھا۔ دانش ور بھی کسانوں ومزدوروں کے حمایتی بن کر میدان میں آئے۔کارل مارکس نے'' داس کیپٹیل'' نامی کتاب لکھی۔ (۲) اور اس نے دنیا کو یہ باور کرا دیا کہ دولت کے مساوی تقسیم

---

(۱)''میری کہانی'' جلد دوم از جواہرلال نہرو، ص ۳۱۹

(2) Karl Marx, Das Capital, Moscow, 1974, P.269

ضروری ہے ۔کسانوں اور مزدوروں کے جو حقوق سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے چھین رکھے ہیں ۔ وہ ان کو ملنا چاہیئے ۔لینن جیسا آدمی اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور جان فشانی کی بدولت زارشاہی کا تختہ پلٹ کر حکومت پر قابض ہو گیا۔

یورپی ملکوں میں انیسویں صدی میں جب کسان مزدور طبقہ اتنا بیدار ہو چکا تھا کہ حکومتوں کے سپید وسیاہ میں اس کا ہاتھ رہتا تھا لیکن بالمقابل اس کے دور میں ہندوستان کے کسان مزدور سیاسی بیداری سے محروم علوم فنون سے بیگانہ رہ کر زندگی کے بد سے بدتر حالات سے دوچار تھے۔ دراصل یہ علم سے بے بہرہ چوپایوں کی سی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ اس زبون حالی میں قدرتی مصائب سے زیادہ حکومت اور دانشور طبقے کا ذہنی دیوالیہ پن کا ہاتھ رہا۔ ایسی صورت میں جس قسم کے تہذیب وتمدن کی ہم کو امید کرنا چاہئے وہ چند گنے چنے خوشحال اور صاحب اقتدار لوگوں میں ہی باقی رہ گئی تھی اور ان کی تعداد معمولی تھی اور غریب طبقے میں اس کا عدم وجود نہیں کے برابر تھا۔ چند گنے چنے جاگیرداروں اور نام ونمود منصب داروں کی عیش پرستی جو پانی کے بلبلے کی طرح فنا ہونے والی تھی وہ اس بات کی دلیل تھی کہ اس عیش پرستی میں افلاس زدہ کسانوں اور مزدوروں کے استحصال کا عمل دخل کسی نہ کسی حد تک شامل تھا۔

انیسویں صدی کی تہذیبی وتمدنی صورت حال پر بحث کرنے سے پہلے ان قومی اور بین الاقوامی عناصر پر نظر ڈالنی چاہئے۔ جو انیسویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات پر اثر انداز ہوئے اور جنہوں نے یہاں کے تہذیب وتمدن کو گاہ بہ گاہ متاثر کیا۔ وہ عناصر خاص طور پر تین تھے۔

۱۔ ہندو دھرم یعنی ہندو
۲۔ مذہب اسلام یعنی مسلمان
۳۔ عیسائیت یعنی عیسائی لوگ

ہندو اس ملک میں تقریباً چار ہزار سال سے آباد ہیں جو خود کو آریہ نسل کا کہتے ہیں۔ آریوں کی آمد سے قبل اس ملک میں دراویڑ قوم آباد تھی۔ آریوں کی آمد کے بعد ان کو جنوبی ہندوستان کی طرف چلا جانا پڑا۔ تامل، تیلگو، ملیالم وغیرہ زبانوں کا تعلق دراویڑ لوگوں سے ہے۔ سندھ گھاٹی کی قدیم تہذیب کا سلسلہ ہندوستان کے دراویڑ لوگوں سے ملتا ہے۔(۱)

آریہ لوگ وسط ایشیاء سے مختلف زمانوں میں آتے رہے۔ جو سندھ اور گنگا جمنا کے زرخیز علاقوں میں آباد ہوئے۔ آریوں کی تہذیب ویدک تہذیب کے نام سے موسوم ہے۔ ''وید مقدس'' کتاب آریوں کے دور میں تصنیف ہوئی جن کی تعداد چار ہیں اور وہ اس طرح ہیں۔

۱۔ رِگ وید

۲۔ یجروید

۳۔ اتھروید اور

۴۔ سامیہ وید

رگ وید میں مذہبی باتوں کا ذکر ملتا ہے اور دوسرے ویدوں کے دیگر موضوعات بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندو زیادہ تر ویدوں کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ ویدوں میں مختلف علوم پر بے پناہ معلومات کا خزانہ ہے علمی دنیا کی سب سے پہلی کتابوں میں وید کا شمار ہوتا ہے۔ آریاً تہذیب وتمدن ویدوں کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اس تہذیب کو دنیا کی قدیم تہذیبوں میں گنا جاتا ہے اور ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہندو معاشرے میں مذہبی عقیدہ فکر و خیال پر غالب رہا ہے۔ اور اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ مخالف ہوائیں اور انقلابی واقعات کا کوئی اثر مذہبی عقیدے پر نہیں پڑا۔

اسلام یا مسلمانوں کا سیاسی غلبہ بارہویں صدی عیسوی میں ہوا اگرچہ اسلام کے آغاز

(1) Nehru Jawaharlal, "Discovery of India" , P-72.

سے قبل ہی عرب لوگ تجارتی تعلقات ہندوستان کے ساحل مالا بار کے باشندوں سے قائم کئے ہوئے تھے۔ موپلا نام کا عرب قبیلہ کئی صدیوں سے ساحل مالا بار پر تجارت کے کاروبار سے جڑا ہوا تھا۔ اس قبیلے نے انگریزی حکومت کے زمانے میں اپنے حقوق کے لئے زبردست تحریک چلائی تھی۔ دلی کی حکومت پر قبضہ محمد غوری نے ۱۱۹۳ء میں کیا تھا۔ اس کے بعد ساڑھے چھ سو سال تک مسلمانوں کی حکومت ہندوستان پر رہی۔ ۱۵۲۶ء تک پٹھانوں کے مختلف خاندانوں نے دلی پر راج کیا اور اس کے بعد بابر نے مغل حکومت قائم کی جو ۱۵۲۶ء تک چلی۔ ۱۸۵۷ء میں پہلی جنگ آزادی میں مغلوں کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں مغل دور سنہرا دور مانا جاتا ہے۔ مغلوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے راجپوت جیسی بہادر اور غیرت مند قوم کو اپنا دوست بنالیا اور راجپوت رانیاں محلوں کی رونق بن گئیں۔ اکبر آعظم نے اپنے حسنِ تدبیر سے ہندو معاشرے کا دل جیت لیا۔

ترک اور مغل حکمرانوں نے اپنے ساتھ ایرانی وعربی تہذیب کا تحفہ ہندوستان میں لائے تھے۔ ایران اپنے عروج کے زمانے میں ایشیاء اور فرانس کے مدمقابل تھا اور فارسی زبان کا درجہ ایشیائی زبانوں میں وہی تھا جو کبھی فرنچ کا یورپی زبانوں میں تھا۔ اس لئے ایران میں عربی تہذیب وتمدن کا ایک عرصہ تک ایشیاء میں بول بالا رہا۔ مغلوں کے آخری دور میں اردو زبان کا حیرت انگیز ارتقا ہوا اور وہ دیکھتے دیکھتے سرکاری زبان فارسی پر غالب آ گئی۔ اور انگریزوں کے دور میں شمالی ہندوستان کی سرکاری زبان بھی اردو ہوگئی۔

عام بول چال کے ساتھ ساتھ اردو علمی وادبی زبان کے مقام تک پہنچ گئی اور صرف امیر و وزیر ہی نہیں بلکہ خود بادشاہ سلامت بھی اردو زبان کے دلدادہ ہو گئے اور ظفر تخلص کے ساتھ دنیائے شاعری میں بالخصوص اردو شاعری (غزل گوئی) پیدا کر گئے۔ مرزا غالب اور شیخ محمد

ابراہیم ذوق اردو نثر ونظم بالخصوص اردو غزل گوئی اور قصیدہ نگاری کی بدولت شہرت وعزت کے آسمان پر براجمان ہو گئے۔ ہندو مسلم یکجہتی کی نشانی اردو زبان بلا فرق قوم و مذہب سب کی چہیتی بن گئی۔ اردو غزل کا تقابل دنیا کی مختلف زبانوں کی شاعری سے کرنا بے معنی ہے۔ افسوس ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کا خمیازہ ناکردہ گناہ اس پیاری زبان کو بھگتنا پڑا اور ناعاقبت اندیش اور ہندی کے بااثر لوگوں نے اردو زبان کو دربدر کرنے کی مختلف تدبیریں بنالیں۔

ہندوستانی معاشرہ میں مشترکہ تہذیب وتمدن کی صحیح نمائندگی اگر کوئی زبان کر رہی ہے تو وہ ہمارے خیال میں اردو زبان ہے۔ جس میں مشتمل اسمأ سے قطع نظر سارے افعال ہندی زبان کے ہیں۔ اور جہاں تک ان کا تعلق ہے ان میں بھی بعض دوسری زبانوں کے الفاظ کو خاطر خواہ جگہ ملی ہے گنگا جمنی ہندوستانی تہذیب کو اگر اردو تہذیب کے نام سے پکارا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

ہندو مسلمان قریب قریب ایک ہزار سال سے رہتے چلے آ رہے ہیں پھر بھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ابتدا میں دونوں قریب قریب اجنبی تھے ہندوؤں کا مذہب زبان، رہن سہن کا ڈھنگ اور زندگی کے مختلف طور طریقے ان کے اپنے تھے اور جو صدیوں سے ان کی گھٹی میں پڑے تھے۔ وہ لوگ تعلیم یافتہ اور مہذب تھے۔ مسلمان قومی، ملکی، مذہبی اور معاشرتی اعتبار سے ہندوؤں سے بالکل جدا تھے۔ ہندو مسلمانوں کا باقاعدہ پہلا واسطہ فاتح اور مفتوح کی صورت میں ہوا۔ ہندو اپنی آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں غالب تھے۔ پھر ملک بھی ان کا اپنا تھا مسلمان صرف فوجی طاقت کی وجہ سے حاکم بن گئے تھے۔ لیکن جب دونوں نے سمجھ لیا کہ مل جل کر رہنے کے سوا چارہ نہیں ہے تو فاتح نے اپنا غرور اور مفتوح نے اپنی نفرت پر قابو کر کے بھائی چارے کو فروغ دیا اور ایک دوسرے کی خوشی اور غم کے قریب ہو گئے۔ اجنبی پن دور ہوتا گیا اور بھائی چارے کی فضا پھیل گئی۔ مذہبی کٹر پن کی جگہ رواداری اور مروت نے لے لی اور بیگانے اپنے بن گئے اور

ہمسایوں کی طرح پیار محبت سے زندگی گزارنے لگے۔

جیسا کہ تہذیب وتمدن کے سلسلے میں سرسیّد نے بارہا اپنی تقریر میں کہا ہے کہ ''تمام قوموں نے اور بڑے بڑے دانشمندوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ قومی ترقی قومی تعلیم پر منحصر ہے بس اگر ہم اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں تو قومی تعلیم اور قوم کو علم و ہنر سکھانے کی کوشش کریں''۔(۱) وہ انسان میں تہذیب وتمدن، دوراندیشی پیدا کرنا تعلیم کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے تھے۔ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی سرسیّد کی یہی کوشش رہی کہ ہندوستانیوں میں فروغِ علم ہوا اور وہ اپنی تہذیب وتمدن اور تعلیم کے بل بوتے پر ترقی کی منزلیں طے کریں۔ وہ مسلمانوں کی ابتری دیکھ کر صرف تعلیم ہی کی طرف ان کو رجوع کرنا چاہتے تھے اور ان کا پختہ یقین تھا کہ جب مسلمانوں میں تعلیم عام ہوگی تو وہ خود سیاستِ وقت کی طرف رجوع ہوں گے اور اس وقت وہ صحیح رہنمائی کرنے کے زیادہ موقف ہوں گے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیمی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی تمام میدانوں میں دوسری قوموں کے ہم پلہ ہو جائیں۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ سرسیّد کی زندگی اور کارناموں کے بہت سے پہلو ہیں۔ زندگی کی تمام حاجتوں اور ضرورتوں کا کون سا میدان ایسا نہیں ہے جس میں سرسیّد نے مسلمانوں کی رہنمائی نہ کی ہو۔ سیاست سے لیکر تعلیم، ادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، مذہب حتیٰ کہ روزمرہ کے اخلاقیات تک میں انہوں نے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے۔

مسلمان جو ایرانی تہذیب وتمدن اپنے ساتھ لائے تھے وہ ہندوستانی تہذیب وتمدن سے مختلف تھا۔ ایرانی تہذیب وتمدن کا کارگر اصول یہاں کام آیا اور مسلمانوں میں رہن سہن، رسم و رواج، بات چیت، لباس اور خوراک میں بھی یکسانیت آ گئی۔ غرض حاکم اور محکوم ایک دوسرے کو بھائی بھائی سمجھنے لگے۔

---

(۱) مقالات قومی سیمینار، ایجوکیشنل کانفرنس، مرتبہ ریاض الدین شروانی، سلطان جہاں منزل علی گڑھ ۲۰۰۰ء، ص ۵۸

ہندوستانی معاشرے میں تیسرا عنصر عیسائیوں کا تھا جو تعداد میں بہت کم تھے اور چھ ہزار میل دور سات سمندر پار کے رہنے والے تھے وہ ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی، انگلینڈ کی تجارتی کمپنی تھی جو اکبر کے زمانے سے بغرض تجارت ہندوستان آئے تھے اور شہنشاہ اکبر نے ہندوستان کے مغربی ساحل پر جہاں اب بمبئی ہے وہاں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کمپنی کا نام ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس نے اپنا کاروبار بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں قائم کر لیا تھا اور ان علاقوں میں تجارتی کوٹھیاں بھی تعمیر کروائے۔ اورنگ زیب کے زمانے تک کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا مگر اس کی وفات کے بعد مغل حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور بالآخر ۱۸۵۷ء میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس خاموشی اور چالبازی سے ہوا کہ مغل حکمرانوں کو اس کی بھنک بھی بہت دنوں تک نہیں لگی۔ مغل حکومت کا زوال بتدریج ڈیڑھ سو سال میں ہوا اور اسی دوران انگریزوں نے اپنی چالبازی سے اپنا اثر و رسوخ زندگی کے مختلف شعبوں میں قائم کر لیا جب عوام انگریزوں کی چالبازی سے بہرآور ہوئے تو اس سے بچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بڑی چالاکی سے تجارت کے علاوہ ملک کے سیاسی، معاشی اور مذہبی معاملات میں بھرپور دخل اندازی کے اسباب مہیا کر دیئے تھے۔

ملک کے انتظامی معاملے میں غلبہ اس وقت انگریزوں کا شروع ہو گیا تھا جب بنگال اور بہار کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو ۱۷۶۴ء میں حاصل ہوئی ان علاقوں پر ان کا قبضہ ہو چکا تھا وہاں پر تعلیم و تربیت کا نظام اس طرح قائم کیا جاتا تھا کہ اسکولوں میں پڑھنے والے بچے نہ صرف انگریزی سیکھیں بلکہ عیسائی مذہب کے پیرو بن جائیں۔ ایسے سیکڑوں ابتدائی اسکول، ثانوی اسکول اور کالج قائم کئے گئے جہاں پر انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی تہذیب تمدن کا پرچار ہوتا

تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بڑی تعداد ہندوستان میں ایسے لوگوں کی پیدا ہوگئی تھی کہ جو ہندوستانی تہذیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ مشرقی تعلیم کو بھی بیکار اور بے مصرف سمجھتے تھے۔ بڑی تعداد میں پست اقوام کے لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عیسائیوں کی تعداد بمبئی، مدراس اور آسام وغیرہ میں باقی ملکوں سے زیادہ ہے۔ اس صورت حال سے اعلیٰ خاندان کے لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو اونچی اونچی نوکریاں ملنے لگیں اور اونچے سرکاری عہدوں پر پہنچنے والے ہندوستانی انگریز افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو انگریزی وضع قطع میں ڈھالنے کی کوشش میں لگ گئے۔ اس طرح اس مشترکہ تہذیب وتمدن پر جو ہندو مسلم بھائی چارے سے وجود میں آیا تھا گہری چوٹ پہنچی۔ انگریزی تعلیم کا رواج جیسے جیسے بڑھا لوگوں کے خیالات میں مذہب سے بیزاری پیدا ہوئی۔ یہاں تک کہ بعض لوگ مذہب کو خیرآباد کہنے پر بھی پیش پیش رہنے لگے۔ غرض کہ مشترکہ تہذیب وتمدن مغربی اثرات کی وجہ سے درہم برہم ہوگیا۔

اس سلسلے میں سرسیّد احمد خاں نے غیر متناہی اور بے شمار موضوعات بالخصوص معاشرتی، تعلیمی اور مذہبی موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ دین اسلام اور مذہب کی خدمات میں نمایاں رول بھی ادا کیا، عیسائی مبلغین، مصنفین اور مورخین نے اسلام اور ملت اسلامیہ کے تہذیبی وثقافتی ورثہ اور قرآن وحدیث اور آنحضور ﷺ کو موردِ الزام قرار دیا، آپ نے ان مبلغین ومورخین کے بے سروپا الزامات کے علمی وتحقیقی جوابات دیئے، اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات ملحوظ خاطر رکھا کہ انہوں نے یک طرفہ تمام عیسائی مبلغین ومورخین کو مورد الزام قرار نہیں دیا بلکہ اگر کسی مستشرق نے اسلام کے سلسلے میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے تو آپ نے اس کے علمی صداقت کا جواب بھی دیا ہے۔ سرسیّد کی تحریروں میں دونوں ہی طرح کے خیال رکھنے کا ذکر مورخین نے

کیا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ تمام مخالفتوں اور عداوتوں کے باوجود مذہبی حیثیت سے ہم عیسائیت سے بہت قریب ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسی مذہب والوں کو ہمارا دوست کہا ہے سرسیّد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ :

> ''اور جہاں تک ہم سے ہو سکے ہم انگلش گورنمنٹ کے وفادار ہیں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ عیسائی مذہب کا طرفدار ہوں۔عیسائی مذہب کا جیسا کہ مخالف ہوں بلکہ دشمن ہوں اور جیسی جیسی سخت کتابیں میں نے عیسائی مذہب کے خلاف لکھی ہیں شاید کسی نے لکھی ہوں گی۔گو وہ مذہب کیسا ہو مگر خدا نے اسی مذہب والوں کو ہمارا دوست کہا ہے۔''(۱)

سرسیّد نے مذہب اسلام اور عیسائیت کے مابین حائل ہو جانے والی خلیج کو منقسم کرنے کے لئے توریت وانجیل کی تفسیر بھی لکھی تا کہ دونوں مذاہب کے اختلافات رفع دفع ہو جائیں چنانچہ ''تبین الکلام فی تفسیر التورۃ والانجیل علی ملتہ الاسلام'' کے پہلے مقدمے میں انبیاء کی آمد اور ان کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ انبیا و مرسلین ایک دین صادق کے ساتھ اس دنیا میں مبعوث کئے گئے۔البتہ شریعت جدا جدا تھی مسلمانوں کو تمام سابقہ انبیا و رسل پر ایمان لانا ضروری ہے۔(۱) اس کتاب میں سرسیّد نے جگہ جگہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے حوالے سے وضاحت کی ہے اور انہیں احادیث و آیات کے حوالے سے یہ بھی منکشف کیا کہ ہم مسلمان توریت، زبور صحف انبیاء اور اناجیل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔(۳)

---

(۱) سرسیّد احمد خاں، خطبات سرسیّد، مرتب محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۳ء، ص۴۹

(۲) فکر ونظر، سرسیّد نمبر، اکتوبر ۱۹۹۲ء، لیتھو آفسیٹ، اچل تال جی ٹی روڈ، علی گڑھ، ص۱۷۸

(۳) ایضاً، ص۱۷۸

مذہب عیسائیت اور مذہب اسلام میں قربت پیدا کرنے کے لئے اور اختلافات کے راستے کو بند کرنے کی غرض سے سیر سید نے ایک رسالہ ''احکام طعام اہل کتاب'' کے عنوان سے تصنیف کیا جس میں انہوں نے آیات قرآنی، احادیث نبوی، فقہ اور اقوال مفسرین سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

انیسویں صدی کے آغاز ہی سے مغل سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ پلاسی کی لڑائی میں سراج الدولہ کی شکست ۱۷۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کلائیو کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ سراج الدولہ اگرچہ ہوشیار اور بہادر صوبہ دار تھا مگر اپنے سالے میر جعفر کی دغابازی سے لڑائی میں مارا گیا۔ یہ نواب بنگال کی شکست نہیں تھی بلکہ مغلیہ سلطنت کی شکست تھی۔ اس لئے شاہ عالم نے نواب اودھ سعادت علی خاں کو کلائیو کی سرکوبی کے لئے بنگال بھیجا اور ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر نواب اودھ کی شکست ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ عالم کو انگریزوں سے مجبوراً صلح کرنی پڑی اور مغل سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوگئی اور دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے کے لئے انگریزوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ شاہ عالم نے بہار اور بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپرد کر دیئے۔ اس کے بدلے میں پچیس لاکھ روپیہ منظور کر دیا۔ مغل سلطنت کا ایک بڑا زرخیز علاقہ جس کی آبادی موجودہ راجستھان، اتر پردیش اور مدھیہ پردیش سے زیادہ تھی رہن رکھ دیا گیا اس بات کو قدرت کا کرشمہ یا قسمت کی ستم ظریفی سمجھئے کہ سات سمندر پار کر کے غیر ملکی تجارت پیشہ چند لاکھ افراد گورے نے مغلیہ سلطنت پر اپنا قبضہ جما لیا اور انہیں اپنی سیاسی بساط کا مہرہ بنا کر اپنی مرضی کے مطابق چلاتے رہے۔

اورنگ زیب نے پچیس سال کی شدید محنت سے سارے جنوبی ہندوستان کو مغل سلطنت کے ماتحت کر لیا تھا۔ اس کی اولاد اس درجہ ناکارہ ثابت ہوئی کہ وہ پچیس لاکھ روپیہ کی حقیر رقم

اپنے بزرگوں کی عزت وثروت کا سودا کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ انجان پردیسی لوگ جو مذہب رنگ ونسل وضع قطع سے بالکل مختلف تھے۔ اپنی تجارتی بساط پر سیاسی داؤ پیچ اسطرح سے کھیلتے رہے کہ ہندوستان کے تمام سیاسی رسومات دیکھاتے چلے گئے۔ وقت نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ سنگ بر آوردہ لوگ جن کو اپنی تہذیب وتمدن، علم وحکمت پر بہت فخر تھا، حیران ہوکر رہ گئے۔ مگر تعجب اس بات کا تھا کہ سارا ہندوستانی معاشرہ جن کے دائرے میں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے انگریزوں کی مکاری اور چالبازی کو سمجھ نہ سکے نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مٹھی بھر انگریز ہمارے ملک پر قابض ہوگئے۔ چند خودغرض لوگوں نے اپنے معمولی عارضی فائدے کے لئے بڑے نقصانات کی طرف توجہ نہ کی اور سونے کی چڑیا صدیوں کے لئے انگریزوں کے قبضے میں آگئی۔ ان مفاد پرست ہندوستانیوں کے عقل وشعور پر علامہ اقبال نے بھی ماتم کیا ہے :

؎ ''جعفر از بنگال وصادق از دکن

ننگِ ملت، ننگ دین، ننگِ وطن''

بادشاہ سلامت کو ظلِ سبحانی سمجھنے کا عقیدہ دل و دماغ پر اسقدر حاوی تھا کہ عوام بادشاہ سلامت کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرنے کے عادی تھے۔ پلاسی اور بکسر کی جنگ کے بعد شاہ عالم کا شاہی اقتدار برائے نام تھا وہ ہر کام کمپنی کے اشارے پر انجام دے رہے تھے انگریزوں کو محکمۂ دیوانی کی سپردگی پر کسی نے کوئی آواز نہیں اٹھائی اور رعایا کمپنی کے کارکنوں کی زیادتی اس لئے برداشت کرتے رہے کہ وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کارکن بادشاہ کی طرف سے معمور کئے گئے ہیں۔ دیوانی قانون میں استمراری بندوبست نافذ کر کے اور بھی جلے پر نمک چھڑکا گیا۔ انگریز زمیندار بنگال بہار میں نیل کی کھیتی کے مالک بن گئے۔(۱)

مثل مشہور ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے اسی طرح وہ ہندوستانی عوام

(1) Nehru Jawaharlal, "Glumpses of Worl History" , P-426.

جنہوں نے انگریز حکام کے ہاتھوں ظلم اور جبرؔ سہے۔ دراصل وہ اتنے ہی قصوروار تھے کہ ان کو حکومت کے معاملے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔ امراء و وزرا جیسا چاہتے تھے کرتے تھے اور ان کی غلطیوں کی سزا بیچاری رعایا برداشت کرتی تھی۔ رعایا میں زیادہ تر آبادی کاشتکاروں کی اور مزدوروں کی تھی یہ لوگ راج کاج کے معاملوں سے ہمیشہ بے خبر تھے اس وقت دیہاتی کسانوں کی آبادی ہندوستان میں تین چوتھائی سے زیادہ تھی اسی لئے آبادی کا بڑا حصہ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا تھا۔

ہندوستان میں ہندو مسلم مشترکہ معاشرے کی بنیاد اس وقت پڑی جب مسلمانوں میں بارہویں صدی عیسوی میں اپنی حکومت ہندوستان میں قائم کی۔ اگرچہ دنیا کے دو بڑے مذہبی فرقے ہند اور مسلمان پہلی مرتبہ یکجا ہوئے اس طرح دنیا کے دو فرقے جن کا تہذیب وتمدن جدا گانہ تھا، ہمسایوں کی طرح رہنے لگے اور ایک دوسرے سے ربط ضبط کا سلسلہ جاری ہو گیا۔

ہندوستان کی دیہاتی آبادی پر حکومت کے ردّ بدل کا کوئی اثر بظاہر دکھائی نہ دیتا تھا۔ کاشتکار لوگ اپنے کاموں میں اتنے منہمک رہتے تھے کہ ان کو یہ پتہ نہ تھا کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے۔ پٹھانوں کا راج کتنے دنوں چلا یا مغل کب دہلی پر بیٹھے ان باتوں سے دیہی آبادی کو کوئی خاص سروکار نہیں تھا۔ کاشتکار چاہے ہندو ہو یا مسلمان دونوں کے روزانہ کے مشغلے یکساں تھے۔ حکومتیں جوار بھاٹا کی طرح آتی جاتی رہیں۔ بادشاہ بدلتے رہے مگر کسان جہاں تھے وہیں رہے۔ کھیتی کی غرض سے کسان کا رشتہ کسی موڑ پر بھی ڈھیلا نہیں ہوا۔ نیکی اور صلح پسندی جو دیہاتی ماحول کی دین ہے کاشتکاری شناخت بن گئی۔ سیاسی فوج بندی سے ان دنوں کا شتکار کا کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ ہمدردی اور مہمان داری میں کاشتکاروں کی برابری دوسرے پیشے والے نہیں کر سکتے تھے۔

تعلیم کی عام کمی کی وجہ سے وہ معاشی ، سیاسی اور اقتصادی میدان میں ہمیشہ سے پسپا ہوتے رہے اگر چہ جنگ آزادی میں مہاتما گاندھی کی رنہمائی میں چلنے والی تحریک میں کاشتکاروں نے جان اور مال کی بڑی قربانی دی پھر بھی قومی آزادی کا فائدہ کاشتکار طبقے کو ضرروت کے مطابق نہیں حاصل ہوا۔ سیاسی رہنما اس حقیقت کوتسلیم تو کرتے رہے مگر غلبہ ہمیشہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں کا ہی رہا۔ اس کی خاص وجہ تعلیم کی کمی تھی وہ اپنے حقوق کوتسلیم کرانے میں ناکام رہے۔ وہ صورت حال جو اوپر بیان کئے گئے ہیں وہ موجودہ دور کے پس منظر کو پیش نظر رکھ کر تحریر کی گئی ہے۔ اگر انیسویں صدی کے کاشتکاری نظام کا تصور کیا جائے تو جو کچھ تاریخ بتاتی ہے وہ یہی ہے کہ کاشتکاروں کی زندگی حیوانوں سے برائے نام ہی بہتر تھی۔ جس طرح صبح آنکھ کھلتے ہی جانور پیٹ بھرنے کی تگ و دو میں لگ جاتے ہیں اور سارا دن اسی فکر میں لگے رہتے ہیں اسی طرح کسان بھی صبح سے شام تک اناج پیدا کرنے کی دھن میں لگ جاتے ہیں۔ بقول جواہر لال نہرو ''دنیا کے افلاس زدہ ملکوں میں ہندوستان کے لوگوں کی حالت بدتر تھی اور انسانی تہذیب وتمدن جاگیردارانہ انداز پر قائم تھا جو بیسویں صدی کے آغاز تک باقی رہا۔''(۱)

یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد جاگیردارانہ تہذیب وتمدن کی جگہ سرمایہ دارانہ تہذیب وتمدن نے لے لیا تھا کیونکہ مغربی ممالک میں جاگیرداری پر سرمایہ درای غالب آچکی تھی اور جاگیردار زیادہ خوشحال ہو گئے تھے۔ مشرقی ملکوں میں اس وقت صنعتی ترقی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ وہ جاگیرداری کے نشے میں چور تھے اور وہ حالات جو مشینوں کے ذریعہ ایجاد ہوئے ان سے صنعتی پیداوار میں بے حد اضافہ ہوا اور دستکاری سے حاصل پیداوار اس کے مقابلے میں برائے نام رہی مثلاً سوتی کپڑا جو کارخانوں میں تیار ہوتا تھا وہ مقدار اور خوبی میں اس سے کہیں بہتر تھا جو

---

(۱)''میری کہانی'' حصہ دوم، جواہر لال نہرو، ص ۱۰۵

ہندوستان میں ہاتھ سے بنا ہوا کپڑا پایا جاتا تھا۔اسی طرح گجرات اور ڈھاکے میں کپڑوں کی جو صنعت تھی اس کو نقصان اٹھانا پڑا۔ چنانچہ مشینوں کے مقابلے میں یہ صنعتیں ختم ہو گئیں یا پھر جان بوجھ کر انگریزوں نے اسے پنپنے نہیں دیا۔اس طرح باہر سے آئے ہوئے تاجر پیشہ لوگ زیادہ طاقت ور اور خوشحال ہو گئے چنانچہ یہ برطانوی سلطنت کا غلبہ ہندوستان میں بڑھتا چلا گیا اور وہ دھیرے دھیرے غلام بنتے چلے گئے۔

انیسویں صدی کا دور برطانیہ کی سلطنت کے لئے مفید ثابت ہوئی اور ایشیائی ملکوں میں نو آبادیاتی نظام اپنے بربریت کے ساتھ قائم رہا۔ ہندوستان ایران اور عرب جیسے قدیم تہذیب یافتہ ملک زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکے اور جدید تہذیب یافتہ مغربی ممالک کی غارت گری کا شکار ہو گئے۔

مغربی علوم کا چرچا ساری دنیا میں ہو گیا۔ انگریزی زبان اور انگریزوں کی عظیم سلطنت جس میں سورج نہیں ڈوبتا تھا اتنے ترقی یافتہ ہو گئے کہ زیادہ تر قومیں ان کی تہذیب وتمدن کو پسند کرنے لگے اور مشرقی تہذیب وتمدن بے جان اور پژمردہ ہو کر رہ گئی۔لہٰذا انیسویں صدی کی ہندوستانی تہذیب وتمدن کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔

بابِ دوم

انیسویں صدی

کا نظام تعلیم

(۱) سرکاری اسکول، کالج، یونیورسٹی

(۲) غیر سرکاری دینی مکاتیب، مدارس

(الف) سرکاری :(اسکول، کالج، یونیورسٹی)

انیسویں صدی کے نظام سے متعلق بہت کم مواد تاریخی کتابوں میں دستیاب ہیں اس نظام تعلیم کی نشونما برطانوی عہد میں ہوئی۔ اس کے میں تعلیم کی باگ ڈور دیسی نظام تعلیم کے تحت تھی لیکن جلد ہی مشنریوں نے مغربی علوم کی تبلیغ اور انگریزی زبان وادب کے متعلق لوگوں میں ایک طرح کا ذوق و جذبہ پیدا کرنا شروع کر دیا۔ سرکاری حکام اور کچھ روشن خیال ہندوستانی جو اس طرح کی تعلیم سے سرفراز ہو چکے تھے اور اس کے قدردان بھی تھے ان کے ساتھ ملکر اس نظام تعلیم کی تبلیغ و اشاعت میں ساتھ ہو گئے۔ جن کی وجہ سے اس نظام تعلیم نے بہت ہی جلد ترقی کر لی۔ سب سے پہلے تو یہی وکٹورین عہد کے انگریز کو اس بات پر مکمل یقین تھا کہ ان کی زبان وادب، اور ان کی تعلیم کے طریقے دنیا بھر میں سب سے بہتر تھے اور یہ ہندوستانیوں کے لئے بہت ہی مناسب ہوگا کہ وہ اس کو ہو بہو اپنا لے۔ دوسرے یہ کہ اس زمانے کے ہندوستانی اپنے اور مغربی تمدن کے تقابل سے کچھ مبہوت ہو گئے تھے اور یہ سمجھنے لگے تھے کہ ملک کے لئے برطانوری نمونوں کی نقل سے اچھی کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ اس نئے نظام تعلیم کے تحت طلبا اور طالبات کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم ہونے کے آثار نظر آرہے تھے۔ جس سے اس نظام تعلیم کی اہمیت اور مقبولیت بہت ہی زیادہ ہوگئی۔

سید نور اللہ بارایٹ لانے اپنی تصنیف ''تاریخ تعلیم ہند'' میں لکھا ہے کہ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں ایسی دیسی تعلیم سے متعلق معلومات کا ماخذ ناکافی ہے

اور نامکمل ہے۔(۱) ہمارے خیال میں جو کچھ معلومات فراہم ہوئیں وہ بھی شک کے دائرے میں رہی ہیں۔ یہ معلومات بھی اس حصہ کی ہیں جہاں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا تسلط تھا اور باقی ملک میں کیا صورت حال تھی اس کی کوئی تاریخی اطلاع نہیں ہے۔ جو معلومات ایسٹ انڈیا کمپنی نے فراہم کی ان کو بھی زیادہ قابل اعتماد نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بات یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اپنے علاقے میں تعلیم کا انتظام کرے اسی کے متعلق ہر وقت کمپنی کے گورنر جنرل کو تعلیم کے بارے میں ہدایتیں دی گئی تھیں۔ لہٰذا گورنر جنرل نے بمبئی، مدراس اور کلکتہ پریسیڈنسی کے حکام کو مقامی آبادی کی تعلیمی صورت حال کے بارے میں جائزہ لینے کے لئے حکم دیا تھا۔اس موقع پر اعلیٰ حکام نے اپنے ماتحتوں کے ذریعہ گھر گھر جا کر بچوں کی تعلیم کا جائزہ لینے کے لئے کہا اور یہ بھی ہدایت دی کہ بچوں کے والدین اور مدارس کے اساتذہ سے مل کر یہ تحقیقات کرائی جائیں کہ کس عمر کے بچے تعلیم پاتے ہیں اور ان کا معیار تعلیم کیا ہے۔

مذکورہ بالا اطلاعات مدارس اور کلکتہ پریسیڈنسی میں کسی قدر صحیح طور پر فراہم ہوئیں، کیونکہ وہاں پر تعلیم یافتہ ذمہ دارانہ لوگوں نے کیا کیا تھا۔لیکن بمبئی پریسڈنسی میں جو کچھ معلومات فراہم کی گئیں وہ بعد میں ناقابل اعتبار پائی گئی۔ بمبئی میں یہ کام کم تعلیم یافتہ نچلے طبقے کے ملازمین کے ہاتھ میں تھا۔

تعلیم کے سلسلے میں کمپنی ۱۸۱۳ء تا ۱۸۵۴ء کے دستاویزوں کے متواتر احکامات ملتے رہتے تھے کہ اپنے علاقے میں بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری کمپنی کی ہوگی اور اخراجات بھی کمپنی کو برداشت کرنے ہونگے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈائرکٹروں نے چارٹر کے مطابق احکامات جاری کر دیئے۔لیکن اخراجات کا بندوبست نہیں کیا۔ کمپنی کے کارکنوں نے مجبوراً ایسے مدرسوں کو کچھ امداد بھی دیئے جن کو مقامی لوگ پہلے سے چلا رہے تھے۔اور کچھ چندہ فراہم کرنے کے اسباب

---

(۱) تاریخ تعلیم ہند، سید نور اللہ، لاہوتی پرنٹ ایڈز، پہاڑی املی جامع مسجد، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۲۲

مہیا کر دیئے تھے۔ اس سلسلے میں زیادہ تر کام مشنری کے ان پادریوں نے کیا جو ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی خاطر آئے تھے۔ اور جنہوں نے جگہ جگہ اسکول کھول کر بظاہر تعلیم کا جال پھیلا دیا تھا۔ دراصل اس کے پردے میں وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ مشن کے ہی لوگوں نے یا تو مقامی اسکولوں میں شرکت کر کے اپنا کام جاری رکھا یا پھر اپنے اسکول کھول لیئے۔ اس طرح سرکاری اسکول تو برائے نام ہی قائم کئے گئے لیکن امدادی اور مشن کے اسکولوں کی تعداد زیادہ تھی۔ شروع میں ایسے اسکول صرف ابتدائی تعلیم کے لئے مخصوص تھے۔ جن میں تعلیم مقامی زبان میں زیادہ اور انگریزی زبان میں صرف اس قدر تھی کہ بچے انگریزی زبان کے ابتدائی حروف تہجی سیکھ لیں اور کسی قدر عیسائی مذہب سے واقف ہو جائیں۔ ایسے اسکولوں کی تعداد اگر چہ بہت زیادہ تھی مگر ان سے خاطر خواہ فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ نیز انگلینڈ سے اس قسم کی ہدایتیں ملتی رہتی تھیں کہ انگریزی زبان اور عیسائیت کی تبلیغ پر زور دیا جائے تا کہ مقامی لوگ انگریزی تعلیم سے مانوس ہو جائیں اور ان کو اپنا خیر خواہ سمجھنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ثانوی اسکول جن میں آٹھویں یا دسویں درجہ کی تعلیم ہوتی تھی زیادہ تر کھولے گئے۔ لیکن اخراجات کی دقت درپیش تھی۔ اس کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ اس طرح کے مشن اسکول بھی چلائے جائیں اور عیسائی مشن کے اخراجات سے مدرسوں کی ضرورت کی تکمیل کی جائے۔ ثانوی اسکولوں کے لئے باصلاحیت استادوں کی ضرورت تھی اور باصلاحیت استاد اس زمانے میں انگریز ہی ہو سکتے تھے۔ جو عیسائی مشنریوں میں سے ہی تلاش کر لئے جاتے تھے وہ لوگ کم خرچ اور بالانشین ہوتے تھے۔ ثانوی اسکولوں کے ساتھ کالج کا بھی قیام عمل میں آیا اور ایسے بڑے ادارے زیادہ تر مدراس اور بمبئی پریسڈنسی میں قائم کئے گئے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ انگلینڈ میں عام تعلیم کی ذمہ داری حکومت کی نہیں تھی

بلکہ پرائیویٹ انجمنیں اور خیراتی ادارے کے ذمہ تھی اور اسی وجہ سے یہ اسکول چیریٹی اسکول کہلاتے تھے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر بھی یہی چاہتے تھے کہ تعلیم کی ذمہ داری ہندوستان میں کمپنی کی نہ ہو مگر پارلیمنٹ کے چارٹر کی رو سے یہ ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی۔ نیز یہ بھی حکم تھا کہ کمپنی اپنے کارخانوں میں پادری رکھے اور ہر جہاز میں پانچ ٹن کا ایک چپلن رکھا جائے۔ کمپنی کو اپنی تمام چھاونیوں اور فیکٹریوں میں اسکول قائم کرنے کی ہدایت بھی دی تھی۔ دراصل کمپنی سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ عام طور سے عیسائی مذہب کی تبلیغ نہ کرے مگر اپنے ہندو ملازمین میں عیسائی مذہب پھیلائے اور کم سے کم عیسائی بچوں اور ہندوستانی بیویوں سے پیدا ہوئے کمپنی کے سپاہیوں کے بچے اور اینگلو انڈین بچوں کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقدس فریضہ سمجھے۔ (۱) انگلینڈ میں چیریٹی اسکول غریب اور یتیم بچوں کے لئے قائم کئے گئے تھے مگر ہندوستان میں کمپنی کے ذریعہ کھولے گئے اسکولوں کا نام بھی چیریٹی اسکول پڑ گیا۔ ابتدا میں خیراتی اسکول پرتگالی زبان میں چلتے تھے کیونکہ کارخانوں میں زیادہ تر ملازم پرتگالی ہوتے تھے مگر جلد ہی یہ خیراتی اسکول انگریزی زبان میں بھی چلائے جانے لگے اور اس کے تعلیمی اخراجات متروکہ جائدادوں عطیوں اور گاہ بہ گاہ کمپنی کی امدادی رقم سے پوری کی جاتی تھی۔ اس طرح کا پہلا اسکول مدراس میں سینٹ میری چیریٹی اسکول (Sent Marry Charity School) تھا اور دوسرا لیڈی کیمبل فیمیل آرفن (Lady Cambel Female Orfan) بمبئی میں قائم کیا گیا۔ یہ اسکول مانی ٹوریل سسٹم سے چلتا تھا۔ اس سسٹم کی نقل بعد میں انگلینڈ میں بھی ہوئی۔ ہندوستان میں اس طرح کا طریقہ قدیم مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں میں رائج تھا۔ اس طریقہ سے اچھی صلاحیت والے بڑے طالب علم چھوٹے درجے کے طالب علموں کو پڑھاتے تھے۔ اور اس طرح استاد کا قیمتی وقت بچ جاتا تھا یہ ایک فخر کی بات تھی کہ اپنے تعلیمی نظام پر گھمنڈ کرنے والے مغربی ماہرین تعلیم کو قدیم مدرسوں میں

---

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص ۵۸

رائج طریقۂ کار کی افادیت کا احساس ہوا۔ اور یہ طریقہ نہ صرف ہندوستان میں کمپنی کے اسکولوں میں رائج کیا گیا تھا بلکہ انگلینڈ کے چیریٹی اسکولوں میں بھی کیا گیا۔

مِشن کے پادریوں نے انہی اسکولوں میں بڑی محنت اور لگن سے کام کیا تاکہ ان پر ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا الزام عائد نہ ہو اور عام لوگوں میں پادریوں کا اثر و رسوخ قائم ہو جائے۔ کمپنی کے ڈائرکٹر بھی یہی چاہتے تھے کہ ان کی نیت پر شک نہ ہو اور تجارت کو نقصان نہ پہنچے ۔اس لئے عیسائیت کی تبلیغ کھلم کھلا نہ ہوئی مگر اسکولوں میں تعلیم کی آڑ میں مِشن کا یہ کام جاری رہا۔

۱۸۵۵ء میں خیراتی اسکولوں کی تعداد دو ہزار آٹھ سو دس اور طلبا کی تعداد ایک لاکھ پچپن ہزار سترہ تھی۔ ثانوی اسکولوں کی تعداد دو سو اکاسی اور طلبا کی تعداد سات ہزار پانچ سو تیں تھی۔ (۱) اسکول جانے والے طلباء کی یہ تعداد اگر چہ زیادہ تھی۔ مگر آبادی کے لحاظ سے چار پانچ فیصد سے زیادہ نہ تھی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مغلیہ سلطنت کا سارا علاقہ برطانوی حکومت کے قبضے میں آ گیا اور تعلیم کا نظام بھی نئے سرے سے جاری ہوا۔ دیہات میں مکتب یا اسکول کھولے گئے قصبوں میں ثانوی اسکول قائم ہوئے۔ بڑے شہروں میں کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئیں جن میں اعلیٰ تعلیم کا اہتمام تھا۔ یونیورسٹیاں زیادہ تر امتحان لیکر ڈگریاں دیتی تھیں۔ مگر تعلیم یونیورسٹی کے ماتحت کالجوں میں دی جاتی تھی۔ ان میں کچھ اقامتی کالج اور یونیورسٹیاں بھی تھیں۔

مکتبوں سے لے کر کالجوں تک زیادہ توجہ انگریزی زبان پر رہی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے حکم نامے کے ذریعہ عوام کو یہ پیغام دیا کہ کسی بھی مذہبی معاملات میں حکومت کو دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، پھر بھی کچھ لوگوں کے دلوں میں شبہات باقی تھے۔ عام طور پر

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نور اللہ، ص ۳۵۱

ہندوستانیوں نے انگریزی تعلیم کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا۔لہٰذا انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان سے نفرت کا جذبہ کافی عرصے تک ہندوؤں میں کسی قدر کم اور مسلمانوں میں زیادہ ہی تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہات بے بنیاد نہ تھے۔سرسیّد اپنی کتاب ''اسباب بغاوت ہند'' میں لکھتے ہیں کہ ''مشنری اسکولوں میں امتحانات مذہبی کتابوں سے لیا جاتا اور جو لڑکا عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتا اس کو انعام ملتا تھا''۔ (۱) ایک دوسری جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ دیہاتی مکتبوں کے قیام کو لوگ سمجھتے تھے کہ یہ مکتب عیسائی بنانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ڈپٹی انسپکٹر آف پولس کو لوگ اس زمانے میں کالا پادری کہتے تھے اور ان کو شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔یہ افسران بھی داخلے کے لئے حاکمانہ انداز اختیار کرتے اور کہتے تھے کہ اسکول میں داخلہ سرکاری حکم کے مطابق لازمی قرار دیا گیا۔ یہ بات اور زیادہ شک پیدا کرتی تھی کہ حکومت اپنے عیسائی مذہب کی تبلیغ میں ایسے حصہ دار ہے جو چند وسیع النظر اہل علم ہندوستانی انگریزی تعلیم کو مفید مانتے تھے،لیکن کٹر مذہبی قسم کے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ انگریزی تعلیم سے بچوں میں عیسائیت سے لگاؤ ہو جائے گا اور کم عمر کے بچے اپنے مذہب سے بیگانہ ہو جائیں گے لیکن کچھ مسلمانوں نے ان اسکولوں کی پڑھائی کے لئے عالموں سے فتوے حاصل کر لئے چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جو اس زمانے کے ہندوستان کے جیّد عالم تھے ان سے بھی فتویٰ مانگا گیا۔مگر شاہ صاحب نے ان اسکولوں میں داخلے کو جائز ٹھہرایا۔ بشرطیکہ وہاں پر کھلم کھلا مذہبی تبلیغ نہیں کی جاتی ہو، اسی شک کو دور کرنے کے لئے سرسیّد کو بھی اپنی زبان اور قلم کا بے پناہ زور صَرف کرنا پڑا۔ان کا یہ ماننا تھا کہ انگریزی زبان اور جدید سائنس کی تعلیم مذہب کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتی اور اس دور میں اس تعلیم کے بغیر کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔

---

(۱) اسباب بغاوت ہند، سرسیّد احمد خاں (جلد دوم)، ترمیم واضافہ، فوق کریمی، محبوب المطابع، برقی پریس دہلی، ۱۹۷۱ء، ص ۶۳

اگرچہ سرسیّد اوران کے رفقاء جدید سائنس کے بڑے پیروکار تھےمگر مشنری اسکولوں میں جو حالات تھے ان سے بدظن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پادریوں کے طریقۂ کار سے بچوں کے اعتقاد میں کمزوری پیدا ہونی لازمی ہے۔ اس لئے ایک خاص تقریر میں انہوں نے مسلمانوں کو تنبیہہ کی اور کہا کہ :

''مسلمانوں کو یہ شرم نہیں آتی کہ مشنری تعلیم گاہوں میں اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں ان کو جوش پیدا نہیں ہوتا اوران کو غیرت نہیں آئی۔'' (۱)

اسی طرح ایک اور تقریر میں انہوں نے کہا کہ :

''میں تم سے سچی بات کہتا ہوں کہ قومی تعلیم اور قومی عزت ہم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک ہم اپنی تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے۔ گورنمنٹ کے قدرت سے خارج ہے کہ وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے۔'' (۲)

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسیّد انگریز اساتذہ اور منتظمین کالج کے طریق کار جو اس وقت رائج تھے اس سے مطمئن نہ تھے۔ مشرقی عقائد اور تہذیب وتمدن کی پامالی کا خطرہ اس زمانے میں ہمیشہ موجود تھا، کیونکہ بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی مغربی تہذیب کے اتنے گرویدہ ہو چکے تھے کہ اپنے مذہب اور کلچر کو بھی بھول گئے تھے۔ ان کی نگاہوں کے سامنے دہلی کالج کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ماسٹر رام چندر اور ڈاکٹر چمن لال اور مولوی کریم الدین (مصنف واقعات ہند) کے بھائی عمادالدین نے اپنے مذہب کو بدل لیا تھا اور عیسائی ہو گئے تھے۔ اس

(۱) ''اسباب بغاوت ہند'' سرسیّد احمد خاں (دوسرا ایڈیشن)، ص ۶۴

(۲) ایضاً ص ۶۳

واقع کا اثر سر سیّد کے دل ودماغ پر بہت ہوا۔ سر سیّد یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں قرآن کریم اور دوسرے ہاتھ میں جدید فلسفہ وسائنس اور سر پر کلمہ طیبہ کا تاج ہو۔ چنانچہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام اسی مقصد کے تحت رکھا گیا تھا۔ دینی تعلیم اور نماز کے لئے بھی ضروری تاکید کی گئی اور جدید علوم فنون کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام کیا گیا۔ اقامت گاہوں (ہاسٹلوں) میں رہنے والے طلبا کے لئے سارے انتظامات کئے گئے ۔ ہالوں اور ہاسٹلوں میں مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ لباس اور بودوباش کے قاعدے بنائے گئے تاکہ طلبا مشرقی تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ مذہبی اصولوں پر بھی عمل پیرا ہوں۔

انیسویں صدی سے قبل بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے اثر ورسوخ والے علاقے میں تعلیم کی طرف توجہ کی تھی۔ کلکتہ مدرسہ اور بنارس سنسکرت کالج اٹھارہویں صدی عیسوی میں قائم ہو چکے تھے۔(۱) مگر نظام تعلیم جدید کالجوں سے مختلف تھا۔ فرسودہ مضامین غیر معیاری استاد پڑھاتے تھے ۔ یونیورسٹی ایکٹ ۱۸۵۷ء کے مطابق تین یونیورسٹیاں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں قائم ہوئیں۔ ان تینوں میں تعلیمی طریقے اور دیگر انتظامات کیمبرج اور آکسفورڈ (لندن) یونیورسٹی کے طرز پر تھے۔ لیکن وہاں کے قواعد وضوابط پر خاطر خواہ عمل نہیں ہو سکا۔ یہ تینوں الحاق یونیورسٹیاں تھیں جو صرف امتحان لے کر ڈگری دیتی تھیں اور تعلیم ان یونیورسٹیوں سے ملحقہ کالجوں میں دی جاتی تھیں۔(۲) پیشہ وارانہ تعلیم کے ڈپلوما لائسنسی دیئے جاتے تھے۔ یونیورسٹیاں اعزازی ڈگری ایل۔ ایل۔ بی دینے کی مجاز تھیں۔ ان یونیورسٹیوں سے ملحق کالج (Affiliated) تھے۔ جہاں اعلیٰ تعلیم کا اہتمام تھا۔ ان کالجوں میں کچھ سرکاری کالج تھے اور کچھ وہ کالج بھی تھے جن کو مقامی کمیٹیاں چلاتی تھیں ان کالجوں کو سرکار سے مدد ملتی تھی۔ دو یونیورسٹیاں

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ بارایٹ لا، ص۲۲۰

(۲) ایضاً، ص۲۲۰

مذہبی بنیاد پر قائم کی گئیں۔ شمالی مغربی صوبے میں دو کالجوں میں ایک لکھنو کا کنگ کالج اور دوسرا علی گڑھ کا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج تھا۔ بعد کو یہ یونیورسٹیاں بن گئے۔ مدراس کے تین کالج تھے۔ پچا یپا کالج اور وزیانگرم اورٹن نیولی کے ہندو کالج۔ اینگلو اورینٹل کالج کے بانی سرسیّد احمد خاں تھے۔ پچا یپا کالج ایک ہندو رئیس پچئی اپّا کے ورثے سے کار خیر کے سرمائے سے بنا تھا اور وزیانگرم کالج پہلے ۱۸۵۷ء میں ہز ہائی نس مہاراجہ آف وزیانگرم کے بنائے ہوئے ایک اسکول کی حیثیت سے قائم ہوا تھا۔ اورٹن نیولی کالج کی بنیاد ۱۸۶۱ء میں پڑی تھی۔ ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ڈگریاں بھی دوسری سرکاری اور غیر سرکاری یونیورسٹیوں کے مساوی مانی جاتی تھیں۔ ان کالجوں کے پرنسپل عام طور سے یورپین ہی ہوا کرتے تھے۔

انگلینڈ میں ملکہ وکٹوریہ کا عہد جو ۱۸۵۴ء سے ۱۹۰۲ء تک رہا وہ اپنی ہمہ گیر ترقی کیوجہ سے سنہرا دور کہلاتا ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں بہت سے ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کے باغیوں کو عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔(۱) اور تعلیمی نظام میں اصلاح کی گئی۔ ۱۸۸۲ء میں لاہور میں پنجاب یونیورسٹی قائم ہوئی اس میں ایک شعبہ مشرقی علوم کی ترویج و ترقی کا تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی ۱۸۲۷ء میں قائم ہوئی یہ یونیورسٹی بھی مشرقی علوم میں اعلیٰ درجات کی سند عطا کرتی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں گورنر جنرل کی کاؤنسل میں الہ آباد یونیورسٹی کے انضمام کا ایکٹ پاس ہوا۔ مقامی حکومت نے یونیورسٹی کی ہئیت کا بڑے غور و فکر سے جائزہ لیا اور خاص طور پر اس مسئلے پر غور کیا کہ جرمن یونیورسٹیوں کی طرح اس یونیورسٹی کو بھی امتحان لینے اور نصاب مقرر کرنے کے ساتھ ساتھ پروفیسروں اور پرائیویٹ استادوں پر مشتمل ایک اسٹاف بھی رکھنا چاہئے۔ اس قسم کی یونیورسٹیوں کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لفٹیننٹ گورنر نے یہ طے کیا کہ سب سے پہلے یونیورسٹی کو اپنی سرگرمیاں جو اب ملک کی ذہنی ترقی میں بتدریج اپنا مقام حاصل کر رہی ہیں

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند''، سید نور اللہ، ص ۲۱۸

تدریس کے طریقوں اور تعلیم کے مقاصد، ملک کی ضرورتوں، حالات اور اس کے رجحان طبع کے مطابق بنانے کی طرف رکھنی چاہیے۔(۱) انیسویں صدی میں کل ملا کر پانچ یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ کلکتہ یونیورسٹی ایل۔ایل۔بی کی ڈگری دینے کی مجاز تھی۔

یونیورسٹیوں کے قیام اور انڈین ایجوکیشنل کمیشن پچیس برسوں میں کالجوں کا فروغ بہت تیز رفتاری سے ہوا۔ یہ تو کچھ ثانوی تعلیم کی غیر معمولی ترقی اور کچھ حکومت کی ہمت افزائی کی وجہ سے تھا۔ یونیورسٹیوں کے پہلے میٹریکولیشن امتحان میں صرف دوسوانیس طالب علم کامیاب قرار دیئے گئے۔(۱۸۵۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی میں ایک سو باسٹھ طالب علم، ۱۹۵۹ء میں بمبئی یونیورسٹی میں اکیس طالب علم اور ۱۸۵۷ء میں مدراس یونیورسٹی میں چھتیس طالب علم تھے)۔لیکن ۸۲۔۱۸۸۱ء میں صرف برطانوی ہند سے چوہتر سوانتیس (۷۴۲۹) طالب علم میٹریکولیشن کے امتحان میں بیٹھے اور ان میں سے ۲۷۷۸ طالب علم کامیاب ہوئے۔ اس زمانے میں میٹریکولیشن پاس کرنے والے امیدواروں کی بہت بڑی تعداد یونیورسٹیوں میں داخلہ لینا چاہتی تھی۔ اس کا خاص سبب وہ مادی فائدے تھے جو یونیورسٹی کی سندیں رکھنے والوں کو حاصل ہو سکتے تھے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان کالجوں اور اس کے ساتھ ان میں داخلوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ وکٹورین عہد میں جو تعلیمی ترقی ہوئی اس کی تفصیل مندرجہ ذیل چارٹ سے ہوتی ہے۔(۲)

نام صوبہ	۱۹۵۷ء میں کالجوں کی تعداد	۱۸۸۲ء میں کالجوں کی تعداد
بنگال	۱۵	۱۷
بمبئی	۳	۶
شمالی مغربی صوبہ	۵	۱۱
مدراس	۴	۲۵
پنجاب	ـ	۲
سنٹرل پراونس	ـ	۱
میزان	۲۷	۶۲

(۱) کیونکیونل ریویو آف دی پراگریس آف ایجوکیشن ان انڈیا، جلد ا۔ ۱۸۹۷ء۔ ۱۹۰۲ء، ص ۱۵۴

(۲) ''تاریخ تعلیم ہند''، سید نوراللہ، ص ۲۲۱

اس عہد میں کالج کی تعلیم کے فروغ میں ایک اور عیب پیدا ہو گیا کہ ۱۸۸۲ء اور ۱۹۰۲ء کے درمیان ہونے والی تیز رفتار توسیع کی وجہ سے تعلیم کا معیار گر گیا۔ مگر اسے بعض ماہرین تعلیم نے مختلف نقطۂ نظر سے دیکھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ توسیع معیار قابلیت جو تعداد کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ اور اس مفکرین کی جماعت میں زیادہ تر سرکاری حکام اور مشنری تھے۔ ان کے نقطۂ نظر کو کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

''درحقیقت ان کی (انڈین ایجوکیشن کمیشن کی) اس منزل پر حکومت کے اخراجات کو کم کرنے اور مقامی اور نجی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی یہ خاص پالیسی، بنیادی طور پر کالج کی ذہنی توانائی کو مضبوط اور عمیق بنانے کے مقصد سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ ان کی تجویز کی ہوئی پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ نشوونما میں گہرائی اور مضبوطی کے بجائے پھیلاؤ بڑھتا گیا اور ان کی اس پالیسی کی بنا پر اگلے بیس برسوں میں جو کالج وجود میں آئے وہ کمزور تھے ان کا عملہ ناکافی تھا اور یہ طالب علموں کی ضرورتوں کی طرف انفرادی توجہ بھی نہیں مہیا کر سکتے تھے اور نہ ہی یہ علمی اور ادبی مضامین کے وہ متنوع نصاب ہی مہیا کر سکتے تھے جو بنگال کے صحت مند نشوونما کے لئے ضروری تھے۔ ۱۸۸۲ء کے بعد کے بیس برسوں کی خصوصیت کالجوں کا تیز رفتار قیام تھا جن کا انحصار زیادہ تر یا پورے طور پر فیسوں پر تھا اور یہ درس و تدریس کے مرکزوں کے بجائے امتحان کی تیاری

کرانے والے اداروں کی طرح چلتے تھے۔''(۱)

دوسری طرف زیادہ تر ہندوستانیوں پر مشتمل ماہرین تعلیم کی ایک جماعت تھی جو سمجھتی تھی کہ ترقی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ایک ملک کے لئے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافہ معیار کے بلند کرنے کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔ اس نقطۂ نظر کو جی۔ کے۔ گوکھلے کے الفاظ میں بیان کرنا زیادہ مناسب ہوگا :

''حکومت کو یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ چند کالجوں میں دی جانے والی تعلیم جب تک اس وقت کی اعلیٰ ترین تعلیم نہ ہوگی بیکار اور مضرت رساں ثابت ہوگی ۔ ہمارے گریجویٹوں کی ذہنی کامیابیوں کو تعلیم کی افادیت کی واحد اور اہم ترین کسوٹی بھی نہیں سمجھنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں 'مائی لارڈ' اور یہ میرا محکم عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حالات میں مغربی تعلیم تمام تر قابل ذکر بھی ہے اور مفید بھی۔ موجودہ حالات میں اگر یہ اعلیٰ ترین ہوسکتی ہے تو یہ اور بھی اچھا ہے لیکن اگر یہ اعلیٰ ترین بھی نہیں ہے تب بھی اسے محض اس بنیاد پر رد نہیں کردینا چاہئے ۔کسی قوم کی زندگی چاہے وہ سیاسی ہو یا سماجی، صنعتی ہو یا ذہنی ایک نامیاتی کُل ہوتی ہے اور کسی ایک رخ میں کسی نمایاں ترقی کی توقع اس وقت تک نہیں کرنی چاہئے جب تک کہ عوام کو اپنی سرگرمیوں کے لئے ہمہ جہت حرکت کا آزادانہ موقع نہ ملے۔ میرے نزدیک ہندوستان کے موجودہ حالات میں مغربی تعلیم کا

---

(۱) ''رپورٹ'' جلد۱، ص۵۹۔۶۰، بحوالہ تاریخ تعلیم ہند ص۲۷۲

عظیم ترین کام علم کا فروغ اور مغرب کی زندگی کے کردار وافکار کی اعلیٰ ترین اور بہترین خصوصیات کو رچانا بسانا نہیں ہے بلکہ ہندوستانی ذہن کو فرسودہ نظریات کی غلامی سے نجات دلانا ہے۔ اس مقصد کے لئے اعلیٰ ترین ہی نہیں بلکہ ہماری مغربی تعلیم مفید ہے۔''(۱)

انیسویں صدی کی تعلیمی صورت حال اور اسکولوں کے قیام کے سلسلے میں مشنری تنظیموں کا بڑا عمل دخل رہا۔ مشنری تنظیموں میں ہر جگہ مذہبی تعلیم کا سلسلہ کسی نہ کسی بہانے سے جاری رکھا گیا۔ اگرچہ کمپنی کے ڈائرکٹروں اور پارلیمنٹ کے چارر ضابطے میں یہ بات واضح تھی کہ ہندوستان میں کمپنی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جارر کھے اور جہاں تک ہوسکے مذہبی تعلیم کی کوششوں میں اتنا زور نہ دکھایا جائے لیکن مقامی طور پر کمپنی کے کارکن ان احکام کو عملی جامہ نہیں پہناتے تھے کیونکہ اخراجات کے معاملے میں کمپنی تعلیم کے مدّ پر کوئی بڑا خرچ اٹھانے کے لئے تیار نہ تھی ان کا یہ ماننا تھا کہ غیر ملک کے باشندوں کو کمپنی تعلیم دلانے کی ذمہ داری کسی طرح نہیں لے سکتی تھی۔ اس کش مکش میں بڑی بحثیں سرکاری اجنبیوں اور مشنری کے درمیان ہوتی رہیں۔ مشنری والے تعلیم میں حصہ بٹانے کے لئے اس شرط پر تیار ہوتے تھے کہ ان کو مذہب کی تبلیغ کا موقع ملنا چاہیے۔ اسی کشمکش میں تعلیم کا کام مثبت انداز سے نہیں ہو پایا۔ ثانوی اسکولوں میں تعلیم قدرے مناسب طریقے سے دی جاتی اور پرائمری اسکولوں میں تعلیم کا کام برائے نام ہی رہا۔ اسی زمانے میں ثانوی اسکولوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا اور تعلیم کے لئے استادوں کا انتظام بھی کسی قدر معقول تھا۔

مذہبی تعلیم کے بارے میں سرکاری طور پر یہ حکم تھا کہ والدین اپنے بچوں کو جس طرح کی

(۱) ''اسپیچیز''، ص۳۵۔۲۳۴ بحوالہ تاریخ تعلیم ہند، ص ۲۲۸

تعلیم دینا چاہتے تھے اسی طرح کی تعلیم کا انتظام حکومت نے فراہم کیا لیکن کمپنی سرکار کو یہ پسند نہیں تھا کہ سرکاری خرچے پر مذہبی تعلیم دی جائے۔ مشنری والے بھی کہتے تھے کہ غیر اہل کتاب (ملحد) عوام میں عیسائی تعلیمات کی اشاعت کی خاطر مشن کو ہندوستان کے غیر عیسائی نوجوانوں کے لئے ابتدائی اور ثانوی اسکول الگ قائم کرنا چاہیے۔ کلکتہ اور بمبئی میں ہونے والی مشنری کانفرنس میں یہ کہا گیا کہ ملحد بچوں کے لئے ایک وسیع تعلیم نظام چلانا غلط ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اسکول میں دنیاوی تعلیم مشنری کا کام نہیں ہے کیونکہ انگلینڈ میں بھی گرجوں کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنے خرچ پر کسی بھی قوم میں عام تعلیم کو فروغ دیں۔ سوائے اس کے کہ اس کے ذریعہ عیسائیت کی تبلیغ ہو۔ مشنریوں کے ذمہ ادب، ریاضی، نیچرل سائنس پڑھانا نہ تو فرض تھا اور نہ ہی انہیں اس قسم کا کوئی حکم نامہ ملا تھا۔ ملحدوں میں عیسائی تعلیمات کی تبلیغ اور دیسی گرجوں کی سرپرستی کرنا مشنریوں کا بنیادی فریضہ تھا اور اسے متحرک اور فعال بنانا بھی۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ جو چیز اس مقصد کی تکمیل نہیں کرتی انہیں اجنبی تصور کیا جانا چاہئے۔ مشنری والوں کو یہ ڈر تھا کہ مذہبی تعلیم اسکولوں سے خارج ہو کر اختیاری رہ جائے گی۔ یہ حکم بھی تھا کہ تمام مضامین جو سرکاری منشور کے تحت آتے ہیں اسے ہر روز اسکول میں شروع کے پانچ گھنٹوں میں پڑھایا جانا چاہئے۔ اور اگر مذہبی تعلیم کا پڑھایا جانا ضروری ہو تو اسے چھٹے گھنٹے میں پڑھایا جانا چاہیے۔ جبکہ چھٹے گھنٹے میں بچے تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور مشن والوں کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ امتحان پاس کرنے والی سیکولر تعلیم کو فروغ دیں اور علم کی پیاس کے خواہش مند نوجوان طلبا کو اس بہانے سے مذہبی تعلیم میں پھنسایا جائے۔ جہاں تک عیسائی مذہب قبول کرنے کا سوال ہے ایسے طلبا کی تعداد مشنری اسکولوں میں برائے نام ہے۔ اونچی تربیت حاصل کئے ہوئے مشنریوں میں جنہیں مشن کے کام میں لگایا جاتا ہے وہ اسکول کے بند کمروں میں محدود ہو کر کمزور ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بیکار

ہو جاتے ہیں ۔اس طرح مشنریوں نے اپنا رخ آدی باسیوں ، پہاڑی قبیلوں اور دوسری پس ماندہ ذاتوں کی طرف موڑلیا۔اور شہروں میں تعلیم کا کام جہاں تھا وہیں رہ گیا۔مشنری اسکول بہت جاری ہوئے اور ان میں مذہبی کتابوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور طالب علموں میں سے جو لڑکے کم عمر کے ہوتے تھے ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہارا خدا کون ہے۔اور تمہیں نجات دلانے والا کون ہے اور اگر وہ عیسائی مذہب کے موافق جواب دیتے تھے تو اس پر ان کو انعام واکرام سے نوازا جاتا تھا ان سب باتوں سے عوام میں انگریزوں کے تئیں خراب تاثر پیدا ہو رہا تھا۔ یہاں ایک بڑا اعتراض یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ اس تعلیم سے ناراض تھے تو اپنے بچوں کو کیوں مشنری اسکولوں میں داخلہ دلواتے تھے۔ یہ ایک بنیادی سوال ہے لیکن اس کے اسباب میں سے ایک اہم سبب مفلوک الحال تھی جس کے بنا پر ان اسکولوں میں ہندوستانی اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے میں دلچسپی رکھتے تھے تا کہ ان کی مالی پریشانی میں کمی آجائے اور معیشت و روزگار بھی حاصل ہو۔ ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمان انگریزی حکومت سے کبیدہ خاطر تھے لیکن باوجود اس کے وہ تعلیمی پالیسی کو اپنا رہے تھے۔

دیہاتی مکتبوں کے کھلنے سے سب لوگ یہی سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کے لئے یہ مکتب قائم کئے گئے تھے۔ پرگنہ وزیٹر اور ڈپٹی انسپکٹر ہر گاؤں اور قصبوں میں گھوم گھوم کر بچوں کو مکتب میں داخل کرانے کی اپیل کرتے تھے۔عوام سمجھتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب کرسچن بنانے کے لئے قائم کئے گئے ہیں۔ ذی شعور جانتے تھے کہ ان مکاتب میں صرف اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہمارے بچے اس میں پڑھ کر اپنے مذہب کے احکام ومسائل، اعتقادات اور رسمیات سے بالکل ناواقف ہو جائیں گے اور عیسائی بن جائیں گے۔اور یوں سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا یہی ارادہ تھا کہ مذہبی علوم جو ہندوستان میں اس وقت رائج تھا اس کو معدوم کر دیا جائے تا کہ آئندہ کو عیسائی

مذہب کے فروغ میں زیادہ پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

۱۸۵۴ء کے بعد حکومت اور مشنریوں نے اپنے تعلیمی اداروں میں بڑے پیمانے پر اضافہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تعلیم میں سرکاری اور مشنری تنظیموں کی اس پابندی نے سارے تعلیمی میدان کو نجی ہندوستانی تنظیموں کے لئے کھول دیا اور انہیں عوام کے بڑھتے ہوئے تعلیمی مطالبات کی تکمیل کا پورے طور سے ذمہ دار بنایا۔ اسی دوران ہندوستانی تنظیم کو خودمختاری اور نشو و نما کی مکمل آزادی دینے کا سہرا حکومت کے سر ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق ہمت کی اور کافی قربانیاں دینے کے بعد اپنے ہم وطنوں کو پڑھانے کا کام اپنے ذمہ لیا اور صرف یہی نہیں بلکہ عوام کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کیا بلکہ اپنی اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ تعلیم کے شوق کو اور آگے بڑھایا۔ ۱۸۸۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مشنری ہندوستانی تنظیم کے مقابلے میں آگے تھے۔ لیکن اگلے کچھ برسوں میں ہندوستانی نجی تنظیم میں اس قدر اضافہ ہوا کہ مشنریوں کے انتظام میں چلنے والے تقریباً ۳۷ کالجوں کے مقابلے میں ہندوستانی نظام کے تحت چلنے والے کالجوں کی تعداد ۴۲ ہو گئی تھی اور نجی ثانوی اسکولوں کی بڑی تعداد بھی ہندوستانیوں کے کنٹرول میں تھی۔ ۱۸۸۲ء کے بعد مخلص ہندوستانی کارکنوں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان لوگوں نے نہایت معمولی معاوضے پر کام کئے اور اپنے مدرسے اور اسکول قائم کئے۔ انہوں نے نئی قومی زندگی کی داغ بیل ڈالی۔ ۱۸۵۴ء کی پہلی دستاویز تھی جس نے گرانٹ ان ایڈ کی باقاعدہ اسکیم کو اپنانے کی سفارش کی تھی۔ اور اس عہد کی تمام دستاویزوں میں گرانٹ ان ایڈ پر زور دیا گیا۔ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نے اس ہدایت پر جلد ہی عمل درآمد کر کے گرانٹ ان ایڈ کے کچھ قاعدے مرتب کئے اور تعلیم کی بڑھتی ہوئی خواہش کو پورا کرنے لئے وجود میں آنے والے پرائیوٹ اسکولوں کا معائنہ کرنا اور ان کو مالی امداد دنیا شروع کر دیا۔

۱۸۵۴ء سے ۱۸۸۲ء تک ''گرانٹ ان ایڈ'' (grant in aid) کا جو نظام رائج تھا اس کی خامیوں کی نشاندہی اسطرح کی جاسکتی ہے۔

۱۔ نئی نجی تنظیموں کو ملنے والی گرانٹ ان ایڈ کی پالیسی ٹھیک ہوتی تو اچھے نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ نجی تنظیموں کو مالی امداد نہیں ملی۔

۳۔ گرانٹ ان ایڈ کا فائدہ ان اسکولوں کو زیادہ ملا جن کو مشنری چلاتے تھے۔

۴۔ گرانٹ ان ایڈ کے معاملے میں نجی اداروں سے مشورہ نہیں ہوتا تھا۔

۵۔ پبلک امتحانات اسطرح ہوتے تھے کہ اسکولی نصاب تعلیم اور درسی کتابیں یکساں طور پر رکھنے کے لئے مجبور تھے۔ جس کی وجہ سے نجی اسکول آزاد طریقے سے ترقی نہیں کر سکتے تھے۔

۶۔ نجی اسکولوں کی طرف سے سرکاری حکام کا رویہ ہمدردانہ نہیں تھا۔ وظیفے عموماً سرکاری اسکول کے طالب علموں تک محدود تھے۔ ملازموں کو چھٹنی کے وقت شروعات امدادی اسکولوں سے ہوتی تھی۔

(i) عام تعلیمی مسائل کے بارے میں نجی اور سرکاری اسکولوں کے منیجروں میں صلاح مشورہ ہونا چاہیے۔

(ii) طالب علموں میں مقابلے کا موقع دیا جانا چاہیے۔

(iii) امتحانوں میں ڈیپارٹمنٹ کے افسروں کے ساتھ غیر سرکاری اسکولوں کے استادوں کو امتحانوں میں شریک ہونا چاہیے۔

(iv) حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے وظیفے اور انعام سرکاری اور غیر سرکاری اسکولوں کے بچوں کو یکساں ملنا چاہئے۔

(۷) کسی غیر سرکاری اسکول کی امداد بند نہیں کرنا چاہیے۔ (۱)

ان کے علاوہ اور بھی مفید سفارشیں تھیں جن کے نتیجے میں نجی تنظیم والے اسکولوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے ترقی ہوئی۔ مشنری اسکولوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ غرض یہ نجی ہندوستانی تنظیم یہ تھی کہ نئی تعلیمی پالیسی سے یہ ادارے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود تعلیم میں حکومت کا رول زیادہ مناسب نہیں رہا جس کی وجوہات درج ذیل ہیں :

(۱) حکومت اور عوام زیادہ قریب نہیں ہو سکی۔

(۲) حکومت نے نجی اداروں کی نگرانی برائے نام کی۔

(۳) حکومت نے اپنے اسکولوں میں زیادہ خرچ والے نصاب تعلیم مہیا کئے جن کا انتظام نجی اسکول نہیں کر سکتے تھے۔

(۴) اس زمانے میں حکومت کی اصل کوشش نجی تنظیموں کی امداد اور نگرانی تھی۔ مالی امداد کبھی قابل اطمینان نہ تھی جو اکثر ناکافی ہی رہی۔ جہاں تک نگرانی کا سوال ہے ڈیپارٹمنٹ نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ اور اس نرم رویے سے بہت سے بے کار اسکول بھی وجود میں آ گئے اور گرانٹ ان ایڈ سے ضروریات کے مطابق فائدہ اٹھاتے رہے۔

اس زمانے میں حکومت کی اصل سرگرمی نجی تنظیموں کی مالی امداد اور نگرانی تھی۔ اسکولوں میں عام طور پر دی جانے والی امداد ناکافی تھی۔ جہاں تک دوسرے مقصد کا تعلق ہے۔ ڈیپارٹمنٹ نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ جو اسکول امداد نہیں مانگتا اس پر کس قسم کا کنٹرول بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ زیادہ تر عام معائنے، طالب علموں کے امتحانات تک محدود تھا کہ حکومت سے ملنے والی امداد صحیح جگہ استعمال ہو رہی ہے یا نہیں۔

۱؎ تاریخ تعلیم ہند، سید نور اللہ، لاہوتی پرنٹ ایڈ پہاڑی املی جامع مسجد، ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۔۲۱۱

(ب) غیر سرکاری : (دینی مکاتب، مدارس)

انیسویں صدی کے دینی مکاتب کی صورت حال کا جائزہ لینے سے پہلے ہم مشرق ممالک بالخصوص ہندوستان کے تناظر میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وہاں علمی و تعلیمی ذوق وشوق اس سے پہلے کس منزل پہ تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تہذیب وتمدن اور علم وفن کی روشنی مشرقی ممالک میں مغربی ملکوں سے صدیوں پہلے پھیل چکی تھی اور علوم وفنون کی تعلیم وتربیت کے دروازے کھل چکے تھے۔ قدیم ہندوستان میں پاٹلی پتر (پٹنہ) ،تکشلا اور اوجین وغیرہ میں عظیم علمی درس گاہیں موجود تھیں۔ یہاں سے غیر ملکی طلبا تک مستفید ہوتے تھے۔ بغداد، قاہرہ کی قدیم درس گاہوں سے اس کا رابطہ قائم تھا۔ اشوک آعظم اور راجہ وکرمادتیہ کے عہد میں چین، ایران اور عرب ممالک سے عالموں اور ماہرین فن کثرت سے ہندوستان میں آئے۔ اس سے قبل بھی یہ سلسلہ استوار تھا۔

زمانہ وسطیٰ میں اکبر آعظم کا عہد قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کا زمانہ کہلاتا تھا اور یہی علم و ادب کا بھی سنہرا دور تھا۔ اکبر آعظم کے بعد بھی سارا مغلیہ عہد علم وفن کے عروج کا روشن زمانہ کہلاتا ہے۔ مختلف زبانوں کی بیشتر کتابوں کے تراجم عربی، فارسی، سنسکرت میں ہوئے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ مغلیہ سلطنت کا بانی بابر صاحبِ تلوار ہی نہیں بلکہ صاحبِ قلم بھی تھا۔ اس کی کتاب ''تزکِ بابری'' ایک یادگار تصنیف ہے۔ اکبر خود ان پڑھ تھا مگر اس کے نورتنوں میں ابوالفضل اور فیضی جیسے باکمال جیّد عالم تھے۔ فیضی کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قرآن کریم کی

تفسیر بغیر نقطے کے لکھی۔ ملاّ عبدالقادر بدایونی مشہور عالم دین بھی اکبر کے عہد میں تھا۔ جہانگیر کی تصنیف وتزک جہانگیری بھی ان کی علمی دوستی پر روشنی ڈالتی ہے۔ شاہ جہاں کا بڑا لڑکا دارشکوہ کئی زبانوں کا عالم تھا اور دوسری بلند پایا تصنیفوں کے علاوہ سنسکرت کے مشہور شاعر کالی داس کے ناٹک 'شکنتلا' کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کیا تھا۔ اس ناٹک کے دوسری زبانوں میں ترجمے داراشکوہ کی فارسی ترجمے سے کئے گئے اورنگ زیب خود بھی جید عالم تھا۔ فتاویٰ عالمگیری شریعت کی مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ بیگمات میں نور جہاں ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں۔ غرض یہ کہ مغلیہ عہد میں علوم وفنون کا عام چرچا تھا اور عالموں کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ علمی لیاقت اور شرافت کا معیار بھی تصور کیا جاتا تھا۔ مغلیہ عہد کے امیروں میں عبدالرحیم خان خاناں، ملک محمد جائسی بلند پایہ عالم اور عالی مقام شاعر تھے۔ امیر خسرو کی فارسی مثنویاں 'مولانا روم' کی مانند تھیں۔ ان کی پہیلیاں قدیم اردو میں لاجواب ہیں۔ اردو شاعری میں میر تقی میرؔ، مرزا غالبؔ، حکیم مومن خاں مومنؔ اور شیخ ابراہیم ذوقؔ وغیرہ بلند پایہ شاعر عہد مغلیہ کی نمایاں ہستیاں تھیں۔ اسی عہد میں لکھنو، حیدرآباد، رام پور، لاہور، پٹنہ وکلکتہ میں علم وادب کا عام چرچا تھا ہر طبقے میں علم وادب کے ماہرین موجود تھے۔ اگرچہ درس وتدریس کا منظّم اہتمام نہیں تھا۔ مکاتیب ومدارس زیادہ تر شہروں میں قائم تھے۔ تعلیم یافتہ والدین خود اپنے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ بعض استاد مقامی لوگوں کی مدد سے مدرسے قائم کر لیتے تھے۔ جہاں شہر اور محلے کے طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔

انیسویں صدی تک جس میں مغلیہ حکومت کا بتدریج زوال ہوا اس وقت تعلیم کا شوق عوام وخواص میں پایا جاتا تھا اور بعض غریب ماں باپ کے بچے علم کی تکمیل کے بعد اپنے مدارس کھول کر تعلیم کو ذریعہ معاش بنا لیتے تھے۔ استادوں کی عزت اور قعت کا یہ عالم تھا کہ والدین اساتذہ

کے سامنے کوئی چوں چرانہیں کر سکتے تھے۔اگر چہ ان مدارس میں تعلیم پرانے فرسودہ طریقوں پر رائج تھی۔ پھر بھی والدین کو یہ بات تسلیم تھی کہ وہ اپنے بچوں کو جاہلوں کے مقابلے میں بہتر سمجھتے تھے اور معاشرہ بھی ایسے تعلیم یافتہ بچوں کی قدر کرتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ کرنے میں کتنی دلچسپی لیتے تھے۔اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے :

> ''عام طور پر تعلیم کا رواج تھا......زیادہ تر پنڈت مندوں میں نجی پاٹھ شالائیں (اسکول) کھولے ہوئے تھے۔ جہاں بچے معمولی لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھتے تھے......چھپی ہوئی کتابیں نہیں ہوتی تھیں۔لکڑی کی تختیوں پر حروف تہجی لکھا دیئے جاتے تھے۔جن کو بچے زبانی یاد کرتے تھے۔ذہنی استعداد سے زیادہ سبق زبانی ازبر کرادیا جاتا تھا......عموماً بچے دس بارہ سال کی عمر تک تعلیم پاتے تھے۔اعلیٰ تعلیم پچیس برس کی عمر تک رائج تھی۔''(۱)

ہندوشاستروں میں برہمچاری کی عمر پچیس سال تک تعلیم حاصل کرنے کے لئے ہی مختص کی گئی تھی۔مسجدوں میں ملّا یا مولوی بھی دینی مدارس قائم کر لیتے تھے اور ناظرہ قرآن شریف کے علاوہ دینی مسائل کی بھی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ بچے روزہ ،نماز وغیرہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرلیں۔اس کے علاوہ فارسی یا اردو میں معمولی تعلیم دی جاتی تھی بعض والدین اپنے بچوں کو خود پڑھاتے تھے یا پھر معلم کو گھر بلا کر تعلیم کا انتظام کرتے تھے۔بعض صاحب حیثیت علم کے شوقین افراد اپنے یہاں مدرسہ قائم کر کے شہر یا قصبے کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کر تے تھے۔اس کام کو ایک کارِثواب سمجھ کر کیا جاتا تھا۔ایسے مدرسوں میں غریبوں کے بچے مفت

---

۱ تاریخ تعلیم ہند،سید نوراللہ،لاہوتی پرنٹ ایڈز پہاڑی املی جامع مسجد دہلی، ۱۹۷۳ء، ص۵۷۔۵۲

تعلیم حاصل کرتے تھے۔

ان نجی مدارس کی تعلیم کا معیار استاد کی صلاحیت پر ہوتا تھا۔ عام طور پر استاد معمولی لیاقت کے ہوتے تھے۔ ان مدارس کی خاص خاص باتیں درج ذیل ہیں :

۱۔ نیچی ذات والے بچے داخلہ نہیں لے پاتے تھے۔

۲۔ لڑکیوں کی تعداد بھی برائے نام ہوتی تھی۔

۳۔ معمولی پڑھائی لکھائی کے علاوہ کچھ حساب بھی یعنی گنتی پہاڑے وغیرہ سکھائے جاتے تھے۔

۴۔ استاد کے معاوضے میں نقد وجنس دونوں کا رواج تھا۔

۵۔ استاد کو سوسائٹی میں عزت ملتی تھی۔

۶۔ ان مدرسوں میں سخت سزائیں دینے کی عام روایت تھی اس لئے طلبا استادوں سے بہت خائف رہتے تھے اور والدین بھی سزا کے معاملے میں چوں چرا نہیں کرتے تھے۔

وکٹورین عہد کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ وہ تبدیلی تھی جو مشرق میں مذہب، فلسفے اور ادب کے متعلق مغربی رویہ سے ہوئی تھی۔ یہ تبدیلی کم وبیش ۱۸۵۴ء تک جاری تھی۔ ایسے لوگ جن کا یہ خیال تھا کہ مشرقی فلسفہ مذہب اور ادب کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ میکالے نے ان سب کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ لارڈ آک لینڈ نے اس تبدیلی کو ایک محدود حلقے میں رہنے دیا۔ ۱۸۵۴ء کی دستاویز میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مشرقی زبانوں کا مطالعہ مفید ہوگا کیونکہ قدیم تاریخی بنیادوں پر مشرقی زبانوں کا مطالعہ ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ مگر ان سب باتوں کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ مشرقی سائنس اور فلسفے میں بڑی بھیانک غلطیاں ہوئی ہیں مگر یہ رویہ ۱۸۵۴ء کے بعد ختم ہونا شروع ہوگیا۔ ذیل کے اقتباس میں سید نور اللہ بار ایٹ لا نے ان باتوں کی نشاندہی کی ہے :

''۱۸۰۱ء میں اپنیشدوں کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اسے ایک فرانسیسی عالم اے۔ ڈبلو پیغان نے اورنگ زیب کے سب سے بڑے بھائی دارشکوہ کے ایک فارسی ترجمے سے فرانسیسی زبان میں منتقل کیا تھا۔ یہ ترجمہ کسی طرح جرمنی کے عظیم فلسفی شوپنہار کے ہاتھ لگ گیا اور وہ اسے پڑھ کر بہت متاثر ہوا اور اسی کے ذریعہ مغربی فلسفے کا اثر مغرب میں شروع ہوا۔ اسی تحریک نے وقت کے ساتھ قوت حاصل کی اور اب وہ ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہو چکی تھی۔ تقریباً اسی زمانے میں سنسکرت کے ایک دوسرے بڑے عالم سر ولیم جانس سنسکرت تخلیقات کو انگریزی زبان میں منتقل کر کے انہیں مقبول بنا رہے تھے ان کا کیا ہوا کالی داس کی 'شکنتلا' کا ترجمہ ادبی فن کا ایک شاہکار تھا...... انیسویں صدی کے عظیم ترین متشرق میکسمولر نے بڑی خدمت انجام دی ان کا عظیم کارنامہ ویدوں کا ترجمہ تھا...... نتیجہ یہ ہوا کہ کلاسیکی زبانوں کا تنقیدی اور سائنٹفک مطالعہ وکٹورین عہد میں کالج کی تعلیم کا نمایاں پہلو بن گیا...... اس سے قدیم تاریخ اور مذہب کے بارے میں شروع زمانے کی ناواقف حکام اور مشنریوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے بعد دونوں تہذیبوں کا امتزاج شروع ہو گیا۔''(۱)

اس امتزاج سے اس عہد میں ہندوستانی قومی زندگی میں نئی قیادت پیدا ہوئی جس میں

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نور اللہ، ص ۲۴۴-۲۴۳

پنڈت ایشور چند ودیا ساگر، کیشپ چندرسین، سوامی وویکانند، جسٹس ایم۔ جی راناڈے، پنڈت مدن موہن مالویہ، دادا بھائی نوروجی، سرسیّد احمد خاں اور بہت سے دوسرے لوگ سامنے آئے۔ ان لوگوں نے جگہ جگہ پردیسی اسکول کھلوائے اور رضا کارانہ طور پر تعلیمی ایجنسیوں اور انجمنوں کی بنیاد ڈالی۔ مثلاً سرسیّد احمد خاں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ عام لوگوں میں تعلیم کا شوق پھیلانے کی کوشش کی۔ مدراس کے صوبے میں ہندوؤں کی تعلیم کی ابتدا کس طرح کی جاتی تھی اس کا جائزہ بیلاری کے کلکٹر نے اسطرح سے پیش کیا ہے :

ا۔ ہندو بچوں کی تعلیم کا آغاز عام طور پر پانچ برس کی عمر سے ہوتا ہے۔ بچہ جب پانچ برس پورے کر لیتا ہے تو جس اسکول میں اسے بھیجا جانیوالا ہوتا ہے وہاں کے استاد اور طالب علموں کو گھر بلایا جاتا ہے۔ تمام لوگ گنیش کی مورتی کی پوجا کرتے ہیں۔ استاد بچے کے پاس ایک طرف بیٹھتا ہے۔ خوشبوئیں لگانے اور چڑھاوے چڑھانے کے بعد مورتی کے سامنے ایک اشلوک پڑھتا ہے بچہ اس کے ساتھ ساتھ دہراتا ہے۔ اس کے بعد چاولوں میں دیوتا کا نام انگلی سے لکھواتا ہے۔ پھر گھر والے استاد کو اپنی حیثیت کے مطابق گرودکچھنا (تحفہ) دیتے ہیں۔ اس کے دوسرے دن بچہ خود اسکول جانے لگتا ہے۔

۲۔ اسکول میں بچے پانچ سال تک رہتے ہیں غریبی یا کچھ دوسرے اسباب کی بنا پر والدین اکثر بچے کو اسکول سے اٹھا لیتے ہیں اسطرح بچہ جو تعلیم حاصل کرتا ہے وہ برائے نام ہی ہوتی ہے۔ اکثر بچے چودہ پندرہ سال کی عمر تک اسکول جاتے ہیں روزانہ کے کام میں سبھی اسکولوں میں پروگرام ایک جیسا رہتا ہے اسکولوں کے کھلنے کا وقت عام طور پر چھ بجے کا ہوتا ہے۔ جو بچہ پہلے آتا ہے اس کے ہاتھ پر گیان کی دیوی کا نام لکھ دیا جاتا ہے اور جو بچہ بعد میں آتا ہے اس کے ہاتھوں پر فرضی نشان بنا دیئے جاتے ہیں۔ جو بچہ جتنی دیر سے آتا ہے اتنی ہی قمچیاں اس کے ہاتھ پر ماری

جاتی ہیں دیسی اسکولوں میں سخت سزائیں دی جاتی ہیں کام چور بچوں کو کوڑے سے پیٹا جاتا ہے یا پھر بیٹھک لگوائی جاتی ہے۔ یہ سزائیں نہایت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

۳۔ بچوں کی استعداد کے حساب سے درجہ بندی کی جاتی ہے ان جماعتوں کی تعداد عموماً چار ہوتی ہے اور قابلیت کے حساب سے ترقی دی جاتی ہے۔ اسکول میں داخل ہو کر بچے کو سب سے پہلے حروف تہجی سکھائی جاتی ہے۔ ابتدا میں بچے اپنی انگلی سے زمین پر لکھ لکھ کر یاد کرتے ہیں۔ پھر ان کو تختی یا سلیٹ پر تحریر سکھائی جاتی ہے۔

۴۔ کم استعداد بچے مانٹیروں کی نگرانی میں رہتے ہیں۔

۵۔ جب بچہ مختلف حروف ملا کر لکھنا سیکھتا ہے تو آواز کے حساب سے حروف علّت ملانا سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیہات کے جانوروں اور پھلوں کے نام سکھائے جاتے ہیں سو تک کی گنتی اور پہاڑے زبانی یاد کرائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد روپیہ پیسہ کی جمع باقی کے آسان قاعدے سکھائے جاتے ہیں۔ اسی طرح گز اور انچ کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد صحیح عدد کی کسریں (Fraction) سکھائی جاتی ہیں لمبائی اور وزن کے پیمانے سکھائے جاتے ہیں۔ دن میں دو مرتبہ بچوں کو قطار میں کھڑا کر کے مانیٹروں سے پڑھوایا جاتا ہے اور تمام بچے اسے دہراتے ہیں۔

۶۔ مختلف قسم کے رسم الخط کو پڑھنا اور ان حروف کو سمجھنا جو پہلے پڑھ چکے ہیں۔ کہانیوں اور داستانوں کا مطالعہ اور مختلف قسم کی نظموں کو یاد کرنا یہ سب دیسی تعلیم کے ضروری حصے ہیں۔ ان سب کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچہ الفاظ کو صحیح طرح ادا کر سکے۔ مضامین اور نظموں کو ٹھیک ڈھنگ سے پڑھ سکیں۔ ان دیسی اسکولوں میں جس طریقے سے اور جتنے کم وقت میں بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا ہے اور بڑی جماعت کے طالب علموں سے چھوٹی جماعتوں کے کام کو چلایا

جاتا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔(۱)

صوبہ بمبئی کے تعلیمی جائزے ۱۸۲۳ء سے ۱۸۲۵ء تک کے مطابق گورنر نے جو تعلیمی سروے شروع کیا اس کے اشارے پر تمام کلکٹروں کو سرکولر بھیجے گئے تھے جس میں دیسی تعلیم سے متعلق معلومات فراہم کرنے کو کہا گیا تھا۔ یہ رپورٹیں پورے صوبے کا احاطہ نہیں کرتیں لیکن موجودہ اعداد وشمار کی بنیاد پر صوبہ بمبئی میں دیسی تعلیم کے سروے اس وقت کے مطابق حسب ذیل تھے۔

(i) زیادہ تر مدرسے مندروں میں، نجی گھروں میں اور چھپروں کے نیچے لگتے تھے یا پھر بچے خود استاد کے گھر پر جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ مدرسے عام طور پر مستقل نہیں ہوتے تھے۔ ان مدرسوں میں طالب علموں کی تعداد دو سے ڈیڑھ سو تک ہوتی تھی۔ اس لئے اوسط تعداد کا اندازہ فی اسکول پندرہ لگایا گیا۔ اصولی طور پر یہ مدرسے کسی خاص فرقے کے نہیں ہوتے تھے۔ نیچی ذاتوں کے بچوں کے علاوہ سب فرقوں کے بچے داخل ہو سکتے تھے۔

(ii) استاد زیادہ تر برہمن تھے۔ اس پیشے سے ان کا تعلق ان کی برادری کی عزت کی وجہ سے تھا۔ کچھ دوسری برادری کے بھی استاد ہوتے تھے۔ ماہانہ تنخواہ اوسطاً تین اور پانچ روپیہ کی درمیان مقرر ہوتی تھی۔ تنخواہ کی کمی کو دوسرے طریقوں سے بھی پورا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان استادوں کی علمی لیاقت نا قابل اعتماد تھی۔

(iii) ابتدائی اسکولوں میں ہریجنوں کے علاوہ تمام دوسرے طبقوں کے طلبا آتے تھے ان میں تیس فی صدی برہمن تھے۔ دوسرے طبقے کے بچے مثلاً سونار، بنیے وغیرہ ہوتے تھے۔ طالب علموں کا ۷۰ فیصدی حصہ ترقی یافتہ طبقوں کا تھا۔ ان کی عمر چھ اور چودہ برس کے درمیان ہوتی تھی۔ اسکولوں میں پڑھنے کی مدت گجرات میں دو تین سال اور دوسرے علاقوں میں تین چار

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص۲۹۔۲۷

سال تک کی تھی۔

(iv) ریاضی اور پہاڑے بچوں کو اس لئے سکھائے جاتے تھے کہ وہ رزمرہ کی زندگی میں کام آنے والے سیدھے سادے سوالوں کا جواب زبانی لگانے کے قابل ہو جائیں۔ اس وقت کتابوں کا یکسر فقدان تھا۔ تعلیمی سامان بھی معمولی اور بے ڈھنگا ہوتا تھا۔ اور سزائیں عام طور پر سخت ہوتی تھیں۔

(v) عورتوں کی تعلیم صوبے کی کسی اسکول میں نہیں تھی۔ اس زمانے میں عام اسکول صرف لڑکوں کے لئے ہوتے تھے۔ عورتوں کو گھروں پر تعلیم کے معمولی موقع مل جاتے تھے۔

(vi) بہت سے دیسی اسکول تھے جہاں صرف مسلمان طالب علم پڑھتے تھے اور ان اسکولوں کی نگرانی بھی مسلمان استاد کرتے تھے۔ ان میں فارسی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اور بعض اسکولوں میں ہندوستانی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ مسلمان بچے عام ہندو اسکولوں میں بھی جاتے تھے۔

(vii) کچھ رپورٹوں میں اعلیٰ تعلیم کے ہندو اسکولوں کا ذکر ملتا ہے احمد نگر میں ایسے سولہ اسکول اور پونا میں ایک سو چوسٹھ اسکول تھے۔(۱)

ایڈم نے اپنی دوسری رپورٹ میں راج شاہی کی ناٹور کی تفصیلی رپورٹ لکھی ہے۔ تھانے (ناٹور) کی کل آبادی ایک لاکھ پچانوے ہزار دو سو چھیانوے تھی۔ جس میں ایک لاکھ انتیس ہزار چھ سو چالیس مسلمان تھے۔ اور پینسٹھ ہزار چھ سو چھپن ہندو تھے۔ جہاں ایڈم کو کل ستائس اسکول ملے جن میں طالب علموں کی تعداد دو سو باسٹھ تھی جن میں دس اسکول بنگالی تھے۔ یہاں طالب علموں کی تعداد ایک سو سڑسٹھ تھی۔ تئیس طالب علم چار فارسی اسکولوں میں تھے۔ قرآن پڑھانے کے لئے گیارہ عربی مدرسے تھے۔ ان کے علاوہ تقریباً دو سو اڑتیس گاؤں میں رہنے والے پندرہ سو اٹھاسی خاندان تھے جن میں دو ہزار تین سو بیالیس افراد پڑھنے کے لئے بھیجے

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند'' سید نوراللہ، ص ۳۱۔۳۳

جاتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گھروں پر تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کی تعداد پبلک اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں سے تقریباً نو گنا زیادہ تھی۔ پبلک کے لئے بنے ہوئے ابتدائی اسکولوں میں داخلے کے اوسط عمر آٹھ سال تھی اور اسکول چھوڑنے کے عمر چودہ برس تھی۔

ایسے دیسی کالج نہیں تھے جنہیں مسلمان چلاتے ہوں۔ تعلیم نسواں کا تقریباً وجود ہی نہیں تھا۔ ناٹور ضلع میں بالغوں کی تعداد مندرجہ ذیل نقشہ کے مطابق اسطرح تھی :

۔ ہندو کالجوں میں استاد	۔	۳۹
۔ پڑھے لکھے لوگ جو استاد نہیں تھے	۔	۸۸
۔ کالجوں میں طالب علم	۔	۳۹۷
۔ جن لوگوں نے نوشت وخواندکی منزلوں سے آگے تعلیم حاصل کی	۔	۳۰۲۵۵
۔ وہ لوگ جو دستخط کر سکتے تھے	۔	۲۳۴۲
۔ کل تعداد	۔	۶۱۲۱

اس حساب سے مردوں کی پوری آبادی میں خواندگی کی شرح ۱ء۶ فی صد عورتوں کو شامل کر کے کل آبادی میں خواندگی کی شرح ۱ء۳ فی صد تھی۔

دیسی تعلیم کے متعلق ایڈم کی تیسری رپورٹ زیادہ اہم ہے اس سلسلے میں انہوں نے مرشد آباد، بیر بھوم، بردوان، جنوبی بہار اور ترہوت کے ضلعوں سے اعداد وشمار جمع کئے گئے تھے اور ایڈم نے جو اعداد شمار خود اکٹھا کئے ان پر وہ زیادہ بھروسہ کرتا تھا اور جو اعداد وشمار ایجنٹوں سے کرائے ان پر اسے اعتماد نہیں ہوتا۔ ایڈم نے لکھا ہے کہ :

''گو کہ مجھے یقین ہے کہ مجھے جو جوابات ملتے ہیں وہ عام طور پر معتبر ہیں لیکن پھر بھی میرے پاس اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ بالکل بے عیب ہیں۔ میرے ایجنٹ ہر ضلع کے تمام گاؤں میں نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے گاؤں کی تعداد ہزار تک پہنچتی ہے اور انکوائری کو حدود سے زیادہ طول دیئے بغیر یہ بات جسمانی طور پر ممکن بھی نہیں تھی اسی لئے وہ یا تو اپنے ذاتی علم پر اکتفا کرنے پر مجبور تھے یا پھر اس معلومات پر یقین کرنا پڑتا تھا جو دوسروں سے حاصل ہوئی تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ جس بات کی تصدیق کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں کوئی دیسی ادارہ نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے بعض اوقات ایسی مثالیں ضرور ملی ہیں کہ بعض ادارے پہلے شمار میں نظر سے اوجھل رہ گئے تھے۔''(۱)

ایڈم نے دوسری بات یہ دیکھی کہ بعض دفعہ لوگ انکوائری سے اتنے خوف زدہ ہو گئے کہ انہوں نے گھر کی عورتوں کی صحیح تعداد کو چھپایا اور اکثر تو اسکولوں اور کالجوں نے بھی خوفناک تفتیش سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا۔(۲) لیکن ان خامیوں کے اعتراف کے باوجود دیسی تعلیم سے متعلق ایڈم کو جو کچھ اعداد شمار فراہم ہوئے اس اعداد و شمار کا خلاصہ اسطرح پیش کیا گیا ہے۔(۳)

---

(۱) ''ایڈم کی رپورٹ'' کلکتہ ایڈیشن، ص۲۱۹

(۲) ایضاً، ص۲۲۰

(۳) تاریخ تعلیم ہند، سید نوراللہ، ص۴۳-۴۲

جدول نمبر۱

مدرسے

مدرسوں کی تعداد

ضلع	بنگالی	ہندی	سنسکرت	فارسی	عربی زبان	عربی	انگریزی	لڑکیوں کے لئے	میزان
مرشدآباد	۶۲	۵	۲۴	۱۷	......	۲	۲	۱	۱۱۳
بیربھوم	۴۰۷	۵	۵۶	۷۱	......	۲	۲	۱	۵۴۴
بردوان	۴۲۹+۱ چھوٹے بچے	......	۱۹۰	۹۳	۳	۸	۳	۴	۹۳۱
جنوبی بہار	......	۲۸۶	۲۷	۲۷۹	......	۱۲	۱	......	۶۰۵
ترہت	......	۸۰	۵۶	۲۳۴	......	۴	......	......	۳۷۴
میزان	۱۰۹۹	۳۷۶	۳۵۳	۶۹۴	۳	۲۸	۸	۶	۲۵۶۷

جلد نمبر۲

طالب علم

طالب علموں کی تعداد

	بنگالی اور ہندی	سنسکرت	فارسی اور عربی	انگریزی	لڑکیاں	کل میزان
مرشدآباد	۱۰۸۰	۱۵۳	۱۰۹	۲۶	۲۸	۱۳۹۶
بیربھوم	۶۳۸۲	۳۹۳	۴۹۰	۷۳	۱۱	۷۳۵۰
بردوان	۱۳۱۹۰	۱۳۵۸	۹۷۱	۱۳۰	۱۷۵	۱۵۸۱۴
جنوبی بہار	۳۰۹۰	۴۳۷	۱۴۸۶	۲۳	......	۵۰۹۳
ترہت	۵۰۷	۲۱۴	۵۹۸	......	......	۱۳۱۹
میزان	۲۴۲۵۰	۲۵۵۵	۳۶۵۴	۲۴۲	۲۱۴	۳۰۹۱۵

اوپر کے خاکے سے پتہ چلتا ہے کہ عربی اور فارسی کے پانچ سو پچیس اسکولوں میں کل تین ہزار چھ

سو چوون بچے پڑھتے تھے۔اوسط کے حساب سے فی اسکول سات طالب علم تھے جو طلبہ کے تعلیمی شوق کی کمی کو ظاہر کرتی ہے۔سنسکرت اسکول تین سو ترپن میں دو ہزار پانچ سو پچپن طالب علم تھے یعنی دس بچہ فی اسکول اوسط آتا ہے۔ بنگالی اور ہندی اسکول ایک ہزار ننانوے تھے۔جن میں چوبیس ہزار دو سو پچاس طالب علم پڑھتے تھے یعنی فی اسکول چوبیس طالب علم اوسط رہا۔ظاہر ہے کہ بنگالی ہندی اسکولوں میں ہندو طالب علموں کی تعداد زیادہ تھی۔ فارسی عربی اسکول جہاں مسلمان طلبا ہی پڑھتے تھے ان کی تعداد بہت کم تھی۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یا تو تعلیم کا شوق کم تھا یا ان کی مالی حیثیت اتنی کم تھی کہ وہ تعلیم کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے تھے۔جس کے نتیجے میں مسلم معاشرہ پستی کی طرف جارہا تھا اور دوسری قوموں کے مقابلے میں اس کی حالت نہایت افسوس ناک تھی۔اس زمانے میں اعلیٰ تعلیم کے ادارے آج کل کے کالجوں سے ملتے جلتے تھے ان اداروں میں عموماً مذہبی تعلیم جو اس زمانے کی اعلیٰ ترین تعلیم دی جاتی تھی۔ان کا اصل مقصد مولوی اور پنڈت تیار کرنا تھا ان اداروں کی عام لوگوں میں بڑی عزت تھی۔حقیقت یہ ہے کہ خاص کردار، قدامت پرستانہ مزاج، دقیانوسی نظریات اور فرسودہ طریقہ تعلیم کی بنا پر تعلیمی نظام کے کمزور اور غیر مفید حصہ بن کر رہ گئے۔عوام میں تعلیم کو پھیلانے والی ایجنسی دیسی ابتدائی مدرسے معمولی قسم کے مفید ادارے تھے۔ان میں دی جانے والی تعلیم کارآمد ہوتی تھی۔اس تعلیم نے مولویوں اور پنڈتوں کی روحانی ضرورت تو پوری نہ کرسکی مگر زمینداروں اور کاشتکاروں کی روزمرہ کی ضرورتوں کو ضرور پورا کیا۔اسے کوئی مذہبی احترام حاصل نہیں ہوا اس لئے سرکاری اور غیر سرکاری آمدنی کا سہارا اس کے پاس نہیں تھا۔یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مقابلے میں ان اسکولوں کے طالب علموں میں چھوٹی سی تعداد لڑکیوں اور دوسری ذاتوں کی بھی تھی جو ان اسکولوں میں پڑھتے تھے۔

دیسی ابتدائی اسکولوں کے کچھ پہلو قابل توجہ ہیں۔ان اسکولوں میں سامان بہت سادہ اور معمولی ہوتا تھا۔اپنی کوئی عمارت نہیں ہوتی تھی۔ان کی تدریس کبھی استاد کے گھر میں ہوتی تو کبھی کسی درخت کے نیچے۔اسکول عام طور پر چھوٹا ہوتا تھا طالب علم کی تعداد دس پندرہ تک ہوتی تھی۔داخلوں کے لئے وقت مقرر نہیں تھا۔سینئر لڑکوں سے جونیئر لڑکوں کو پڑھوانے کا طریقہ اسکولوں میں عام تھا۔نصاب بہت محدود تھا۔اس میں پڑھنا،لکھنا،حساب اور بہی کھاتہ سب شامل تھا۔اس کے متعلق ایڈم نے یقینی طور پر ہندوستان میں نظام تعلیم دیسی زبانوں کی ہی بنیاد پر قائم کرنے کی سفارش کرتے ہوئے کہا ہے کہ :

> ''اعلیٰ یا ادنیٰ تمام قسموں کے موجودہ دیسی ادارے عوام کے کردار کو بلند کرنے اور بہتر کرنے کے سب سے اچھے ذرائع ہیں اور یہ کہ اس مقصد کے لئے ان اداروں کو استعمال کرنا سب سے زیادہ آسان،سب سے زیادہ محفوظ،سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ سستہ طریقہ ہوگا۔تعلیم جیسے موضوع کے لئے دیسی ذہن کو جس تحریک کی ضرورت ہے اسے پیدا کرنے اور اپنی نشو ونما کے لئے خود ہی اپنی سعی کو بروے کار لانے کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے یہی منصوبہ سب سے زیادہ موثر ہوگا جس کے بغیر دوسرے ذرائع بھی بروئے کار نہ آسکیں۔''(۱)

دیسی مدرسوں میں تعلیم کی حالت اسطرح کی تھی جو بعد میں یہ دیسی مدرسے ختم ہوتے گئے اور ان کی جگہ پر سرکاری اسکول قائم ہوتے گئے۔ان میں بھی مسلمان بچوں کی تعداد اوسطاً کم

---

(۱) ''تاریخ تعلیم ہند''سید نوراللہ، ص۵۳۔۵۴

ہوتا گیا کیونکہ سرکاری اسکولوں میں کتابیں اور دوسری تعلیمی ضروریات کی چیزوں کے اخراجات زیادہ ہی تھے۔ اسطرح ابتدائی تعلیم سے لیکر کالج کی تعلیم تک مسلمان پستی کی طرف اور ہندو ترقی کی طرف گامزن ہوتے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ دنوں بعد سرکاری ملازمتوں میں ہندو ہی ہندو نظر آنے لگے اور مسلمان سرکاری نوکریوں سے محروم ہوتے چلے گئے۔

یہ بات بھی سچ ہے کہ ملازمت کے علاوہ اور دوسرے کاروبار میں بھی ہندو فرقے کے افراد زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ان میں تجارت پیشہ اور ہنرمند بھی تھے۔ جب کہ مسلمانوں میں تجارت پیشہ لوگ برائے نام ہی تھے اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے ایسے ہنر نہ سیکھ سکے جن میں تعلیم کی ضرورت ہوتی ہو۔ مثلاً انجینئر، ڈاکٹر وغیرہ جیسے پیشے ہندو ہی دستیاب کر سکے۔ مسلمان صرف مزدور کی حیثیت سے سوسائیٹی کا بوجھ بنتے تھے۔

انیسویں صدی کے نظام تعلیم کے اس جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمان قوم ہندؤوں کے بہ نسبت زیادہ پس ماندہ تھی۔ نئی تعلیمی بیداری ہندؤوں میں پہلے آئی اور ہندؤوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو اور سماج کو زیادہ بیدار کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً تجارت ،صنعت و حرفت میں وہ مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ بیدار ہو رہے تھے۔ انگریزوں کی لائی ہوئی تعلیمی پالیسی کو مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ اپنا رہے تھے ان تمام وجوہات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں میں بھی تعلیمی بیدراری اس وقت آ چکی تھی لیکن ہندؤوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ سرسیّد احمد خاں کی علمی ذہانت اور غور و فکر نے مسلمان قوموں میں تعلیمی بیداری لانے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ انہوں نے وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنی قوم کی فلاح کے لئے ایک تعلیمی ادارے قائم کئے چنانچہ اس ادارے نے مسلمانوں کے لئے بڑا اہم فریضہ انجام دیا۔ اور اس طرح ہندؤوں کی تعلیمی بیداری کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں میں بھی تعلیمی بیداری کی شمع

سر سیّد احمد خاں اور ان کے رفقاء نے علی گڑھ میں روشن کی اور نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اب مسلمان بھی اپنے آپ کو علمی میدان میں مستحکم محسوس کرر ہے ہیں۔ لیکن اس ادارے سے تمام امت مسلمہ جو ہندوستان میں بستے ہیں، کی تعلیمی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی ہے۔

باب سوم

سرسیّد کا تصور تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت دو الگ الگ چیزیں ہیں صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بھی بنتا ہے۔ جیسا کہ بولنے میں یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت۔ مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے۔ بقول سر سیّد احمد خاں :

> ''تعلیم و تربیت دو متفرق چیزیں ہیں اس کو ہم معنی سمجھنا ایک قسم کی بھول ہے یعنی کہ جو کچھ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کے لائق کر دینا اس کی تربیت ہے۔ مثلاً جو قوتیں اللہ تعالیٰ نے ہم انسان میں رکھی ہیں اس کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمہ بنانا اس کی تربیت ہے۔''(۱)

سر سیّد کے نظریہ تعلیم پر گفتگو کرنے سے پہلے اس عہد کے سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور تعلیمی حالات پر ایک نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر سر سیّد کی علمی بصیرت اور ان کے نظریہ تعلیم کی واقعی اہمیت پورے طور پر واضح نہ ہو سکے گی۔

سر سیّد احمد خاں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اس وقت محکومی کا دور تھا۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے حکومت کی باگ ڈور نکل کر سات سمندر پار کی ایک قوم کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ سلطنت مغلیہ اب بھی باقی تھی مگر عملاً اس کا اقتدار صرف لال قلعہ کی چہار دیواری تک محدود تھا۔ انگریز رفتہ

---

(۱) ''انتخاب مضامین سر سیّد''، مرتبہ عتیق احمد صدیقی، سر سیّد اکیڈمی، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۷

رفتہ سارے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لیتے جا رہے تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھ سے سیاسی اقتدار کیا گیا ان کی عزت و اقبال مندی کو گہن لگ گیا۔

زوال کا یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامۂ غدر مسلمانوں کی مزید تباہی کا سبب بنا۔ اس ہنگامے نے مسلمانوں کی رہی سہی سیاسی شاخ بھی ختم کر دی۔ سلطنت مغلیہ جو برائے نام باقی تھی حرف غلط کی طرح مٹا دی گئی۔ بغاوت کے جرم میں پوری مسلم قوم کو نا قابل تصور ظلم و ستم کا تختہ مشق بنایا گیا جو معزز تھے انہیں ذلیل و خوار کیا گیا۔ جو صاحب حیثیت تھے ان کو مفلس و قلاش بنا دیا گیا، ان کے گھر اور مال و اسباب لوٹ لئے گئے ان کی جاگیریں چھین لی گئیں۔ ان کو عہدوں سے برطرف کر دیا گیا اور جب آتش انتقام اس سے نہ بجھی تو قتل و غارت گری کا وہ طوفان حشر خیز برپا کیا کہ بڑے بڑے اصحاب، عزو جاہ، ارباب علم و دانش اور صاحبان جبر و دستار بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اس خوف ناک دار و گیر کا انجام یہ نکلا کہ مسلمانوں کا ملی وجود پارہ پارہ ہو گیا۔ جو قوم صدیوں تک معزز و محترم تھی وہ ذلت و نکبت کے عمیق غار میں جا گری جس سے نکلنا بظاہر مشکل معلوم ہوتا تھا۔ مسلمانوں کا سیاسی زوال دراصل انکے ذہنی و اخلاقی زوال کا نتیجہ تھا۔ سرسیّد کے عہد میں مسلمانوں کی جو زبونِ حالی اور علمی بے مائیگی تھی اسکا نقشہ خود سرسیّد نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :

> '' اگر ہماری قوم میں صرف جہالت ہوتی تو چنداں مشکل نہ تھی۔ مشکل تو یہ تھی کہ قوم کو قوم جہل مرکب میں مبتلا ہے علوم جن کا رواج ہماری قوم میں تھا یا جن کا تکبر وغیرہ سے ہر ایک پھولا ہوا ہے۔ دین و دنیا دونوں میں بکار آمد نہیں۔ علم و انشا کی وہ خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور ہم وزن قلموں تک

ملانے اور دور انکار خیالات بیان کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کو لکھنے پر منحصر ہے۔فن شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بری نہ ہوگی، مضمون تو بجز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہوتا اور وہ بھی نیک جذبات انسانی کو بظاہر نہیں کرتا بلکہ ان جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو تہذیب الاخلاق کے خلاف ہیں علم دین تو وہ خراب ہوا ہے کہ جس کی حد نہیں اس سے معصوم، سیدھے سادے بچے اور نیک طبیعت والا پیغمبر جو خدا کا احکام بہت سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے جاہل، ان پڑھ یا بادِ نشین عرب قوم کو پہنچائے تھے ان میں وہ نقطہ چینیاں اور باریکیاں گڑھی گئیں اور وہ مسائل فلسفیانہ اور دلائل منطقیانہ ملائے گئے ان میں سچائی، صفائی اور سادگی کا مطلق اثر نہیں رہا۔ یہ مجبوری تو لوگوں کو اصل احکام جو قرآن اور معتمد حدیثوں میں تھے چھوڑنے پڑے اور زید وعمر کے بنائے اصولوں کی پیروی کرنی پڑی علم ومجلس اور اخلاق و برتاؤ دوستی کا ایک ایسے طریق پر پڑ گیا جو نفاق سے بھی بدتر ہے۔“(۱)

ان دردناک حالات میں بھی مسلمان اپنی تعلیمی حالت کو بہتر بنانے اور اپنے نظام تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ سرسیّد احمد خاں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کے اسباب پر سنجیدگی سے غور کیا اور اس کی انتہائی پیچیدہ

(۱) تہذیب الاخلاق سرسیّد نمبر، اکتوبر ۱۹۹۸ء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص ۵۵

سیاسی ماحول میں مسلم قوم کو مذید زوال سے محفوظ رکھنے کی خاطر انہوں نے ان کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ان سارے مسائل کا حل ڈھونڈنے کے لئے انہوں نے یہ ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔اس کے لئے عملی قدم کے طور پر انہوں نے فاتح قوم کو اپنے لئے ماڈل قرار دیا اور انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے جہاں وہ بہت ہی قریب سے انگریزی قوم کی ترقی کے اسباب کی چھان بین کر سکتے تھے۔وہ انگلستان میں قیام کے دوران مغربی علوم اور فکر و فلسفے سے بے حد متاثر ہوئے۔وہ مسلمانوں میں اس روشنی کو پھیلانا چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم سے آراستہ ہوں اور سائنسی طرز فکر اختیار کریں۔روایتی رسم و رواج اور قدامت پرستی کر ترک کر دیں۔مغربی طرز فکر و معاشرت کو اپنائیں ،مغرب کی روشن خیالی پیدا کریں اور معاملات زندگی میں عقل و استدلال کو رہبر بنائیں۔

سرسیّد انگلستان سے واپس آ کر تبدیل شدہ قدرے رومانی کردار تھے ماضی سے زیادہ مسلمانوں کی حال اور مستقبل کو بہتر سے بہتر بنانا چاہتے تھے۔وہ مسلمانوں کی سماجی اور ذہنی حالت میں تیز رفتار تبدیلی کے آرزومند تھے۔سرسیّد انگلستان سے زندگی کا یہ اصول بھی ساتھ لائے تھے کہ تعلیم اور سائنٹفک تلاش و تحقیق کسی قوم کی ترقی کی ضمانت ہیں۔تعلیم سے ان کی مراد جدید مغربی علوم بشمول سائنس تھی۔انہوں نے اسی احساس کے تحت ایک تحریک شروع کی اور چونکہ اس تحریک کا مرکز علی گڑھ تھا اس لئے یہ علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔یہ تحریک محض علمی یا سیاسی تحریک نہ تھی بلکہ یہ خاص طرز زندگی بھی تھی جس کے اوصاف میں خوش گفتاری، خوش باشی ،خوش پوشی اور آزاد خیالی کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔علی گڑھ تحریک کے اثرات اردو کی ادبی اور ثقافتی زندگی پر نمایاں طور سے نظر آتے ہیں۔انکی ترویج و اشاعت میں سائنٹفک سوسائٹی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کا بہت بڑا دخل ہے اور نئی نسل کو فکر جدید سے

روشناس کرانے میں ان کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ سرسیّد نے اپنے خیال کی ترویج واشاعت کے لئے سب سے پہلے ۱۸۶۴ء میں ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی ۔ علمی منصوبوں کا ایک دوسرا منصوبہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس کا اجرا ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ یہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی چھپتا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ ملک میں سنجیدہ اور تعمیری جذبے کی اشاعت کی جائے اور جدید خیالات وافکار سے مسلمانوں کو روشناس کرایا جائے۔

سرسیّد کو قیام انگلستان کے دوران وہاں کے دو جرائد ''اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر'' نے اتنا زیادہ متاثر کیا کہ وہ انہی کی طرز پر ۲۴ ر دسمبر ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ اس رسالے کا مقصد دراصل اپنی قوم میں ذہنی انقلاب اور جدید تعلیمی تقاضوں کا شعور پیدا کرنا تھا۔ اس کے ذریعہ وہ قومی اخلاق کو بھی بہتر بنانا چاہتے تھے۔ اس پرچہ سے مذہبی امور میں فکر ونظر کی آزادی اور جدید تعلیم کی اہمیت کا احساس پیدا ہوا۔

سرسیّد کے تعلیمی نظریات کی نشو نما میں مغربی علوم اور سائنسی طرز استدلال اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی بدحالی کی گہری بصیرت کا بڑا دخل ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مغربی تہذیب و معاشرت اور حکومت وقت سے وفاداری کا جذبہ بھی کارفرما ہے اسی لئے سرسیّد کے تعلیمی نظریات کے فروغ میں سیاسی اور تعلیمی عوامل پورے طور سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

سرسیّد کے تصور تعلیم کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے تعلیم کو ایک عظیم مقصد سے مرتب کیا اور وہ تھا سیاسی وسماجی زبون حالی کا ازالہ اور معاشرتی وثقافتی ترقی کا حصول ۔ انہوں نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ کسی قوم کی تنزلی کو دور کرنے کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تعلیم کے اشاعت میں دلچسپی لی جائے اور مختلف علوم وفنون کے فروغ پر توجہ دی

جائے۔اس ضمن میں سرسیّد کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

''انسان کے قوی جب ضعیف ہوجاتے ہیں اور اعتدال مزاج جب درہم برہم ہوجاتا ہےتو وہ متعدد متضاد بیماریوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ یہی حال قوم کا ہوتا ہے۔ جب اس کوتنزل ہوتا ہےتو کسی ایک چیز میں تنزل نہیں ہوتا ہے بلکہ مذہب، اخلاق، تعلیم، راست بازی، دیانت داری، دولت، Civilization، تمکنت، متانت سب چیز میں ہوتا ہےاور جولوگ اس کے اصلاح کے درپہ ہوتے ہیں وہ حیران ہوجاتے ہیں کہ کس کس چیز کا اعلاج کریں۔

''دل ہمہ داغ داغ شدپنبہ کجا کجا نہم'' مگر جب غور کی جاتی ہےتو بجز تعلیم و تربیت کےاور کوئی اس کا علاج نظرنہیں آتا۔''(۱)

اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت سے سرسیّد کا اصل مقصدان کی ملی وقوی زندگی کی تعمیراوران کی پروقار سماجی حیثیت کی بحالی تھی۔ سرسیّد احمد خاں نے مدرستہ العلوم یا ایم۔اے۔او کالج اس لئے قائم نہیں کیا کہ لوگوں کو ڈگری مل جائے اور وہ سرکاری ملازمت کے اہل بن جائیں لیکن اس کے ساتھ انہوں نے یہ وضاحت کی کہ اس ادارہ میں ایسے علوم فنون کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے کہ اس سے استفادہ کرنے والے خود معاش کے ذرائع پیدا کرسکیں۔سرسیّد نے اسی نیک خواہشات کے تحت یہ ادارہ قائم کیااور جب وہ اپنے مقصد میں دھیرے دھیرے کامیاب ہونے لگےتو بعض لوگوں نے ان پر اوران کے ادارے پرتنقید کرناشروع کردیا۔لیکن اس سے سرسیّد کے مقصد (Mission) کو وہ نہیں روک سکے بلکہ سرسیّد نے مدرستہ العلوم کے مقصد قیام پرایک معترض کا جواب دیتے ہوئے

---

(۱) خطبات سرسید، مرتبہ اسمعیل پانی پتی، جلد۲۔ مجلس ترقی ادب لاہور، ب ت۔ ص۲۸۵-۸۶

لکھا ہے کہ :

''جناب من! آپ نے مقصد مدرستہ العلوم پر غور نہیں فرمایا اس کا مقصد تو یہ ہے کہ مسلمان علوم وفنون میں ایسی تعلیم پا جاویں کہ بلا ذریعہ نوکر خود اپنے بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور چونکہ مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لئے مستقل مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔''(۱)

سرسیّد کا مقصد ہی تعلیم تھا جس نے ان کے تصور کو وسعت و جامعیت عطا کی ان کے افکار و خیالات اور تعلیمی مِشن کے مختلف مراحل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوگی کہ وہ ایک ایسے نظام تعلیم کے داعی والم بردار تھے جس میں قدیم و جدید دونوں کا امتزاج پایا جائے اور جس میں مشرق و مغرب دونوں کی روایت کا پرتو نظر آئے۔ بلا شبہ وقت کے تقاضوں اور نئے زمانہ کی ضروریات کے تحت سرسیّد کے تعلیمی تصورات میں جدید تعلیم خصوصی حیثیت حاصل تھی اور ایم۔ اے۔او۔کالج کی درسیات میں عصری علوم فنون کی اہمیت اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ان کی نگاہوں سے کبھی اوجھل نہ ہوئی۔ سرسیّد نے اپنے ایک خطبہ میں جدید تعلیم کے اہتمام پر زور دینے کے بعد مشرقی تعلیم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ :

''اسی کے ساتھ ہم کو عربی کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے جو قطعہ نظر اس کے وہ مسلمانوں کی زبان ہے ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی زبان ہے جس کی قدر کی جاسکتی ہے اور کسی طرح علمی زبان کے دائرہ سے علیحدہ نہیں رہ سکتی اور مسلمانوں کی ضروریات

---

(۱) مکاتب سرسیّد احمد خاں (مرتبہ مشتاق حسین خان) فرینڈ بک ہاؤس، علی گڑھ، ص ۱۶-۳۱۵

سے خارج نہیں رہ سکتی...... مسلمانوں کو مذہبی تعلیم دینا بھی ادنیٰ
درجہ کی یا اوسط درجہ کی یا اعلیٰ درجہ کی ہم پر فرض ہے کیونکہ مختلف
اقوام کو جس چیز نے ایک قوم بنا دیا ہے وہ صرف اسلام ہے اگر
ہم اس کی فکر نہ رکھیں تو وہ قومیت قائم نہیں رہ سکتی۔''(۱)

سر سیّد کے تہذیب الاخلاق کے مضامین میں بھی مندرجہ بالا خیالات کی روشنی ملتی ہے جن کے مطالعہ سے یہ بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسا جامع و وسیع تصور علم رکھتے تھے انہوں نے اپنے اسی تصور علم کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۷۰ء میں شائع شدہ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس کا چھوٹا سا ٹکڑا املاحظہ ہو۔

''ہر ضلع میں کم سے کم ایک مدرسہ قائم کرنا چاہئے جن سے ہر قسم
کے مطلب و مقاصد پورے ہوں کیونکہ تمام لوگوں کے مقاصد
ایک ہی سے نہیں ہوتے اگر کوئی شخص مولوی، محدث وفقیہ بننا
چاہے تو مولوی بننے کا موقع بھی اس میں موجود ہو۔ اگر کوئی
شخص بڑا ریاضی داں بننا چاہے تو وہ بھی اس میں اپنا مقصد
حاصل کر سکے اور اگر کوئی شخص علوم و زبان انگریزی میں تحصیل
کامل کرنا اور عہد ہائے جلیلہ گارنمنٹ کو حاصل کرنا چاہے تو وہ بھی
کر سکے۔ جب ایسا انتظام اور سلسلہ قائم ہو جاوے گا تب
مسلمانوں کی تربیت دینی اور دینوی ترقی کی توقع ہوتی
ہے۔''(۲)

(۱) خطبات سر سیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۵۰۔۲۴۵
(۲) ایضاً ص ۲۵۶

مسلمانوں میں علوم وفنون کے فروغ اور تعلیم کی اشاعت کے لئے سرسیّد نے جومہم چلائی اس کا اصل مظہر مدرسہ العلوم تھا۔ دراصل سرسیّد ایسا مدرسہ قائم کرنا چاہتے تھے جو تین مدرسوں پر مشتمل ہو، اول وہ جس میں انگریزی پر خاص زور دیا جائے اور تمام علوم وفنون انگریزی زبان میں پڑھائے جائیں۔ دوم وہ جس میں جملہ علوم وفنون کے لئے اردو ذریعہ تعلیم ہو البتہ ہر طالب علم تین زبانوں (انگریزی، عربی و فارسی) میں سے ایک بطور ثانوی زبان اختیار کرے۔ تیسرا عربی اور فارسی کا مخصوص مدرسہ جس میں اول الذکر دونوں مدرسے کے وہ فارغین حاصل کریں جو عربی و فارسی اور متعلقہ علوم میں امتزاج پیدا کرنا چاہتے ہوں۔

سرسیّد احمد خاں نے ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۷۷ء میں اس نے ایم۔اے۔او۔کالج کی شکل اختیار کی اور ۱۹۲۰ء میں یہ مسلم یونیورسٹی بن گئی۔ اس ادارہ میں شروع سے ہی جدید تعلیم کے ساتھ عربی و فارسی، زبان وادب، منطق وفقہ، دینیات وتمدن جیسے مضامین اس کی درسیات کا حصہ بنے اور السینہ مشرقیہ متعلقہ مضامین کی تعلیم کے اہتمام کے لئے اورینٹل ڈیپارٹمنٹ (شعبہ علوم مشرقیہ) قائم ہوا۔ ویسے سرسیّد کے ذہن میں دینیات کی تعلیم کا بہت ہی وسیع و جامع تصور تھا۔ وہ دینیات کی تعلیم میں نیا پن پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ دینیات کی تعلیم سے ان کی مراد تفسیر، حدیث، فقہ، وصول حدیث، وصول تفسیر، علم عقائد، علم تعلیم کا اہتمام تھا۔ انہوں نے دینی تعلیم میں جدیدیت لانے کی کوشش کی لیکن اس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوسکے۔

دینیات کے علاوہ عربی و فارسی زبان وادب کی درسیات میں بھی سرسیّد جدت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ان مضامین کی تعلیم سے مراد محض مختلف زبانوں کی واقفیت پہنچانا نہیں بلکہ وہ چاہتے تھے کہ ان مضامین کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ طلباء میں زبان کی اصلیت اس کی نشونما اور

تاریخ کے گہرے مطالعے کا ذوق بڑھے اوران میں تنقیدی شعور بیدار ہو۔

سرسیّد درسیات میں جدید علوم کے ساتھ قدیم علوم کی شمولیت کے بھی قائل تھے۔لیکن وہ اس بات پر خاص زور دیتے تھے کہ قدیم علوم بھی نئے انداز اور جدید اسلوب کے مطابق پڑھائے جائیں تاکہ نظام تعلیم میں ہم آہنگی قائم رہے اور معاشرہ کی نئی ضروریات کی تکمیل کے لئے ان علوم کی صلاحیت کو بہتر طور پر استعمال کیا جا سکے۔

مجموعی طور پر سرسیّد کے خطوط،خطبات ومقالات کے مطالعہ سے ان کی یہ خواہش وکوشش نمایاں ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے فروغ کے لئے مختلف حلقوں سے کوشش کی جائے۔اوران سب میں آپس میں نہ صرف تال میل ہو بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ بھی فروغ پائے۔مدارس میں دینی تعلیم کے حصول کو اصل مدعا قرار دیا جائے۔

انگریزی زبان اور عصری علوم کے کچھ منتخب مضامین جزوی طور پر شامل نصاب کئے جائیں۔عصری تعلیم گاہوں میں جدید علوم وفنون پر خاص توجہ صرف کی جائے اوراس کے ساتھ السِنہ مشرقیہ اورعلوم اسلامیہ کی تعلیم کا خاص انتظام کیا جائے۔

دینی مدارس کے طلبا کو یونیورسٹیوں یا اعلیٰ تعلیم کے جدید اداروں میں تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں اورعصری جامعات کے طلبا کے لئے دینی علوم میں اختصاص وامتیاز کی خاطر دینی مدارس میں تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔

سرسیّد تعلیم میں مکمل آزادی کے قائل تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی تعلیم ان کے ہاتھ میں رہے وہ خود اپنی تعلیم کے مالک ہوں اور بغیر کسی مداخلت کے اپنی قوم میں علوم وفنون کو فروغ دیں۔چنانچہ انڈین ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا :

''جب تک لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت

مناسب طور پر ان کی تعلیم کا ہونا ممکن نہیں ہے ...... تعلیم کو حکومت کی گرفت سے آزاد ہونا چاہئے ۔''(۱)

تعلیم کے سلسلے میں سر سیّد کا یہ خیال ہی کچھ اہم نہیں ہے کہ مسلمانوں کو اپنے بچوں کی تعلیم کا خود اپنا نظم قائم کرنا چاہیئے ۔ اس حقیقت کے باوجود سر سیّد نے جدید علوم وفنون کے حصول اور مغربی طرز تعلیم اپنانے پر خاص زور دیا ۔ انہوں نے بہت واضح انداز میں یہ خیال پیش کیا کہ مسلمانوں کی تعلیم کا مقصد صحیح معنوں میں اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب ان کا نظم خود انکے ہاتھوں میں ہو اور جب تک وہ تعلیم کو اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گا اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے ۔ انہیں اس سے بھی اتفاق نہیں تھا کہ مسلمان اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں تعلیم کے لئے بھیجیں ۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کو سخت ناپسند کرتے تھے بلکہ مسلمانوں کے لئے باعث شرم سمجھتے تھے ۔ ایسا نہیں ہے کہ سر سیّد کا نقطۂ نظر صرف اسکولوں یا بچوں کی تعلیم تک محدود تھا بلکہ اعلیٰ تعلیم سے متعلق بھی یہی تصور رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ اس سطح پر بھی ان کا اپنا نظام تعلیم ہو جس پر نہ حکومت کا کنٹرول ہو اور نہ یونیورسٹی کی بالادستی قائم ہو ۔ وہ ۱۸۹۴ء میں جالندھر میں اپنی تقریر میں فرماتے ہیں:

''اے دوستو! ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے میں ہوگی ۔ یونیورسٹی کی غلامی سے ہمیں آزادی حاصل ہوگی ہم اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بے غیر یونیورسٹی کی غلامی کے ہم اپنی قوم میں علوم پھیلا دیں گے ۔ فلفسہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا اور نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الہ اللہ محمد رسول اللہ کا تاج سر پر ہوگا ۔''(۲)

---

(۱) علی گڑھ تحریک، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ص ۳۱۷، بحوالہ سر سیّد احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، پروفیسر عتیق احمد صدیقی

(۱) خطبات سر سیّد، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، جلد ۲۔ ص ۲۷۶

واقعہ یہ ہے کہ سرسیّد کا یہ اپروچ ان کے اصل تصور تعلیم سے جڑا ہوا ہے۔ سرسیّد کے تصور تعلیم میں قدیم وجدید دونوں کی جھلک ملتی ہے اور مشرقی ومغربی روایات کا پرتو پایا جاتا ہے اور ان سب سے اہم یہ کہ اس کا مقصد قومی وملی زندگی کی تعمیر قرار دیا گیا ہے اس تصور کو صحیح معنوں میں اسی وقت عملی جامعہ پہنایا جاسکتا ہے جب تعلیم کا انتظام خود مسلمانوں کے اپنے ہاتھوں میں ہو اور حکومت یا بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو۔ سرسیّد کے خیال میں حکومت کے تعلیمی اداروں سے تعلیم کا وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا ہے جو اصلاً اس سے مطلوب ہے اس لئے ان اداروں میں تعلیم کا خاص مقصد طلبا کو سرکاری ملازمت کے لئے تیار کرنا یا ان کے معاشی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل بنانا ہوتا ہے۔ وہاں ارباب اقتدار کو نہ تو طلبا کی تربیت سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ ان کی اخلاقی زندگی کی تعمیر کی کوئی فکر ہوتی ہے۔

مزید برآں سرسیّد نے جہاں مدرستہ العلوم کے قیام کی ضرورت وافادیت پر روشنی ڈالی ہے وہاں بھی اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے کہ ان کے ذہن میں جو تعلیم کے اغراض ومقاصد ہیں وہ سرکاری اداروں سے پورے نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ضرورت پیش آئی کہ ایک نیا مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جائے اور جس میں تعلیم کے ساتھ تربیت اور علمی ترقی کے ساتھ اخلاقی زندگی کی تعمیر کا بھی اہتمام ہو۔ ایم۔ اے۔ او۔ کالج کے قائم کرنے کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ طلبا مختلف علوم وفنون کو نئے ڈھنگ اور جدید اسلوب کے مطابق حاصل کریں ان میں مطالعہ وتحقیق کا وہ ذوق چڑھے جو مغرب میں پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کالج کی زندگی میں ان کے اندر وہ ڈسپلن قائم ہو اور اصول وضوابط کی پابندی پیدا ہوجائے جن کا مشاہدہ وہ خود آکسفورڈ وکیمبرج کی یونیورسٹیوں میں کرچکے تھے۔ اس مقصد کے تحت سرسیّد نے کالج میں ہندوستانی اساتذہ کے ساتھ یوروپین اسٹاف بھی مقرر کیا اور درس وتدریس کے کام میں بھی

مشرقی و مغربی روایات کو فروغ دینا چاہا۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہندوستانی و یورپین اساتذہ کے باہمی میل جول و تعلقات کے زیر اثر بھی جدید و قدیم تعلیم کے امتزاج کو وسعت دینی چاہی۔ اس انتظام سے نہ صرف مشرقی علوم وفنون کے ماہرین کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے سہنے کا موقع فراہم ہوا بلکہ وہ ایک دوسرے کی علمی خدمات و تحقیقات سے مستفید بھی ہوئے۔ دراصل سرسیّد کا منتہائے مقصود مسلمانوں میں مختلف علوم وفنون کی اشاعت عصری تعلیم میں دلچسپی پیدا کرنا اور علمی و تحقیقی ذوق کو فروغ دینا تھا۔ اس راہ میں انہیں جو چیز مفید و مناسب نظر آئی (خواہ اس کا تعلق مشرق سے ہو یا مغرب سے) اسے قبول کرنے سے گریز نہیں کیا بقول خلیق احمد نظامی :

> ''وہ چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کو باقی رکھا جائے لیکن مغرب کی بھی کسی چیز کے حاصل کرنے میں گریز نہ کیا جائے۔''(۱)

سرسیّد احمد خاں کے نزدیک ایسی تعلیم بالکل بے سود تھی جس سے عقل انسانی کو شگفتگی و شادابی اور اس کے روحانی واندرونی قویٰ کو توانائی حاصل نہ ہو جب عقل انسانی کو شگفتگی حاصل ہوگی تو وہ انسانی مسائل پر غور کرے گی، ان کا حل تلاش کرے گی، انسانوں کی مشکلات کو دور کرے گی، اس کے لئے آسانیاں و آسائشیں فراہم کرے گی، اس کی مادی قوتوں کی تکمیل کرے گی، قدرت کے چھپے ہوئے خزانوں تک رسائی حاصل کرے گی، قدرت کے عطیات کو نعمت تصور کر انکی قدر کرے گی، ان کے صحیح استعمال کا پتہ لگائے گی، اس کی نت نئی صورتیں بخشے گی اور ان کو مفید سے مفید بنائے گی جیسا کہ عتیق احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ :

> ''سرسیّد تعلیم کو زندگی کے نشو ونما کے ساتھ جوڑنا چاہتے تھے یعنی

---

(۱)''سرسید اور علی گڑھ تحریک''، خلیق احمد نظامی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۴

تعلیم کو زندگی کے نشو نما میں معاون ہونا چاہئے ۔ انہوں نے تعلیم کو مشرق اور مغرب کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ جمود و حرکت، زوال و ارتقاء اور پس روی و پیش روی کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس تعلیم کے داعی و نقیب ہے جو جمود کے بجائے حرکت، زوال کے بجائے ارتقاء اور پس روی کے بجائے پیش روی میں مددگار ہو اس سے ذہن کے دریچے کھلے، مخفی صلاحیتوں کے سر بند چشمے اس سے جاری ہوسکیں، اس سے نظر میں وسعت و بلندی پیدا ہو، وہ توانائی پیدا ہو جو قدرت میں بکھری ہوئی نعمتوں کو اپنے قابو میں لاسکے، حسن تدبیر کا وہ فن حاصل ہو جو مضرات کا دفعیہ کر سکے، جس سے تمام قوم کی آسودگی اور شائستگی اور اقبال کو ترقی ہو۔ نیز عمدہ ہنر اور فن اور نیک اخلاق وغیرہ قوم کو حاصل ہوں۔"(۱)

سر سیّد نے تعلیم کے حصول کے لئے دو چیزوں کو ضروری قرار دیا اول یہ کہ ایسی نصاب تشکیل دی جائے جو مختلف علوم فنون کا جامع ہو یا جس میں قدیم و جدید تعلیم کا امتزاج پایا جائے دوسرے یہ کہ تعلیم کے ساتھ طلباء کی مذہبی و اخلاقی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ سر سیّد اسی نقطۂ پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

"ہم کو گزشتہ و حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقہ متعین کرنا چاہئے جس سے علم دین و دنیاوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔"(۲)

(۱) فکر و نظر، سر سیّد نمبر، اکتوبر، ۱۹۹۲ء لیتھو آفسیٹ، اچل تال، جی ٹی روڈ علی گڑھ، ص ۲۳

(۲) مقالات سر سیّد، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۱۱-۳۱۰

سرسیّد نے اسی جامع تصور کو اپنے قائم کردہ ادارہ مدرستہ العلوم یا ایم۔اے۔او۔کالج میں پوری طرح جلوہ گر کرنے کی کوشش کی۔اس میں شک نہیں کہ جدید دور کے مطالبات اور نئے دور کے تقاضوں کے تحت انہوں نے اس ادارے میں جدید تعلیم کو زیادہ اہمیت دی اور اس کی درسیات میں اصل علوم وفنون کا حصہ غالب رکھا۔لیکن مشرق و مذہبی علوم وفنون کی تعلیم کے اہتمام سے وہ کبھی غافل نہ رہے۔انہوں نے شروع سے ہی ایم۔اے۔او۔کالج کے نصاب میں جدید علوم کے ساتھ عربی و فارسی زبان وادب، منطق وفقہ، دینیات واسلامی تاریخ وتمدن جیسے مضامین کو شامل کیا ان کی تدریس کا باقاعدہ انتظام کیا۔یہ سب کچھ اس لئے بھی تھا کہ سرسیّد مسلمانوں میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین کو پیدا کرنا چاہتے تھے۔جو مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتیں نمایاں کرسکیں۔جو جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ قدیم علمی وثقافتی ورثہ کی بھی حفاظت کرسکیں۔

سرسیّد کا تصور تعلیم بڑا ہی جامع اور ہمہ گیر تھا وہ ایک ایسا صالح اور فعال تصور رکھتے تھے جو فرد کو اجتماعی زندگی کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بناتا ہو۔وہ ایسے افراد تیار کرتا ہے جو معاشرتی زندگی میں بوجھ نہیں ہوتے بلکہ اس کے لئے افادیت کے حامل ہوتے ہیں اس ضمن میں سرسیّد کا خیال تھا کہ :

''انسان کی روح بغیر تعلیم کے اس چتکبرے سنگ مرمر کے چٹان کی مانند ہے جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا اس کو تراش کر شڈول نہیں بناتا اس کو پالش اور حلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اس میں چھپے رہتے ہیں اور اس کی خوشنمائی سے اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے

ظاہر نہیں ہوتے یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل
کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس
وقت تک ہر نیکی اور ہر قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی
ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر
نہیں ہوتیں۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی و ابدال، نیک و
عقلمند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے
ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ
ظاہر ہوتی ہیں۔ وحشی قوموں پر بھی اچھی باتیں ہوتی ہیں لیکن
ان کی وحشیانہ نیکیاں نہایت ناشائستہ اور نامہذب طور سے
ظاہر ہوئی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں
ان سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں نیکیاں
دیکھتا ہوں پر ناشائستہ ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا
ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قومی استقلال دیکھتا ہوں
پر بے دھنگا، ان میں صبر و قناعت بھی ہے اور غیر مفید اور بے
موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان
کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین و
دنیا دونوں کے لئے کیسی کچھ مفید ہوں۔'' (۱)

تعلیم سے سرسیّد احمد خاں کا مقصد قوم کی ذہنی سطح کو بلند کرنا اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا
تھا۔ وہ مغربی تعلیم کو سائنسی علوم کے حصول کو ضروری سمجھتے تھے اور اس کے تجربی ہونے کی طرف

(۱) تہذیب الاخلاق، سرسیّد نمبر، جلد ۱۸، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹

اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجد اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل سے اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہے اور ان کو تسلیم نہ کرے۔ مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانے کے فلسفہ اور حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربے سے ثابت کئے جاتے ہیں اور ہم کو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھادیئے جائیں۔''(۱)

سرسیّد احمد خاں نے اپنے دور کے ہندوستان کے تمام سیاسی، سماجی اور معاشی خرابیوں کا علاج تعلیم میں پایا۔ انہیں یقین تھا کہ لوگ تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی اور اگر ایسا نہیں ہوا تو لوگ غیر مہذب زندگی جینے پر مجبور ہو جائیں گے وہ ایسا نظام تعلیم چاہتے تھے جو عوام کے لئے ہو اور قوم کا ہر ایک بچہ پڑھنے لکھنے کی سہولت سے محروم نہ رہ سکے۔ ان کی نظر میں انفرادی تعلیم کے بجائے قومی تعلیم کی زیادہ اہمیت تھی۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

''جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں۔ بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی اولاد میں تعلیم و تربیت کی فکر کرنی کافی ہے مگر یہ

---

(۱) سرسیّد کے لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ سراج الدین، قومی بازار کشمیر، ۱۸۹۰ء، ص ۲۸

ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے
۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوئی ہے جب تک تمام شہر اس
سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔
کسی علم کے پڑھ لینے سے انسان تربیت یافتہ نہیں ہو جاتا جب
تک کہ اس کے لئے ایک بہت بڑا گروہ اس کے ہم جنسوں کا
جس میں اس کا میل جول ہو تربیت یافتہ موجود نہ ہو۔ پس
خوب سمجھ لو کہ جو شخص قومی تعلیم و تربیت پر متوجہ نہ ہو گا درحقیقت
اپنا اور اپنی اولاد کا نقصان کرے گا۔''(۱)

اجتماعی اور قومی تعلیم کا تصور جو آج عام ہے اس کے زمانے میں بالکل اجنبی اور نیا تھا لیکن انہوں نے بہت پہلے اس کی معنویت تسلیم کر لی تھی۔ وہ مدرسوں اور کالجوں کی مروجہ تعلیم کو کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ کتابی اور روایتی ہوتی تھی۔ وہ ایسے مدارس کی ضرورت پر اصرار کرتے تھے جو مفلس محتاج اور نالائق بنانے کے بجائے انسان میں قومی، وطنی اور ملی شعور کی نشو ونما کر سکے اور یہ صرف لائق اور صاحب کردار اساتذہ کی نگرانی میں ممکن ہے۔

سر سیّد احمد خاں نے تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑا۔ انہوں نے تعلیم اور انفرادی زندگی کے حوالے سے سماجی اور اقتصادی پہلو پر زور دیا۔ اور اسے معاشی بہبود کا ذریعہ قرار دیا۔ انہوں نے سرکاری ملازمتوں اور حکومت کے دفاتر چلانے کے لئے بابو تیار کرنے پر قناعت کرنے کے بجائے تجارت اور دوسرے پیشوں کو ترجیح دی اور ان کے حاصل کرنے کی ترغیب دلائی۔ تا کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ کمپنیاں قائم ہوں اور اس سے ملک کی اقتصادی حالت بہتر بن سکے۔

سر سیّد احمد خاں کا یہ خیال تھا کہ تعلیم کا بندوبست خود ہندوستانی جب تک اپنے ہاتھ میں نہ

(۱) مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، طبع ۱۹۳۷ء، ص ۱۵

لیں گے تب تک اس کا انتظام قابل تسفی نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لے اسوقت تک اس کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ سر سیّد کے خیال میں :

> ''تعلیم سے ہماری مراد موافق عرف عام کے لکھنا پڑھنا سیکھنے سے ہے ہر زمانہ میں لاکھوں کروڑوں آدمی مختلف مقاصد سے لکھنا پڑھنا سیکھتے رہے ہیں۔
>
> عام مقصد جس کے سبب سے تعلیم پر توجہ ہوتی ہے خواہ تعلیم پانے والے خود اس پر متوجہ ہوں یا اطفال کے مربیوں نے اطفال کی تعلیم پر توجہ کی ہو۔ یہ ہے کہ ان کے ذہن میں سمائی ہوئی ہوتی ہے کہ ایک جاہل خندۂ ناتراش سے پڑھا لکھا آدمی زیادہ بہتر ہوتا ہے اور وہ تعلیم جس درجہ کی ہوتی ہو زندگی کے کاروبار میں اس کے لئے نہایت مفید اور کار آمد ہوتی ہے۔''(۱)

سر سیّد تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی ہر طرح سے ترقی چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک قومی ہمدردی اور تعلیم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کے بغیر اپنے مفہوم میں مکمل نہیں ہوتے۔ وہ دینی علوم کے فروغ کے بھی خواہش مند تھے مگر انہوں نے اپنا سارا زور جدید تعلیم پر صرف کیا ان کا خیال تھا کہ اس میں مہارت حاصل کرنا وقت اور حالات کا تقاضہ ہے حالانکہ مسلمان اسوقت انگریزوں سے سخت بیزار تھے وہ سمجھتے تھے کہ انگریزی اور جدید علوم کی تعلیم مسلمانوں کو گمراہ کر دے گی۔ اور اسی خیال کے سبب سر سیّد کو سخت پریشانیاں اٹھانی پڑیں اور لوگوں نے ان کو ملحد،

---

(۱) مضامین سر سیّد، مع تبصرہ از نسیم قریشی۔ مرتبہ عزیز الدین اختر، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، ب ت۔ ص ۶۵

کافر کہہ کر پکارا مگر اس مرد درویش کے پائے استقامت میں ذرّہ برابر بھی لغزش نہیں آئی۔

سر سیّد کی تعلیمی تحریک کے کئی مقاصد تھے اولاً وہ یہ چاہتے تھے کہ قدیم روایتی تعلیم اور اس کا نظام فرسودہ ہو چکا ہے جدید تحقیقات اور نئی روشنی دور دور تک دکھائی نہیں دیتی جب کہ جدید تعلیم میں سائنس کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اسی سے مادی ترقی کی بھی راہیں کھل جاتی ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہئے۔ اس زمانے کی تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے اس کے لئے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن میں مہارت حاصل کر سکے۔ انہوں نے جدید علوم کو جو اصل میں مسلمانوں سے سیکھے ہوئے علوم کی ترقی یافتہ شکل میں ہیں دوبارہ حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> ''جن لوگوں نے ہم سے علم لئے ہیں اور ان کو ترقی دی ہے اب ہم ان سے وہی علوم لیں اور ان کے سیکھنے میں کوشش کریں ہماری آئندہ نسلوں کو اور ہمارے واسطے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے اور ایسا ہی کرنا ہم پر لازم ہے تاکہ ہم جدید علوم سیکھیں جن میں کہ روز بہ روز ترقیاں اور کارآمد چیزیں موجود ہیں۔'' (۱)

سر سیّد کے تصور تعلیم کا دوسرا اہم ترین عنصر یہ تھا کہ تعلیم کے ساتھ طلباء کے تربیت کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے اس بات میں ان کا واضح موقف یہ تھا کہ ایک جامع نصاب کے مطابق عمدہ سے عمدہ تعلیم کے ساتھ اگر تربیت کا اہتمام نہیں ہے تو وہ تعلیم مفید نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے شخصی و قومی زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ جو اس سے اصلاً مطلوب ہے ان کی نظر میں اس مقصد سے ہم کناری کے لئے تربیت کو وہی مقام حاصل ہے جو جسم کے لئے جان کی ہے۔ سر سیّد کا نقطۂ نظر ان

---

(۱) مضامین سر سیّد، مع تبصرہ از نسیم قریشی، ص ۲۵

کی ایک تقریر کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے :

''یہ حالت تو صرف تعلیم کی تھی مگر صرف تعلیم سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ کیا صرف تعلیم سے انسان انسان بن جاتا ہے؟ اور ''کمسل الحمار یحمل الاسفارا'' سے زیادہ مرتبہ پا سکتا ہے؟ کیا صرف تعلیم سے قوم قوم بن جاتی ہے؟ کیا صرف تعلیم سے قوم دنیا کی قوموں میں عزت پا سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ جب تک وہ انسان نہ بنے اور قوم قوم نہ بنے اس وقت تک موجز نہیں ہوسکتی۔ پس ہم مسلمانوں کو تعلیم سے زیادہ وہ چیز کرنی ہے جس کو ہم تربیت کہتے ہیں اور جو قوم کو قوم بننے کے لئے ایسی ہے جیسے جان بدن کے لئے۔ اور بے غیر اس کے قوم کا قوم بننا محالات سے ہے۔'' (۱)

اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سرسیّد تربیت کو تعلیم کا لازمی عنصر تصور کرتے تھے اور وہ اس میں یقین رکھتے تھے کہ اس کے بغیر نہ تو صحیح طرز پر انفرادی زندگی کی تعمیر ممکن ہے اور نہ اجتماعی زندگی کی تشکیل اور سماجی وثقافتی ترقی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوسکتا ہے۔ وہ برملا کہتے تھے کہ جدید علوم وفنون کا اکتساب یا بی۔اے یا ایم۔اے کی ڈگری کا حصول ایک شخص کو مہذب بنانے اور اسے سماج میں عزت و وقعت کا مقام دلانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک کہ اسے ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے، بات چیت، باہمی سلوک وتعلقات اور مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ نہ آجائے۔ اور یہ چیز تربیت ہی سے ہاتھ آسکتی ہے۔

اس طرح سرسیّد طلبا کی تربیت کے ضمن میں بہت ہی وسیع و جامع تصور رکھتے تھے اس سے

(۱) خطبات سرسیّد جلد دوم، ص ۲۵۰

ان کی مراد ذہنی وجسمانی، تحریری وتقریری، مذہبی واخلاقی، معاشرتی ومعاشی، مختلف امور میں طلبا کی صحیح رہنمائی اوران کی عملی مشق ہے۔ان کی نظر میں طلبا کی صلاحیتوں کو صحیح رخ عطا کرنا اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے انہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھانا اس تربیت کا خاصا ہے۔تعلیم کے ساتھ تربیت پر زور دینے سے ان کا مقصود یہ تھا کہ طلبا استادوں اور کتابوں کے ذریعہ جو کچھ اچھی باتیں سیکھیں انہیں روزمرہ کی زندگی میں برتنے کی عملی مشق کرائی جائے تا کہ وہ نہ صرف علوم و فنون کے ماہر بن کر نکلیں بلکہ ایک با اخلاق و باکردار انسان اور مہذب ومتمدن ہستی کی حیثیت سے بھی معاشرے میں اپنا مقام بنا سکیں اور ملک وملت کے لئے بہتر ومفید خدمات انجام دے سکیں۔وہ تعلیم کو علم کے کسی خاص دائرے میں محدود کرنے کے مخالف تھے اس طرح تربیت سے متعلق ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کسی ایک اور بعض امور میں طلبا کو تربیت دینے سے اس کا اصل مقصد پورا نہیں ہوسکتا ہے۔سرسیّد نے مختلف مواقع پر اس حقیقت سے مسلمانوں کو روشناس کرایا۔جہاں تک جدید تعلیم یا سائنسی علوم کے اکتساب کا تعلق ہے اس کا بخوبی اہتمام مختلف سرکاری اسکولوں و کالجوں میں موجود ہے اوران کے دروازے مسلم طلبا کے لئے کھلے ہوئے ہیں لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے۔ایم۔اے۔او کالج کے قیام کی ضرورت اسے لئے پیش آئی کہ ان میں مسلمانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔دوسرے وہاں تعلیم کے ساتھ تربیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا ہے یا اگر ہے تو کسی خاص میدان یا محض امور معاش میں طلبا کی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے اس ضمن میں سرسیّد فرماتے ہیں کہ :

''ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اوراس
کے عقل اور ذہن میں ایک جدت پیدا ہوتا کہ جو امور پیش
آئیں ان کو سمجھنے کی بھلائی برائی جاننے کی اور عجائب قدرت

الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست
ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دیں اور
امور معاد پر غور کرے۔ گورنمنٹ کا یہ کہنا ہے کہ ہم کو تربیت
سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اسقدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور
معاش سے علاقہ رکھتی ہے اور جو منحصر ہے۔ صرف جغرافیہ،
حساب اور ہندسہ پر نہایت بیجا ہے۔''(۱)

سرسیّد کو بخوبی اس بات کا احساس تھا کہ حکومت کے قائم کردہ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم دونوں کی کفالت تھی۔ اس لئے انہوں نے بار بار اہل قوم کو اس جانب متوجہ کیا کہ وہ خود اس اہم مسئلہ پر غور کریں اور اس کا حل نکالیں۔ سرسیّد کی نظر میں اس کا واحد حل یہ تھا کہ مسلمان خود اپنا جامع نظام تعلیم و تربیت مرتب کریں اور انہیں عملی شکل دینے کے لئے اپنے اسکول و کالج قائم کریں۔ اسی ذریعہ سے وہ ایسا نظام تعلیم جاری کر سکتے ہیں جہاں ان کی مرضی کے مطابق طلباء کو مختلف علوم وفنون کو اکتساب کی سہولتیں فراہم ہونگی اور دینی تعلیم و تربیت کا بھی اہتمام ہوگا ورنہ محض حکومت کے بل بوتے پر یا کسی اور کے سہارے ایسا نظام تعلیم جاری نہیں ہوسکتا جو مسلمانوں کے لئے مفید ہو۔ وہ اس مسئلے پر لوگوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''اب اور کیا تدبیر ہے جس سے مسلمانوں کی بہتری اور بہبودی
ہو اور ان میں عمومی تعلیم کا رواج ہوا اور اعلیٰ قسم کے مفید علموں
کی خواہ وہ مذہبی ہوں یا دنیاوی بنیاد پر قائم ہے۔ ہر شخص اس کا
جواب دے سکے گا کہ ایک ہی تدبیر باقی ہے اور وہ ہے کہ ہم

(۱) ''سرسید اور علی گڑھ تحریک''، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ص۱۱۰

خود اپنی تعلیم وتربیت پر مستعد وآمادہ ہوں۔''(۱)

سرسیّد نے نہ صرف یہ کہ تعلیم کے ساتھ اہمیت وافادیت کو واضح کیا بلکہ اس کے لئے لائحہ عمل بھی پیش کیا۔ ان کی نظر میں تربیت کا بہترین وموثر ذریعہ طلبا کے لئے اقامتی زندگی کا اہتمام اور دارالاقامہ کا قیام ہے۔ اس لئے کہ اس نظام کے ذریعہ طلبا کو ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، کھیلنے کودنے اور مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیتیں نمایاں کرنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ اقامتی زندگی اختیار کرتے ہوئے ان میں خود عملی طور پر برتنے کا سلیقہ نشو ونما پاتا ہے۔ دوسرے باصلاحیت وتجربہ کار اساتذہ کی نگرانی سے مختلف امور میں ان کی تربیت کے مراحل بخوبی انجام تک پہنچتے ہیں۔ سرسیّد نے دارالاقامہ یا بورڈنگ ہاؤس کو ایک مشین سے تعبیر کیا ہے جو قوم کے لئے کارآمد افراد تیار کرتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ طلبا ہی اس مشین کے پرزے ہیں اس لئے اس کی مشین کی بہتر کارکردگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے پرزے ٹھیک ٹھاک چلیں۔

سرسیّد کے نزدیک طلبا کی ترتیب میں اقامتی زندگی کو کس قدر اہمیت حاصل تھی اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اسے ایک کتاب سے تعبیر کیا جسے پڑھنا وسمجھنا اور بحفاظت رکھنا اور استعمال میں لانا یا اس سے بھرپور استفادہ کرنا ہی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کا اصل مقصد ہے اور بہت واضح انداز میں متنبہ کیا کہ اگر کسی نے اس کتاب سے ناقدری کی تو تعلیم کے میدان میں اس کی ساری تگ ودو کا کچھ حاصل نہ ہوسکے گا اور اس کی زندگی بالکل بے مصرف ہو کر رہ جائے گی۔ اس ضمن میں سرسیّد کا خیال ہے کہ :

''اے عزیزو! کالج لائف یائی زندگی یہی اصل کتاب ہے اور
اسی کا پڑھنا اور اس کا سمجھنا اصل فائدہ اور اصل مقصد زندگی کا

(۱) مقالات سرسیّد جلد ۸، ص ۱۰۵

اور اس کالج کا ہے۔ اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور
اچھی طرح رکھا اور داغدار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی
جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے ورنہ اس کی زندگی اور
موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔"(۱)

اگر سرسیّد نے خود بھی ایم۔ اے۔ او کالج میں اس کتاب کی فراہمی اور اس سے استفادے کے بہتر مواقع موثر کرنے کی بھرپور توجہ دی۔ جہاں انہوں نے ایک جانب اس ادارہ میں ایک جامع نصاب تعلیم جاری کیا اور مختلف مضامین کی تدریس کے لئے ماہر تجربہ کار اساتذہ مقرر کئے۔ جن میں ہندوستانی یورپین عصری علوم کے ماہرین اور مشرقی علوم وفنون کے ترجمان بھی تھے۔ وہیں دوسری جانب دارالاقامہ میں طلبا کی تربیت کا ایک وسیع نظام قائم کیا اور رہن سہن، چال چلن، خوردونوش، لباس و پوشاک، نماز روزہ، کھیل کود ہر معاملہ میں ان کی نگرانی کا بخوبی اہتمام کیا۔ مزید برآں مختلف انجمن کلب وسوسائٹی کے ذریعہ طلبا کو تحریری وتقریری میدان میں اپنی صلاحتیں پروان چڑھانے کے مواقع میسر کئے اور اسطرح ان کے لئے بہت سی ایسی غیر درسی معروضیات جاری کی جن سے ان کی ذہنی وجسمانی مختلف قسم کی صلاحیتوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ لیکن تربیت کے جس پہلو پر سرسیّد نے سب سے زیادہ زور دیا وہ طلبا میں ڈسپلن پیدا کرنا تھا اور انہیں ہر معاملے میں نظم وضبط کا خوگر بنانا تھا سرسیّد کے زمانے میں کالج و بورڈنگ ہاؤس میں تربیت کے اس وسیع نظام کو چلانے کے لئے باقاعدہ ایک پورا عملہ ہوتا ہے جس میں سب سے زیادہ اہم ذمہ داری کالج کے پرنسپل کی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مینیجر و نائب مینیجر بورڈنگ ہاؤس اور وارڈن وغیرہ اپنی اپنی سطح پر نگرانی کی خدمت انجام دیتے تھے اور ان سب سے قطع نظر سرسیّد کے قائم کردہ نظام تربیت کا امتیاز یہ تھا کہ طلبا اور کیمپس میں رہائش اختیار کرنے والے

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۲۶۰-۲۵۹

اساتذہ اس نظام میں شریک رہتے تھے اور اس کے کل پرزے بن کر ایک دوسرے کے تعاون سے ہاسٹل لائف کو اسطرح بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے کہ کالج کے طلبا تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے باب میں بھی مثال بن کر نکلیں اور خود اپنے اور ملک وملت کے لئے مفید ثابت ہو سکیں۔

کالج میں مختلف مضامین کی تدریس اور پرنسپل شپ کے لئے یورپین اساتذہ کی تقرری کا مقصد سرسیّد کو یہ تھا کہ طلبا عصری علوم بالخصوص انگریزی زبان کی بخوبی تحصیل کرسکیں۔قدیم علوم فنون کو نئے مزاج وآہنگ کے ساتھ سیکھ سکیں۔ان میں مطالعہ کا ذوق پروان چڑھے اور ان کے اندر اعلیٰ سطح کا ڈسپلن قائم ہو۔ یہ باب عام طور پر بہت ہی مقبول ہے کہ سرسیّد آکسفورڈ اور کیمبرج کے صورت حال سے کافی متاثر تھے اور وہ اپنے کالج میں بھی ان کا نمونہ دیکھنا چاہتے تھے۔لیکن یہاں پر یہ پہلو بھی غور طلب ہے کہ سرسیّد نے کالج میں ہندوستانی اساتذہ کی بھی تقرری کی اور تدریس و دارالاقامہ کی نگرانی وغیرہ کے لئے مشرقی علوم وفنون کے ماہرین کی خدمات بھی حاصل کیں۔ان میں مولوی محمد اکبر، علامہ شبلی، مولانا عبداللہ انصاری اور محسن الملک کے زمانے کے مولانا فراہی قابل ذکر ہیں۔ درحقیقت سرسیّد کالج میں مشرقی ومغربی دونوں روایات کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ ہندوستانی اور یورپین اساتذہ کے باہمی میل جول اور علمی ربط وتعاون سے اس تصور تعلیم کو عملی طور پر موثر بنانے کے خواہاں تھے جس کا سب سے نمایاں پہلو قدیم وجدید کا امتزاج تھا۔جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے کہ سرسیّد طلبا کی دینی واخلاقی تربیت کے نہ صرف قائل تھے بلکہ اس سے کالج کے تربیتی نظام کو ضروری جز تصور کرتے تھے۔انہوں نے بہت ہی واضح انداز میں اس پہلو پر توجہ دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''طلبا کے اخلاقی و مذہبی خیالات درست رکھنے کی فرائض منصبی

ادا کرنے کو اس ماحول کے ساتھ ایک یا دو مقدس عالم رکھنا چاہئے۔ جس کا اثر لوگوں کے دلوں پر ہوتا کہ اس کے فیض و صحبت سے ان کی طبیعتیں از خود نیکی و دینداری کی طرف مائل ہوں۔''(۱)

اس تصور کے تحت سرسیّد نے کالج میں دینیات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی واخلاقی امور میں طلبا کی نگرانی کا ایک مستقل نظم جاری کیا اور اس اہم کام کے لئے ناظم دینیات کا منصب قائم کیا۔ ناظم دینیات کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ وہ طلبا کی مذہبی واخلاقی زندگی کی پوری باریکی سے نگرانی کریں اور انہیں ایسی سہولیات بہم پہنچائیں کہ وہ کالج کے بعد کی زندگی میں دینی واخلاقی تقاضوں کو بحسن وخوبی پورا کرسکیں اور کالج کے بعد کی زندگی کے لئے اپنے آپ کو ایک بہ اخلاق انسان کی حیثیت سے تیار کرسکیں۔ اس ضمن میں یہ ذکر بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ طلبا کے عقائد درست رکھنے، ان کو نماز و دوسرے مذہبی فرائض کا پابند بنانے، روزمرہ کی زندگی میں قرآن وسنت پر رہنے، حسن واخلاق وحسن وسیرت سے مزین کرنے اور ان میں دینی جذبہ بیدار کرنے کے لئے سرسیّد نے ناظم دینیات سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ خاص طور سے ارشاد و تلقین وعظ ونصیحت اور پیمائش کا طریقہ اختیار کریں۔ مثال کے طور پر طلبا میں نماز کی پابندی کو کس طرح یقینی بنایا جائے نماز کے وقت حاضری اور غیر حاضری کے ساتھ تادیبی کاروائی کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں کہ :

''بہتر ہوگا کہ جو شخص حاضری لیتا ہے وہ ان کے نام سے جو بلا وجہ اکثر جماعت سے غیر حاضر ہوتے ہیں مولوی صاحب کو اطلاع کرے گا اور مولوی صاحب کسی وقت ان کو علیحدہ تخلیہ

---

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۲۵۱

میں بلا کر نصیحت کریں گے اور سمجھا دیں گے کہ نماز پڑھنی اور
جماعت میں شریک ہونا چاہئے ۔ اگر کچھ نہیں تو اس طریقے
سے شوکت اسلام اور شوکت جماعت مسلمانان ثابت ہوتی ہے۔
غرض کہ اس قسم کی مشفقانہ نصیحتیں بکار آمد ہوں گی۔''(۱)

مزید برآں طلبا کی دینی واخلاقی سرسیّد احمد خاں نے کالج میں درس قرآن کا سلسلہ بھی قائم کیا۔ یہ درس کلاس شروع ہونے سے قبل اسٹریچی ہال یا کسی بڑے ہال میں منعقد ہوتا تھا اور تقریباً نصف گھنٹہ جاری رہتا تھا۔ کئی برس تک یہ خدمت علامہ شبلی نے انجام دیا۔ بعد میں کچھ عرصہ تک ناظم دینیات نے بھی یہ خدمات انجام دیں۔ علامہ شبلی کا یہ درس بڑا مفید اور موثر ہوتا تھا اور طلبا بڑی دلچسپی سے اس میں شریک ہوتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر جو اس وقت کالج کے طالب علم تھے فرماتے ہیں کہ ان میں قرآن پاک کا ذوق اس زمانے کی یادگار ہے۔ شیخ محمد عبداللہ اس درس کے بارے میں اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''ہم لوگوں کا یہ معمول تھا کہ صبح کے وقت کالج شروع ہونے
سے قبل سب جماعتوں کے طالب علم اسٹریچی ہال یا کسی اور
بڑے ہال میں جمع ہو جاتے اور وہاں پر مولانا شبلی خوش الحانی
سے قرآن پاک کے کسی رکوع کی تلاوت فرماتے تھے اور
ترجمہ کر کے ہم لوگوں کو سمجھاتے تھے۔ اتنے میں کالج کی گھنٹی ہو
جاتی تھی اور ہم سب اپنی کلاس میں چلے جاتے تھے۔''(۲)

---

(۱) خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۱۷۵
(۲) مشاہدات وتصورات، شیخ محمد عبداللہ، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء، ص ۹۷

دینوی علوم کی طرح مسلمانوں کے خالص مذہبی علوم کی حالت بھی حد درجہ خراب تھی قرآن، حدیث اور فقہ کی جو تعلیم دی جاتی تھی وہ بالکل تقلیدی اور مصنوعی تھی قرآن مجید پر فکر کا دروازہ بند تھا جو کچھ طبری، اور بیضاوی نے لکھد یا وہ حرف آخر تھا۔ اس سے انحراف دین سے انحراف کے ہم معنی تھا۔ احادیث کی مذید جانچ پر کھ بھی ممنوع تھی۔ فقہی احکام نے احوال وظروف زمانے کے مطابق کسی ادنیٰ تبدیلی کا خیال بھی کفر کے مساوی تھا اس طرز فکر کی وجہ سے مذہبی علوم نہایت فرسودہ حالت میں تھی۔ صدیوں سے ان میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا اور اس کی وجہ محض پرانی تقلید تھا۔

سر سیّد چاہتے تھے کہ دینوی علوم کی طرح دینی علوم میں بھی تعقل وتفکر کی عادت مسلمانوں میں پیدا ہو۔ انہوں نے قرآن مجید کی جو تفسیر لکھی اسکا واحد مقصد ان کے اُذہان کو تقلید کی بھاری زنجیروں سے آزاد کرنا تھا۔ اپنی تفسیر کے لئے انہوں نے عقل اصول وضع کیا۔ وہ یہ تھا کہ ''فیچر ورک آف گاڈ قرآن مجید آف گاڈ''۔ Feature work of God Quran Majeed of God اس لئے دونوں میں عدم مطابقت نہیں ہوسکتی یعنی قرآن مجید میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو عقل انسانی اور قوانین فطرت کے خلاف ہو۔ نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں تفسیری اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''خواہ یہ تسلیم کرو کہ انسان خدا کی عبادت کے لئے پیدا ہوا خواہ یہ کہو کہ مذہب انسان کے لئے بنایا گیا دونوں حالتوں میں اتنا ضرور ہے کہ انسان میں بہ نسبت دیگر حیوانات کہ کوئی چیز ہو کہ وہ اس بار کو اٹھانے کا مکلّف ہو اور انسان میں وہ شئے کیا ہے عقل ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جو مذہب اس کو دیا جائے وہ عقل انسانی کے مافوق نہ ہو۔ اگر وہ عقل انسانی کے مافوق ہے تو انسان اس کا مکلّف نہیں ہوسکتا۔''(۱)

اس میں دورائے نہیں کہ قرآن کی تفسیر میں سر سیّد سے بعض فکری لغزشیں سرزد ہوئی ہیں جو ان کی حد

---

(۱) تہذیب الاخلاق، سر سیّد نمبر، جلد ۱۷، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۸ء، ص ۵۸

سے بڑھی ہوئی عقلیت کی دلیل ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں عقلیت اپنے نقطۂ عروج پر تھی اور سارے مغربی دنیا اس کے نشہ میں مخمور تھی۔ اہل علم بڑی سے بڑی بات کو بھی عقل کے میزان میں تولے بغیر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس عقلیت کا اثر سر سیّد کے ذہن پر بھی تھا اور اسی لئے ان کی تفسیر میں اعتدال کا رنگ غالب ہے لیکن ان کی تفسیری لغزشوں سے قطع نظر اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کی تفسیر نے اہل علم مسلمانوں کے منجمد ذہنوں کو متحرک کیا اور کورانہ تقلید کے بندھن کچھ ڈھیلے ہوئے اور یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ سر سیّد دینی اور دنیاوی علوم کی تفریق کے شدید مخالف تھے کیونکہ اس تقسیم سے دونوں طرح کے علوم مخلصین کے اخلاق کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

دنیاوی علوم کے فارغین کے اخلاق اس وجہ سے خراب ہوتے ہیں کہ وہ مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں جو انسان کے اندر نیک جذبات کی پرورش کا ایک بڑا وسیلہ ہے اور دینی علوم کے فارغین کے اخلاق اس وجہ سے فاسد ہو جاتے ہیں کہ ان کو مفید دنیاوی علوم نہیں پڑھائے جاتے جس کی وجہ سے ان کی معاشی حالت ابتر رہتی ہے۔ اس معاشی بدحالی سے ان کے خیالات وعزائم پست ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے سر سیّد نے مدرستہ العلوم کے بنیادی اغراض میں مذہبی تعلیم کو بھی داخل کیا تھا اور نہایت ولولہ انگیز اسلوب میں اس خیال کا اظہار کیا ہے :

> ''فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ نیچرل سائنس ہمارے
> بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہمارے سر پر۔'' (۱)

اوپر کی تمام تفصیلات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سر سیّد احمد خاں ایک بلند، وسیع و جامع تصور تعلیم کے داعی و علمبردار تھے۔ اس کا سب سے اہم عنصر یہ ہے کہ تعلیم کو ایک عظیم مقصد کے ساتھ جوڑا گیا اور وہ ہے انفرادی و اجتماعی زندگی کی تعمیر اور سماجی و ثقافتی ترقی۔

---

(۱) تہذیب الاخلاق، سر سیّد نمبر، جلد ۱۷، شمارہ ۱۰، ۱۹۹۸ء، ص ۵۸

دوسرے یہ کہ اس کے تحت تعلیم کے دائرہ کو کافی وسعت دی گئی۔ سر سیّد کی نظر میں صرف جدید علوم کی تحصیل تعلیم کی معراج نہیں ہے اور نہ ہی قدیم درسیات و نصاب سے علیحدہ رہنا تعلیم کا ماحصل ہے۔ تعلیم کے مقاصد کے بنیادی اصول کے لئے سر سیّد نے دونوں ہی قسم کے تعلیم کو ضروری تصور کیا لیکن اپنے زمانے کے مخصوص حالات اور مسلمانوں کی سماجی بدحالی کے پیش نظر جدید تعلیم کے فروغ کو خاص اہمیت دی اور زمانے کے تقاضے اور معاشرہ کے ضروریات کے تحت انہوں نے قدیم علوم کے مضامین کو بھی نئے طرز و جدید اسلوب کے مطابق پڑھانے پر زور دیا۔ اس طرح سر سیّد کے نزدیک سماجی و ثقافتی ترقی اور معاشرہ میں عزت و وقعت کا مقام حاصل کرنے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ درس و تدریس کا اہتمام کیا جائے اور جدید علوم فنون یا بی۔ اے وایم۔ اے کی ڈگری کے حصول کی سہولتیں فراہم کی جائیں بلکہ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ انہیں ایک ساتھ رہنے سہنے، کھانے پینے، بات چیت، باہمی سلوک و تعلقات اور مافی الضمیر کے اظہار کا سلیقہ سکھایا جائے بالفاظ دیگر جو کچھ انہوں نے استادوں سے یا کتابوں کے ذریعہ علم حاصل کیا اسے زندگی میں برتنے کی عملی مشق کرائی جائے۔ سر سیّد کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں بالکل واضح تھا۔ تعلیم و تربیت کے موضوع پر ایک بار تقریر کرتے ہوئے انہوں نے صاف صاف لفظوں میں یہ فرمایا:

> ''اے عزیزو اگر تعلیم کے ساتھ تربیت نہ ہو اور جس تعلیم سے قوم قوم نہ بنے وہ تعلیم درحقیقت کچھ قدر کے لائق نہیں۔ پس انگریزی پڑھ لینا اور بی۔ اے، ایم۔ اے ہو جانا جب تک اس کے ساتھ تربیت اور قومیت کی فلنگ نہ ہو تو قوم کو قوم اور ایک معزز قوم نہیں بنا سکتے۔ اسلام نے اس قومیت کے بدلے جو

نسل یا ملک کے سبب گنی جاتی تھی اسلامی قومیت قائم کی ہے
جس نے کلمہ پڑھا خواہ وہ چین کا ہو یا جاپان کا، عرب کا رہنے
والا ہو یا ہندوستان کا سب آپس میں بھائی بھائی اور مسلمان
ہیں اور ایک قوم اسلام......پس ہم کو اس بات کی فکر ہے کہ
ہماری قوم قوم نہ بنے اور معزز قوم۔"(۱)

(۱) خطبات سرسیّد، جلد دوم، مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۶۱-۳۶۰

باب چہارم

سرسیّد کے اہم تعلیمی اقدام

(۱) سائنٹفک سوسائٹی

(۲) اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ

(۳) تہذیب الاخلاق

(۴) مدرسۃ العلوم/محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

(۵) ایجوکیشنل کانفرنس

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ سرسیّد احمد خاں ایک مفکر مصلح قوم اور جامع خصوصیات کے مالک تھے۔ ان کے دل میں ہمیشہ اپنی قوم اور وطن کی پرخلوص اور بے لوث خدمت کا جذبہ ان کے دل میں موجزن رہا۔ انہیں ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ اپنی قوم کو کیسے ذلت و خواری انحطاط وانتشار اور تباہ حال زندگی سے ترقی وعروج کی راہ پر گامزن کیا جائے چونکہ سرسیّد احمد خاں نے جب ہوش سنبھالا تو مسلم معاشرہ کی زبوں حالی اور انتشار کے مشاہدے سے اس زمانے میں زندگی کا ہر شعبہ متزلزل اور روبہ انحطاط تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دو تہذیبوں ......انگریزی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب......کا تصادم اپنے شباب پر تھا ان دو تہذیبوں کے آپسی تصادم ہونے کے نتیجے میں شکوک وشبہات میں روز افزاں اضافہ ہوتا گیا۔ سرسیّد احمد خاں اس سے ازحد دل برداشتہ تھے۔ وہ اپنی قوم کی خفتہ اور مردہ قوتوں اور صلاحیتوں کو جگانا چاہتے تھے اور ان میں پچھلے مذہبی اوہام اور استقام کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ قوم کو عصری علوم کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یوں تو سرسیّد ملازمت کے سلسلے میں جہاں جہاں جاتے تھے قوم کی اصلاح وفلاح کی فکر کرتے رہتے تھے۔ کہیں پر انہوں نے مدارس قائم کئے تو کہیں رسالہ جاری کیا کبھی ایک زبان سے دوسری زبان میں تراجم کا انتظام کیا۔ انگلستان کا سفر بھی انہوں نے اسی مقصد کے لئے اختیار کیا تھا۔ وہاں اعلیٰ تعلیم کی درسگاہوں کو انہوں نے بچشم خود دیکھا اور وہاں کے نظام تعلیم کو پسند بھی کیا۔ ان درسگاہوں کی جو چیز انہیں سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ تھی کہ نیچے سے اوپر تک ذریعہ تعلیم مادری زبان کے نزدیک یہی انگریزوں کی ترقی

کا راز تھا۔ تعلیم کے اسی طریقے کو وہ اپنے ملک میں رواج دینا چاہتے تھے۔ غرض سرسیّد کا ذہن ہمیشہ معاشرے کو تعلیم کے ذریعے صاف ستھرا تعلیم بنانے میں مصروف رہا۔ سرسیّد کو یقین تھا کہ ہماری قوم اس وقت تک ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہوگی جب تک علوم جدیدہ سے بہرہ ورنہ ہو جائے اور علوم جدیدہ سے روشناس کرانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ انہیں مغربی زبان سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ مغربی مفکرین اور مصنفین کی تحریروں کو اردو میں ترجمہ کرایا جائے۔ جس سے قوم مستفید ہو سکے۔ اسی مقصد کے مدِ نظر سرسیّد نے مندرجہ ذیل اہم تعلیمی اقدام اٹھائے۔

(۱) سائنٹفک سوسائٹی

(۲) انسٹی ٹیوٹ گزٹ

(۳) تہذیب الاخلاق

(۴) مدرستہ العلوم/محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

(۵) ایجوکیشنل کانفرنس

(۱) سائنٹفک سوسائٹی

سرسیّد احمد خاں اپنے وطن میں علوم جدیدہ کو عام کرنا چاہتے تھے اور مسلمان اس وقت انگریزی تعلیم کو گناہ سمجھتے تھے اس لئے سرسیّد احمد خاں ۱۸۶۳ء میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا 'التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب تعلیم اہل ہند۔ اس مضمون میں انہوں نے ہندوستان میں علم و فن کی اشاعت اور اسے ترقی دینے کے لئے ایک مجلس یا کمیٹی قائم کرنے پر زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ کمیٹی اپنے قدیم مصنفون کی کار آمد کتابوں اور انگریزی کے مفید مضامین اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرے۔ چنانچہ ان کے خوابوں کی تعبیر ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک

سوسائٹی کی شکل میں ظہور پذیر ہوئی ڈیوک آف آرگائل اس کے سرپرست اور حسب ونسب رکن بنے۔ سوسائٹی کے وجود میں آتے ہی ترجمہ کے کام کی ابتدا ہوگئی۔ اس کے متعلق سرسیّد نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ :

''دنیا کے اس دور میں جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں، ملک کے دور کا وہ زمانہ ہے کہ جب ہم اس پر بہ لحاظ مضمون تعلیم کے لحاظ کرتے ہیں تو اس کو چمکتا ہوا نہیں پاتے۔''(۱)

عوام کو سوسائٹی کے اغراض و مقاصد سے واقف کرنے کی غرض سے سرسیّد نے ۹ر جنوری ۱۸۶۴ء کو اپنے دوست اور غازیپور کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس لفٹنٹ کرنل گراہم کے ساتھ غیر ملکی اور ہندوستانی اصحاب کے ایک جلسے کا انعقاد کیا جس میں ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ مغربی تعلیم کی بکثرت اشاعت ہونے کے بعد بھی علوم جدیدہ کی اشاعت اسوقت تک ناممکن ہے جب تک علمی کتابیں ہندوستانی زبان میں ترجمہ نہ کیا جائے اس سلسلے میں مولانا حاؔلی لکھتے ہیں کہ'' انہوں نے اس بات کو انگریزی تعلیم کے پھیلانے سے بھی زیادہ ضروری اور مقدم سمجھا''۔

مولانا حاؔلی نے سوسائٹی کے مقاصد کو مندرجہ ذیل الفاظ میں نہایت خوبی سے بیان کیا ہے :

''یعنی سائنٹفک سوسائٹی اس غرض سے قائم کی گئی ہے کہ لٹریری اور علمی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرا کر مغربی علوم کا مذاق اہل وطن میں پیدا کیا جائے، علمی مضامین پر لکچر دیئے جائیں، رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر اور گورنمنٹ کے اصول حکمرانی رعایا پر ایک ایسے اخبار کے ذریعہ سے ظاہر کئے جائیں جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا کرے۔

(۱) التماس بخدمت ساکنانِ ہند در بابِ ترقی تعلیم اہل ہند، سرسید، ص ۱

ہندو مسلمان اور انگریز تینوں قوموں کے ممبر اس میں شامل کیے جائیں اور اس طرح قومی یگانگی اور مذہبی حمایت اور جو جھجک ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے ہے اس کو آہستہ آہستہ کم کیا جائے۔ ابتدا میں ۱۲۹ ممبروں میں ہندو مسلم سب شامل تھے''(۱)

میدانِ تعلیم کے معاملے میں اس وقت ہندوستان کافی پسماندہ تھا۔ خاص طور پر مسلمان جدید تعلیم سے پرہیز اور کافی حد تک متنفر تھے۔ قوم کو اس جہالت سے نکالنے کے لئے سرسیّد نے اپنی تقریر میں ایک فارمولا پیش کیا جو کہ دراصل سائنٹفک سوسائٹی کے قیام کا پیش خیمہ بنا تھا۔

''ایسی بدبخت حالت کے علاج کی راہ نکالی اور ہمارے ہم وطنوں ہندوؤں اور مسلم قوموں میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لئے ایک سوسائٹی کا مقرر ہونا تجویز ہوتا ہے جس کا مقصود یہ ہوگا اول تلاش کرنا اور چھاپنا ہمارے قدیم مصنفون کے بہت عمدہ کتابوں کا دوسرے انگریزی زبان سے ایسی کتابوں کا ترجمہ کرنا اور چھاپنا جو سب کے لئے مفید ہوں۔''(۲)

ابتدا میں اس سوسائٹی کا نام سائنٹفک سوسائٹی موسوم ہوا لیکن سوسائٹی کے کچھ ممبران نے اعتراض کرنا شروع کر دیا۔ لہٰذا سرسیّد نے اس کا نام بدل کر ۱۱/اپریل ۱۸۶۴ء کو انجمن برائے سائنٹفک سوسائٹی (Society for better diffusion of useful Knowledge) رکھا لیکن سوسائٹی کے ممبروں کی کافی تعداد نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ سوسائٹی کا پہلا ہی نام

---

(۱) مطالعہ سرسید احمد خاں، مولوی عبدالحق، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۷ء، ص ۳۶-۳۵

(۲) التماس بخدمت ساکنانِ ہند در بابِ ترقی تعلیم اہلِ ہند، سرسید، بحوالہ سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۳۸

سائنٹفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی ہی برقرار رکھا جائے اور اس کا اغراض و مقصد مندرجہ ذیل ہوگا۔

۱۔ان علوم وفنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی کسی اور زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔

۲۔ جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روز نامہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم وفراست کی ترقی مقصود ہو۔

۳۔ ایشیاء کے قدیم مصنفین کی کم یاب اور نفیس کتابوں کو تلاش کرنا اور چھاپنا۔سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔(۱)

۴۔سوسائٹی میں اول معاون ممبر، دوسرے آنریری ممبر، تیسرے رفقائے سوسائٹی ہوں گے۔

۵۔معاون ممبر دو قسم کے ہوں گے اول ممبران حضوری یعنی وہ ممبر جو ایسے مقام میں یا اس کے قریب رہتے ہوں۔ جہاں سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو۔ دوسرے ممبران مکاتب یعنی وہ ممبر جو اس مقام سے سوسائٹی کا اجلاس ہوتا ہو، فاصلہ پر رہنے کے سبب سوسائٹی کے جلسہ میں شریک نہ ہوں گے اور بذریعہ خط وکتابت کے سوسائٹی سے ارتباط رکھیں گے۔

۶۔ممبران حضوری اور ممبران مکاتبت کی تعداد غیر محدود ہوگی۔

۷۔آنریری ممبروں کی تعداد دس اور رفقائے سوسائٹی کی تعداد پانچ سے زائد نہ ہوگی اور صاحبان ڈائرکٹرز پبلک انسٹرکشن بنگال، شمالی مغرب، سنٹرل انڈیا، اودھ اور پنجاب موجودہ وقت بشرطیکہ وہ قبول کریں گے آنریری ممبر ہوں گے۔

۸۔سب قوموں کے لوگ سوسائٹی کے ممبر ہوں گے۔(۲)

---

(۱) قانون واسطے سائنٹفک سوسائٹی، غازی پور، سرسید احمد خاں پرائیویٹ پریس ۱۸۶۴ء، ص۲ بحوالہ سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۳۸

(۲) سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۵۳

سائنٹفک سوسائٹی کے ممبران اوران کے اختیارات کے بارے میں یہ طے پایا کہ:

ا۔ وہ سب لوگ سوسائٹی کے ممبر ہونے کے واسطے اس کے اول مجمع کے دن سے بیشتر یا کسی روز اپناارادہ ظاہر کریں گے، بطور ممبران معاون کے تسلیم کئے جاویں گے۔

۲۔ آئندہ کو سوسائٹی کے ممبر بننے کے لئے پر امیدوار کو ایک ممبر تجویز کرے گا اور دوسرا ممبر اس کی تائید کرے گا اور یہ تجویز سوسائٹی کے اجلاس میں پیش ہوگی اور شخص مجوزہ کے منظور یا منظور نا منظور ہونے کے لئے گولیاں ڈلوانے سے ممبروں کی رائے لی جاوے گی۔ اس کا جائزہ تقرر کی تکمیل کے لئے سات ممبروں سے کم کا موجود نہیں ہونا چاہیے اور ممبروں کی کثرت رائے پر اس کی تقرر کا تصفیہ ہوگا اور ترجیح کی منظوری دینے کا پرسیڈنٹ کو حق ہوگا۔

۳۔ ہر ایک ممبر کو اختیار ہوگا کہ وہ سوسائٹی سے یہ درخواست کرے کہ وہ امیدوار کا تقرر آئندہ تک ملتوی رہے۔

۴۔ جو لوگ ممبر ہوں گے وہ اپنے تقرر کی اطلاع فی لفور سکریٹری سوسائٹی سے مع ایک رسالہ قانون سوسائٹی کے اور اس وقت سے اس قانون کے پابند ہوں گے۔

۵۔ ہر ایک معاون ممبر اس مہینہ کی پہلی تاریخ سے جس میں ان کا تقرر ہوا ہے آخر سال تک چندہ بہ حساب دو روپیہ ماہواری فی الفور دیں گے اور آئندہ ہر سال کا چندہ ماہ جنوری میں پیشگی لیا جائے گا۔

۶۔ جس قدر صاحبان انگریز ممبر ہوں گے، جب تک ہندوستان میں رہیں گے زر چندہ ادا کرتے رہیں گے۔ اور جب وہ ہندوستان میں واپس آویں گے تو ان سے درخواست کی جاوے گی کہ اس ماہ کی پہلی تاریخ سے جس میں وہ واپس آئے ہیں زر چندہ حسب معمول دیویں۔

۷۔ ہر ممبر سے نئے سال کے شروع ہونے پر اس سال کا زر چندہ پیشگی ادا کرنے کی درخواست

کی جاوے گی اور اگر وہ اس کو ادا نہ کرے گا تو اس کو یکم اپریل اور یکم جولائی کو بذریعہ خط کے زر چندہ کا ادا کرنا یاد دلایا جاوے گا اور یکم اکتوبر سے پہلے چندہ ادا کرنے میں قاصر ہوگا تو اس کا نام ممبروں کی فہرست میں سے خارج کیا جاوے گا اور اس کی اطلاع کاغذات سوسائٹی میں مشتہر کی جاوے گی۔

۸۔ان ممبروں کو جن پر زر چندہ باقی رہے گا سوسائٹی کے کسی ممبر میں منظوری کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

۹۔اگر کوئی ممبر جب تک اس نے زر چندہ پیشگی ادا نہ کیا ہو کسی حق کا مستحق نہ ہوگا۔

۱۰۔تمام ممبران سوسائٹی حقوق خاص و عام مندرجہ ذیل کے مستحق ہوں گے۔

(۱) سوسائٹی میں تقرر ممبر کے واسطے امیدواروں کا پیش کرنا یا تجویز کرنا۔

(۲) عام معمولی مجموعوں میں تماشا دیکھنے کے واسطے لوگوں کو لانا۔

(۳) علاوہ اس کے اگر اور کوئی نسخہ وہ لینا چاہیں گے تو اس قیمت پر جو کاؤنسل کارپرداز تجویز کرے گی ان کو ملے گا۔

(۴) جو کتاب سوسائٹی میں چھپے گی اس کا ایک نسخہ اور نیز ایک نقل ہر پروسیڈنگ یعنی روئداد سوسائٹی کی ان کو بلا قیمت ملے گی۔

(۵) سوسائٹی کے دفتر اور کتب خانہ میں ذاتی رسائی رکھنا اور چھپی ہوئی اور قلمی نسخوں کی جو سوسائٹی کا مال ہے دیکھنا اور کتب خانے میں سے کتابوں وغیرہ کو باہر لے جانے کا بھی حق ہوگا۔مگر جو قواعد اس باب میں کاؤنسل کاریروار مقرر کرے گی، ان کا بجالانا ان کو ضرور ہوگا۔

(۶) ہر ایک ممبر سکریٹری سوسایٹی کے نام بھی چھٹی لکھ کر اپنا نام خارج کرا سکتا ہے۔مگر اس تمام سال کا چندہ اس کو چکانا ہوگا اور جب تک تمام روپیہ جو کچھ سوسائیٹی کا اس پر واجب ہو ادا نہ کرے

اور تمام کتابیں واسباب سوسائیٹی کا جو اس نے لیا ہو اور واپس نہ کردے، یا اگر وہ جاتی رہی ہوں، یا ان میں کچھ نقصان آ گیا ہو، اس کا بخوبی معاوضہ نہ ادا کردے زر چندہ اس پر واجب رہے گا۔

(۷) جس ممبر نے چھٹی لکھ کر اپنا نام خارج کرایا ہے، وہ دوبارہ ممبر منتخب ہو سکے گا اور نیز اس کو اختیار ہوگا کہ زر چندہ ادا کر کے اپنی چھٹی جس کے ذریعہ سے اس نے اپنا نام خارج کرایا ہے واپس کرے اور ایسی حالت میں اس کے مقرر ہونے کے لئے قواعد تقرر ممبران کی تعمیل ضروری نہ ہوگی بشرطیکہ تاریخ تحریری اخراج نام سے بارہ مہینے کے اندر چھٹی واپس لینے کی اطلاع کی ہو۔

(۸) اگر کوئی ممبر سوسائٹی یا کاؤنسل کار پرواز کے قواعد یا احکام کی نافرمانی کرے گا یا کسی عام مجمع میں کسی بدچلنی کا ملزم ٹھہرے گا، وہ سوسائیٹی سے خارج ہو جاوے گا۔

(۹) جب کسی ممبر کے سوسائیٹی سے خارج کرنے کی کوئی وجہ ہو تو یہ امر کاؤنسل کار پرواز کے روبرو پیش کیا جاوے گا اور اگر کاؤنسل واجب عاقبت اندیش کے بعد بکثرت رائے اس ممبر کے خارج کرنے کی درخواست سوسائٹی سے کرے گی تب پریسیڈنٹ سوسائٹی کے کسی عام معمولی مجمع میں کرسی پر سے کار پرداز کے اس قصے کی اطلاع دے گا اور اس کے آئندہ اجلاس میں اس درخواست کی منظوری لی جائے گی اور کثرت رائے پر فیصلہ ہوگا بشرطیکہ اس مجمع میں سات ممبروں سے کم موجود نہ ہوں گے۔(۱)

سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں پروفیسر اصغر عباس نے اپنی تصنیف ''سرسیّد اور صحافت'' میں مذید تفصیلات فراہم کی ہیں جن کی روشنی میں مذکورہ سوسائٹی کی افادیت اور اس کے اندر سرسیّد کی خصوصی دلچسپی اور ان کے طریق کار کا اندازہ قارئین کو کماحقہ ہو جائے گا۔(۲) ضرور نکات درجہ ذیل ہیں:

---

(۱) قانون واسطے سائنٹفک سوسائٹی، سرسید، ص

(۲) سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۵۸

(۱) ہر ایک ممبر جو مقام سوسائٹی سے دور رہتا ہے اور اس سبب سے سوسائٹی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوسکتا، اس کو سوسائٹی سے خط وکتابت رکھنے کا حق ہوگا۔

(۲) جو ممبر سوسائٹی سے خط وکتابت کریں ان کو چاہیے کہ اپنا خط یا پولندہ یا جو کچھ سوسائٹی میں بھیجیں بعد ادائے محصول کے روانہ کریں، سوسائٹی کے خرچ سے دیا جاوے گا۔ اگر مضمون ان کا کاروباری سوسائٹی یا اس کی بھلائی سے علاقہ رکھتا ہوگا نہ کہ کسی اور حالت میں اور جس کسی ممبر سے خود سوسائٹی اپنی غرض سے خط وکتابت کرنا چاہے گی اس کے دونوں طرف کے تمام اخراجات کی ذمہ داری سوسائٹی کی ہوگی۔

آنریری ممبر:

(۱) آنریری ممبر ایسے لوگ ہونگے جو بہ سبب اپنی قابلیت کے نامور ہوں یا علوم وفنون کی ترقی میں اور لوگوں کو دلیر کرنے اور رغبت مشہور ہوں یا سوسائٹی کی خدمات بجالانے میں انہوں نے اپنا ایک خاص حق ثابت کیا ہو اور طاقت ادا کرنے زر چندہ کی نہ رکھتے ہوں یا قانون سوسائٹی نے ان سے چندہ لینا ضروری نہ سمجھا ہو۔

(۲) جب آنریری ممبروں کی تعداد میں کچھ کمی ہو تو کاؤنسل کارپرواز کو کسی امیدوار کی سعی کرنے کا اختیار ہوگا اور کاؤنسل کارپرواز کو اس شخص کے اس عہدے پر مقرر کئے جانے کے حقوق بھی بیان کرنے ہوں گے اور اس شخص کے تقرر کے لئے بطور اور ممبروں کی رائے لی جائے گی اور کثرت رائے پر تصفیہ ہوگا۔

(۳) تمام عام وخاص حقوق جو اور ممبروں کو ہیں وہ سب آنریری ممبروں کو بھی ہوں گے اور مانند اور ممبروں کے سوسائٹی سے خارج ہوسکیں گے۔

رفقائے سوسائٹی:

(۱) رفقائے سوسائٹی ایسے شخص ہونگے جو بہ سبب تحصیل علم یا علوم کے نہایت نامی ہوں

گے مگر ممبری کے عہدہ پر مقرر ہونے کا ان کو کچھ خیال نہ ہو۔

(۲) رفقائے سوسائٹی کی تجویز کاؤنسل کارپرواز سے ہوگی اوران کے تقرر کی تکمیل سوسائٹی کے اجلاس میں مانند اور ممبروں کے گولیاں ڈلوانے سے ممبروں کی رائے لی جاوے گی اور کثرت رائے پر تصفیہ ہوگا۔

(۳) رفقائے سوسائٹی کو بھی وہی حققوق عام وخاص ہوں گے جو اور ممبروں کو نہیں مگر ان کو کسی معاملہ میں سوسائٹی میں منظوری کرنے یا سوسائٹی میں عہدہ پر مقرر ہونے کا حق نہ ہوگا اور مانند اور ممبروں کے سوسائٹی سے خارج ہوسکیں گے۔

خزانچی اور حساب:

(۱) سوسائٹی کی آمدنی کا روپیہ جب کہ سوسائٹی اپنے اصلی مقام الہ آباد میں مقیم ہوگا بنگال کے بینک میں جمع رہے گا جس کو کاؤنسل کارپرواز تجویز کرے اور جس کی سوسائٹی کے ممبروں کے عام اجلاس میں منظوری ہوجائے۔

(۲) تمام روپیہ کے تقاضے سوسائٹی کی طرف سے اور وصول شدہ روپیہ کی تمام رسیدیں سکریٹری کی دستخط سے جاری ہونگی۔

(۳) تمام آمدنیوں اور جمع کئے روپیہ کو خزانچی کے پاس جمع کیا جاوے گا جو ایک کتاب اس مطلب کے واسطے ہوگی بطور رسید کے دستخط کیا کرے گا۔

(۴) جن رقموں کی سوسائٹی کے سالانہ اجلاس سے منظوری ہوجائے گی، وہ سکریٹری کے معرفت جو اس سب روپیہ کی رسیدیں دیا کرے گا جو خزانچی سے اس کو وصول ہوا کرے گا خرچ ہوا کریں گے اور جو کچھ روپیہ مطلوب ہوگا اس کی اطلاع کاؤنسل کارپرواز عام مجمع میں منظوری کے لئے گزارے گی۔

(۵) سوسائٹی کے تمام اخراجات یا آمدنیوں اور جمع کا حساب رکھا جاوے گا۔

(۶) کونسل کارپرواز ہر سال کے ختم ہونے پر پریسڈنٹ کی منظوری سے دو شخصوں کو جو سوسائٹی کے ممبر نہ ہوں، سوسائٹی کے حسابوں کا امتحان کرنے اور اس کے نتیجہ کی سوسائٹی کو رپورٹ کرنے کے لئے مقرر کرے گی۔

کتب خانہ:

وہ کتابیں جو سوسائٹی خریدا کرے یا بذریعہ نذروں کے جو اس کو دی جاویں، اور جو کچھ وہ چھاپے اس میں کے بارہ نسخے سوسائٹی کا کتب خانہ متصور ہوگا۔

سوسائٹی جو کچھ چھاپے:

جو کچھ سوسائٹی چھاپے اس کے بارہ نسخے کتب خانے میں رکھے جاویں اور ہر ممبر کو اس کا ایک نسخہ بلا قیمت دیا جائیگا، اور باقی نسخوں کو بموجب قواعد مقررہ کاؤنسل کارپرواز فروخت کیا کرے گی۔

پرسیڈنٹ:

پرسیڈنٹ کا کام سوسائٹی کے تمام اجلاسوں میں میر مجلس کرنے اور تمام روئدادوں کو باقاعدہ کرنے اور عموماً سوسائٹی کے احکام اور قوانین کی تعمیل کرنے اور اس کی تعمیل پر لحاظ رکھنے کا حق ہوگا۔

تقرر ممبران اور حق ممبران:

(۱) ایسوسی ایشن کے ممبروں کے داخل ہونے کے واسطے امیدوار لوگ سکریٹری سے درخواست کریں گے اور سکریٹری کی منظوری اس بات کے واسطے کافی سمجھی جائے گی کہ اجلاس آئندہ میں ان کا نام پیش ہو کر منظور کئے جائیں اور ان کی تقرری کا کثرت منظوری پر جو گولیاں

ڈالنے کے ذریعہ سے طلب کی جاوے گی منحصر ہوگا۔

(۲) جو اشخاص اس طرح پر مقرر ہوں گے ان کو اپنی تقرری کی اطلاع مع ایک نسخہ قانون ایسوسی ایشن سکریٹری سے حاصل ہوا کرے گی۔

(۳) ممبروں کو اختیار ہوگا کہ اپنا استعفیٰ بھیج کر ایسوسی ایشن سے اپنا نام خارج کرالیں اور اس سے اپنا تعلق منقطع کرالیں اور اگر وہ لوگ پھر دوبارہ ایسوسی ایشن سے تعلق پیدا کرنا مناسب سمجھیں تو پھر انکو ممبران ایسوسی ایشن میں داخل کرلیا جائے گا۔

(۴) اگر کوئی ممبر ایسے کسی فعل کا مرتکب ہو جو اس کی شان کے خلاف ہو اور ایسوسی ایشن کی بدنامی کا باعث ہو تو وہ شخص کثرت منظوری اور تمام ممبروں کی راویوں کے تصفیہ کے بعد جو اس معاملہ میں ان سے طلب کی جاویں گی ایسوسی ایشن کے ممبروں میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

(۵) مجموعہ ممبر دو قسم پر منقسم سمجھی جاوے گی جو ممبر مجمعوں میں موجود ہوا کریں گے وہ معمولی ممبر کہلاویں گے اور تمام ممبر ممبران مکاتبت کے نام سے موسوم ہونگے۔

(۶) ممبروں کو مجمعوں میں شریک ہو کر منظوری دینے اور تماشائیوں کے ایسوسی ایشن کے جلسوں میں ملانے کا استحقاق حاصل ہوگا۔

(۷) ممبر بڑے بڑے معاملوں میں ایسوسی ایشن سے سکریٹری کی معرفت خط وکتابت کر سکیں گی اور ایسوسی ایشن کی خدمت میں ایسے معاملات پیش کر سکیں گی جو عموماً تمام لوگوں کی عام فلاح سے متعلق ہوں اگر ممبروں کی خواہش ایسوسی ایشن کے مجوزہ مقاصد اور منشاء کے خلاف ہوں تو سکریٹری مجاز ہوگا کہ ایسوسی ایشن کے اجلاس میں انکو پیش کرنے سے انکار کرے۔

(۸) تمام افسران گورنمنٹ اور منتظمان ملک بطور تماشائیوں کے ایسوسی ایشن کے اجلاس میں آسکیں گی۔

(۹) ہر ممبر کو ایسوسی ایشن کے مطبوعہ روئدادوں اور دیگر تحریرات مطبوعہ کا ایک نسخہ مفت ملے گا۔(۱)

۱۸۶۴ء میں غازی پور سے سرسیّد کا تبادلہ علی گڑھ ہو جانے کے بعد سائنٹفک سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔ اس وقت علی گڑھ کے جج مسٹر ولیم جنکشن کو سوسائٹی کا پریسڈنٹ بنایا گیا علی گڑھ میں ہی سوسائٹی نے ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' نام کا ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس اخبار میں سیاسی، اخلاقی، علمی، معاشرتی، اور دیگر مضامین چھپتے تھے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر خود سرسیّد تھے۔ شروع شروع میں یہ اخبار ہفتہ میں ایک بار نکلتا تھا لیکن بعد میں ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا اردو صحافت کو اس اخبار نے بہت متاثر کیا۔ مولانا حالؔی نے اس اخبار کے متعلق لکھا ہے کہ :

> ''اول اول سرسیّد زیادہ تر اس میں پولیٹکل معاملات پر مضمون اور نوٹ لکھتے تھے اس لئے ان کی ابتدائی جلدوں کو ان کے پولیٹکل ورکس کا ایک مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اس اخبار کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کا ایک کالم انگریزی میں اور ایک اردو میں ہوتا تھا اور بعض مضامین اردو میں الگ چھاپے جاتے تھے۔ اس لئے اس سے انگریز اور ہندوستانی یکساں فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اس کا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات اور معاملات اور خیالات سے اگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت اور مذاق پیدا کرنا تھا۔ وہ انگریزی خیالات کو ہندوستانی سیاست اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی لباس میں ظاہر کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتا ہے۔''(۲)

---

(۱) اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، ۲۹ر جولائی ۱۸۶۸ء، ص ۳۷۱، بحوالہ سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۲۴۶۔۲۳۳

(۲) حیاتِ جاوید، ولانا الطاف حسین حالی، ص ۵۲۔۱۵۰

سرسیّد احمد خاں ایک مدبر اور دور اندیش انسان تھے۔ وہ قوم کے کمزور رگ سے اچھی طرح واقف تھے وہ ہندوستانی قوم کو ازمنہ وسطیٰ کی دلدل سے نکالنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انگریز اقتدار کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے آراستہ ہونا پڑے گا اس لئے انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی ترقی کے لئے ترجمہ کے کام کو کافی اہمیت دیا تا کہ قوم کو ان کے حقائق اور محرکات کو سمجھنے میں مغربی علوم کے ذریعہ مدد ملے۔ اس لئے انہوں نے سوسائٹی کے طرف سے مستند و معیاری کتابوں کا ترجمہ کروائے اور دوسری طرف جدید سائنس سے بھی مسلمانوں کو روشناس کرائے اس سلسلے میں سرسیّد نے خود کہا ہے کہ :

''اگر ہندوستان کو ہم کتابی تعلیم سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں تو وہ اس طرح پر ہو کہ جس طرح ہم اس کو اپنی سلطنت یا قوانین سے فائدہ پہنچاتے ہیں یعنی ہم کو لازم ہے کہ اکثروں تک رسائی کر کے کتابی علم کو شائع کریں اور اس رکاوٹ سے جس میں وہ پڑا ہے اس کو آزاد کریں اور اس سے اپنا اصلی ارادہ اور مقصد یہ ٹھہرائیں کہ ان مقصدوں مذکور بالا سے ہندوستانیوں کی حالت اصلی تبدیل ہو جائے۔ مناسب یہ ہے کہ علم کو ایسی شے ٹھہراؤ جس سے ہر روز فائدہ حاصل ہو اور اس کی تحصیل میں جہاں تک ممکن ہو آسانی ہو سکے، یہ سب میری خواہش ہیں اور اس لئے میں ملکی زبان کے ذریعہ علم کو پہنچانے کے لئے حد سے زیادہ ترجیح دیتا ہوں کیوں کہ وہ آسان ہے اور علم اس کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے۔ وہ عملی طور پر بہت متاثر ہوتا ہے اور اس کے وسیلے سے علم کثرت سے پھیلتا ہے۔''(۱)

(۱) روئداد سائنٹفک سوسائٹی، نمبر ۱۰

سائنٹفک سوسائٹی نے بہت سی اہم کتابوں کا اردو ترجمہ کر کے ایک بہت بڑی علمی خدمت انجام دی۔ اس کے زیر اہتمام بہت سی مفید انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا مثلاً الفسٹن کی ''تاریخ ہندوستان، رولن کی 'تاریخ مصر قدیم' تاریخ یونان قدیم' اسکاٹ برن کا رسالہ علم فلاحت، سر جان میلکم کی 'تاریخ ایران' ریونڈ اا یکسوس کی 'تاریخ چین، وغیرہ۔ اس کے علاوہ بہت سے سائنسی اخبارات بھی سوسائٹی میں منگوائے جاتے رہے۔ ۱۸۶۶ء میں اٹھارہ اخبار اور میگزین اور چھبیس اخبار اردو، فارسی، سنسکرت اور عربی کے ہندوستان اور غیر ممالک سے یہاں آتے رہے۔

سر سیّد سوسائٹی کی اکثر مالی امداد بھی کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنا ذاتی پریس جو کہ انہوں نے آٹھ ہزار میں خریدا تھا سوسائٹی کو عطیہ میں دے دیا۔ اس سلسلے میں جارج ہنری لارنس نے سر سیّد کے متعلق فرمایا:

> ''اگر سوسائٹی سید احمد خاں کی فیاضی کی پہلے ہی سے مقروض ہے مگر اب اس احساس کو عالیشان عطیے نے اور زیادہ کر دیا ہے۔''(۱)

۱۸۸۶ء میں نواب سکندر بیگم صاحبہ مرحومہ رئیسہ بیگم بھوپال نے جب سوسائٹی کے متعلق سنا تو اپنی خوشی سے ایک الماس کی انگوٹھی جس کی قیمت غالباً ایک ہزار روپیہ کی تھی سوسائٹی کے لئے سر سیّد کے پاس بھیج دیا۔ سر سیّد نے ایک جلسہ عام میں اس انگوٹھی کو سوسائٹی کے اخراجات کے لئے دے دیا۔ اس کے علاوہ سوسائٹی کی امداد کے لئے کلکٹری اور فوجداری کے مختاروں کو قانون پر لکچر دینے کا اختیار دیا اور اس سے جو فیس جمع ہوتا وہ سوسائٹی کی نذر کرتے۔ (۲) انہو ں نے گورنمنٹ سے بھی ایک معاہدہ کیا کہ اگر گورنمنٹ کچھ سالانہ امداد کرتی ہے تو سوسائٹی اس

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۲۸

(۲) ایضاً ص ۱۲۸

کے معاوضے میں کتابیں دیا کرے گی۔ چنانچہ گورنمنٹ نے اگست ۱۸۸۶ء میں پانچ سو روپیہ سالانہ کی کتابیں سوسائٹی سے خریدنی منظور کی۔ اس طرح سرسیّد نے علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کی مالی امداد کا ایک معقول انتظام کیا۔

۱۰رمئی ۱۸۸۶ء کو سرسیّد نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علی گڑھ کے روٴسا اور کچھ انگریز افسران شامل ہوئے اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے سرسیّد نے ہندوستانیوں کو صلاح دی کہ 'ہندوستانیوں کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے پارلیامنٹ سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے'۔ لوگوں کو یہ رائے بہت پسند آئی اور اسی وقت ہندو مسلمان اس سوسائٹی کے ممبر ہوئے اور اس کا نام علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ (۱) اس ایسوسی ایشن نے علی گڑھ میں بہت سے مفید کام کئے لیکن ۱۸۶۷ء میں سرسیّد کا بنارس تبادلہ ہو جانے کے بعد اس ایسوسی ایشن کا خاتمہ ہو گیا۔

۱۵راگست ۱۸۶۷ء کو سرسیّد بہ حیثیت جج بنارس منتقل ہو گئے اس کے بعد سوسائٹی کا سارا کاروبار راجہ جے کشن داس جی (آئی۔ سی۔ ایس) جو اُس وقت علی گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر تھے کے سپرد کر دیا گیا۔ انہوں نے سوسائٹی کے کام کو بہ حسن وخوبی انجام دیا اور سوسائٹی کی نامکمل عمارت کو مکمل کروایا۔ قیام بنارس کے دوران بھی سرسیّد سوسائٹی کے کاموں میں مدد کرتے رہے اور اس کی آمدنی کے ذرائع تلاش کرتے رہے۔ ان کا پلان تھا کہ علی گڑھ کے ہر دیہات سے کم از کم ایک روپیہ سالانہ سوسائٹی کے لئے مقرر کیا جائے۔ (۲) لیکن یہ کام صرف ۲۰ ماہ تک جاری رہا کیونکہ اس کے بعد یکم اپریل ۱۸۷۹ء کو سرسیّد ولایت چلے گئے لیکن اس قلیل مدت جو ۲۰ ماہ کی تھی میں ہی سرسیّد نے سوسائٹی کے امداد کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس سلسلے میں سرسیّد

---

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۲۹

(۲) روئداد سائنٹفک سوسائٹی نمبر ۶۔

نے ایک خط میں میر مہدی علی (محسن الملک) کو لکھا ہے کہ :

''مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کہ یہ بڑا رنج ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کی بڑی مخالفت کریں گے اور کوئی درجہ سعی و کوشش کا واسطے شکست سائنٹفک سوسائٹی کے باقی نہ رکھیں گے۔ پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو سنبھال لیں اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرماویں۔ مرزاپور کے لوگوں نے اگر چندہ نہیں دیا تو ان کو ممبر بنایئے۔ بہر حال سوسائٹی کے معاملے میں حد سے زیادہ خیال و کوشش فرمایئے۔''(۱)

انگلستان میں ایک سال قیام کے دوران وہ مسلسل ہندوستان کے نظام تعلیم کے بارے میں سوچتے رہے کیونکہ وہ موجودہ نظام تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے ہندوستانی موجودہ نظام تعلیم کے خلاف انگریزی میں ایک پمفلیٹ جاری کیا جس میں انہوں نے ایک مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ولایت سے واپس آنے کے بعد ہندوستان میں سرسیّد نے دو اہم کام کئے۔ اول مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے انہوں نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' جاری کیا جس کے اغراض و مقاصد اوپر بیان کئے جا چکے ہیں جس کے نتیجے میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' کا قیام ۱۸۷۵ء میں عمل میں آیا۔ دوسرا سب سے بڑا کام محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، کا قیام تھا جو بعد میں ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' کے نام سے ۱۸۸۶ء میں قائم ہوا۔ اس کا خاص مقصد مسلمانوں میں مغربی تعلیم کا شوق و جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اس کے اجلاس میں دور دور سے لوگ آ کر شریک ہوا کرتے تھے۔ اور تعلیم کے متعلق خوب خوب بحثیں ہوتی تھیں۔

---

(۱) مکتوبات سرسید، مرتبہ شیخ اسمٰعیل پانی پتی، ص ۴۱

۲۱رفروری ۱۸۶۷ء میں راجہ جے کشن داس جی کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا۔ اس کے بعد مولوی سمیع اللہ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے سوسائٹی کے منتظمین کے جلدی جلدی تبادلہ ہونے کی وجہ سے سوسائٹی کے ذریعہ کتابوں کی اشاعت بھی متاثر ہوتی تھی۔ اسی وقت سرسیّد بھی بنارس سے علی گڑھ منتقل ہو گئے لہٰذا نظامت کے فرائض کو پھر سے انہوں نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اس وقت سوسائٹی کی حالت خستہ تھی اس پر کافی قرض ہو گیا تھا ممبروں کی تعداد بھی گھٹ کر قریب دس رہ گئی تھی۔ ترجمہ کا کام بھی بند ہو چکا تھا لہٰذا سرسیّد نے سوسائٹی کے قواعد میں ترمیم کی۔ پھر بھی اس کی اصلاح نہ ہو سکی۔ آخر کار ۱۰رجولائی ۱۸۸۷ء کو سائنٹفک سوسائٹی کو مدرستہ العلوم علی گڑھ میں شامل کر لیا گیا۔ سوسائٹی کے ذریعہ جو بھی کتابیں شائع کی جاتی تھیں انہیں سوسائٹی کے سرپرست ڈیوک آف آرگل کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ یہ تجویز سرسیّد کی تھی جس سے سبھی ممبران متفق تھے۔ سرسیّد کی یہ تجویز تھی کہ :

> ''ہماری سوسائٹی جو کتاب چھاپے اس کا سرنامہ ہمیشہ ہز گریس ڈیوک آف آرگل پیٹرن سوسائٹی کے نام سے زینت پاوے تا کہ ایسے جلیل القدر حاکم کی جس نے ہم ہندوستانیوں کی بہتری کے لئے اپنی فیاضی مہربانی کو پیٹرن ہونے سے ظاہر کیا، ہمیشہ کو یادگار رہے'' (۱)

بقول مولوعبدالحق، سوسائٹی نے کم وبیش اکتیس کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں جس کی تفصیل ان کی کتاب ''مطالعہ سرسیّد احمد خاں'' میں درج ہے۔ (۲)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سرسیّد نے سوسائٹی کی بہبودی اور ترقی کے لئے ساری زندگی وقف کر دی۔ اپنی بساط سے بڑھ کر انہوں نے مالی امداد کی۔ ضلع کے رؤسا پر دباؤ ڈالا کہ وہ

(۱) سرسید احمد خاں حالات وافکار، عبدالحق، ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۹ء، ص ۱۵۱

(۲) مطالعہ سرسید احمد خاں، عبدالحق، ص ۴۶۔۱۴۵

گورنمنٹ کی توجہ اس کی طرف دلائیں۔ سرسیّد نے سوسائٹی کی آمدنی بڑھانے کے لئے طرح طرح کے طریقے اپنائے اس سوسائٹی کے لئے انہوں نے اپنے زیرنگرانی ایک عالیشان عمارت بنوائی۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے ہمیشہ سوسائٹی کے بارے میں سوچتے رہے اس سوسائٹی نے بھی کافی تعلیمی خدمات انجام دی اور اس کے دیکھا دیکھی ملک میں متعدد انجمنیں قائم کی گئیں۔ جو اپنے اپنے حلقہ میں مفید کام کرتی تھیں اس سوسائٹی نے لوگوں میں اپنے تاریخی ورثہ سے محبت کرنا سکھایا۔ اس نے لوگوں میں سائنسی علوم کا ذوق پیدا کیا۔ اس طرح سوسائٹی نے ہندوستان میں ایک علمی فضا تیار کی جس نے ہندوستانیوں کو ظلمت کدے سے نکال کر روشن و منور فضا میں داخل کرنے میں معاونت کی۔

(۲) انسٹی ٹیوٹ گزٹ

''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اردو کا ایک مشہور اخبار ہے۔ اس کا اجرا ۳۰/ مارچ ۱۸۶۶ء کو پہلی بار ہوا۔ اس اخبار کا بنیادی مقصد ''علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی'' کے ادبی و علمی کارناموں کی تشہیر کرنا تھا۔ اور ملک میں سنجیدہ اور تعمیری جذبے کی اشاعت کرنے اور جدید خیالات و افکار سے مسلمانوں کو روشناس کرانا تھا۔ گزٹ کے اجرا کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعہ حکومت اور قوم میں قربت پیدا کی جائے تاکہ قوم، حکومت وقت کی عنایات سے مستفید ہو سکے۔ یہ اخبار ابتدا میں ہفتہ وار جاری ہوتا تھا لیکن بعد میں یہ اتنا مقبول ہوا کہ ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا۔ یہ اخبار خود سرسیّد کی ادارت میں نکلتا تھا لہٰذا اس کا اداریہ سرسیّد خود لکھتے تھے۔ اس اخبار کے سرورق پر نیم دائرے میں انگریزی میں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' اور اس کے نیچے اردو میں 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' لکھا ہوتا تھا۔ اس کے اولین شمارے میں اس مقصد کو بیان کرتے ہوئے سرسیّد نے لکھا ہے کہ :

''ارادہ ہے کہ اخبار میں نہایت عمدہ عمدہ مضامین جن کو بڑے بڑے قابل ہندوستان کے خیر خواہ انگریز اور قابل اور لائق ہندوستانی شرفا لکھیں گے تاکہ عموماً ہندوستانیوں کی تعلیم بھی ہو اور لطف بھی حاصل ہو اور انگریزی زبان سے ترجمہ ہو کر نفیس اور عمدہ جو مضمون اب لکھے جاویں گے اور اخباروں سے ایسے مضمونوں کے ترجمہ چھاپے جاویں گے جو ہندوستانیوں بلکہ کل انسانوں کے لئے مفید اور بکار آمد ہوں گے اور جن سے ہندوستان کے لوگ اور کسی طرح واقف نہیں ہو سکتے۔''(۱)

اس اخبار کی ابتدائی جلدوں کو پالیٹکل ورکس کہا جاتا تھا کیونکہ شروع میں اس اخبار میں زیادہ تر سیاسی معاملات پر مضامین ادارات لکھے جاتے تھے اس میں انگریزی اور اردو دونوں کالم ہوا کرتے تھے جو اس اخبار کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ایسا غالباً اس لئے تھا کہ سرسیّد احمد خاں انگریزی خیالات کو ہندوستانی زبان میں اور ہندوستانی خیالات کو انگریزی زبان میں پیش کر کے دونوں قوموں کو ملانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے باصلاحیت مترجمین کی خدمات حاصل کی گئی اور کتابوں کے ترجمے کا ایک طویل پروگرام بنایا گیا جس کی وجہ سے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی روایت مقبول ہوئی۔ اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آج تک کوئی پرچہ ہندوستان میں اس کے سوا نہیں نکلا جس سے یہ دونوں مقصد پورے ہو سکیں۔(۲)

اس اخبار میں سیاسی، سماجی، علمی اور اخلاقی مضامین چھپتے تھے اردو مضامین کے علاوہ انگریزی مضامین بھی ترجمہ کر کے اس میں چھاپے جاتے تھے بلاشبہ اس میں زیادہ تر سرسیّد کے

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد ۱، شمارہ ۱، ۳۰ر مارچ ۱۸۶۶ء، سرسید احمد پرائیویٹ پریس، منیجر منشی محمد یار خاں، ص ۲

(۲) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۵۵-۱۵۴

مضامین ہوا کرتے تھے۔اس پرچہ نے شمالی ہندوستان میں عام خیالات کی تبدیلی اور معاملات کی ترقی میں اہم رول ادا کیا ہے چنانچہ جو ماٹو (MATO) نے اپنے لئے اختیار کیا اس کو ہمیشہ نصب العین رکھا۔(۱)

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ شمالی ہندوستان کا سب سے مشہور اخبار ''پوپلس آف دی انڈین امپائر (Peoples of the Indian Empire) کے مطابق ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ''، جس کے ایڈیٹر سرسیّد احمد خاں تھے اور اب بھی وہی معلوم ہوتے ہیں۔ یہ شمالی ہندوستان میں سب سے عمدہ اخبار ہے۔''(۲) اسی کتاب میں مصنف نے اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اخبار مسلمانوں کا خاص آلہ ہے اس کے مطابق اس میں سے چھپے مضامین معزز ہندوستانی مسلمانوں کی نظریہ کا ایک مجموعہ ہے ان مضامین کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس زمانے کے بہت سے مفکر اور دانشوروں نے اس اخبار کو دوسرے انگریزی اور دیسی اخباروں سے ممتاز بتایا ہے۔اس اخبار کی متعدد خصوصیات تھی۔ پہلی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے کبھی کسی خاص قوم، یا فرقہ یا شخص کی دلآویزی نہیں کی۔اس اخبار میں چھپے مضامین میں سنجیدگی اور متانت پائی جاتی ہے اس پرچہ نے کبھی مذہبی اور سیاسی جھگڑوں میں حصہ نہیں لیا۔اس اخبار کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہر ماہ باقاعدہ شائع ہوتا تھا یہ وہ خاصیت تھی جو دوسرے دیسی اخباروں میں اکثر نہیں پائی جاتی تھی ان کی اشاعت میں باقاعدگی عام بات تھی۔ جب کہ اخبار باقاعدہ بتیس برسوں تک برابر شائع ہوتا رہا۔اخبار کا ہر نمبر اپنے معین تاریخ پر ہی شائع ہوتا رہا۔ باوجود مالی پریشانیوں کے سرسید نے اس اخبار کو کبھی بند نہیں ہونے دیا۔حالانکہ چندے کی کمی کی وجہ سے

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۲۹

(۲) ایضاً ص ۵۷-۱۵۶

سائنٹفک سوسائٹی ہزاروں کی مقروض ہوگئی تھی۔(۱) اس اخبار کی خبروں کو نہایت معتبر ذریعوں سے لیا جاتا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جنوری ۱۸۶۷ء سے اس اخبار کے الفاظ میں کچھ واضح تبدیلیاں ہوئیں۔ اس اخبار کے ذریعہ سرسیّد نے عوام اور حکومت کے رشتوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے عصری صحافت کے متعلق سرسیّد احمد خاں کے نظریہ کی بھی وضاحت کی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس اخبار میں کافی تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں۔ لیکن ان تبدیلیوں کو سرسیّد نے اپنے قارئین سے کبھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ وہ انہیں اخبار کی وقتاً فوقتاً تبدیلیوں سے اگاہ کرتے رہے اس اخبار میں اپنے قارئین کو اخبار کے تبدیلیوں کے متعلق اگاہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

> ''ہم اپنے اخبار کے خریداروں کو اطلاع دیتے ہیں کہ ہم نے جو سررشتہ تعلیم کی خبروں کا چھاپنا شروع کیا ہے کچھ شبہ نہیں کہ وہ مفید کام ہے اگر اس کے چھاپے کا قصد مستقبل ہو جاوے گا تو ہم سہ شنبہ کے اخبار کو بھی جو چھ ورق کا ہے آٹھ ورق کا کر دیں گے تا کہ تمام خبروں کے چھاپنے میں کوئی کمی نہ ہو۔''(۲)

انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے اردو صحافت کی اہم خدمت انجام دی ہے اسی اخبار نے اردو صحافت کو رائے عامہ کی آزادی، سنجیدگی، متانت اور صحتِ واقعات اور دوسری خوبیوں سے روشناس کرایا۔ درحقیقت اسی اخبار نے باوقار صحافت کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اردو زبان اور خاص طور پر اردو نثر کی ترقی میں نمایاں رول ادا کیا۔ سماجی اور تعلیمی میدان میں بھی اس نے اہم رول ادا کیا۔ اس اخبار نے جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لئے حتی الامکان کوشش کی اور عوام کو

---

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۵۷-۱۵۶

(۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد ۲، شمارہ ۲۹، اگست ۱۸۸۵ء، ص ۹-۱۱

بالخصوص مسلمانوں کو سماجی حقیقت سے روشناس کرایا۔اس اخبار کے ذریعے بیرونی ملکوں اور وہاں کے باشندوں کے رہن سہن سے اردو داں طبقے کو واقفیت حاصل ہوئی۔ اس اخبار نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کو ملانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔اوراسی اخبار نے آپسی منافرت کے جذبات کو ایک حد تک کم کیا۔انہی سب وجوہات کے بنا پر اس اخبار کے مقاصد کو بھی بڑے پیمانے پر قبول کیا گیا اور یہ ایک مشہور اخبار بن کر افق پر ابھرا۔اس اخبار نے علم کے میدان میں بھی ایک اہم رول ادا کیا۔ ہندوستان میں اور خاص طور پر شمالی ہند میں یہ اخبار ایک علمی فضا بنانے میں کافی مددگار ثابت ہوااوراکبرالہ آبادی کو طنزاً کہنا پڑا۔

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے

جب ہم اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں پر خاص دھیان دیا گیا تھا۔ اس اخبار کے ذریعہ سرسیّد احمد خاں نے انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی اصلاح ،صفائی ،تہذیب وشائستگی ،مسلمانوں کی علمی مسائل اوران کے حل کرنے کی طرف خاص دھیان دیا ہے۔شروع میں اخبار داہنے طرف سے شروع ہوتا تھا لیکن جنوری ۱۸۶۷ء میں اخبار بائیں طرف سے شروع ہونے لگا۔ڈاکٹر اصغر عباس نے اپنی کتاب 'اردو صحافت' میں مندرجہ ذیل الفاظ میں ہوئی ماٹو کی تبدیلیلوں کا ذکر یو کیا ہے :

"To permit the liberty of the press is the part of a wise government to preserve it is the part of free people."

ترجمہ: (جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا ،ہے کام ایک دانا گورنمنٹ کا ،اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔'')(۱)

سائنٹفک سوسائٹی میں اخبار پروگریس کو شامل کرنے کے بعد ماٹو کا لکھنا بند کر دیا گیا لیکن اخبار کے ماٹو سے اخبار کے مطمح نظر کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ یوں تو ۱۸۵۷ء کے بعد کالعدم

(۱) بحوالہ اردو صحافت، اصغر عباس، ص ۷۵

(Ganging Act) قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن انگریزی حکومت سے لوگ اتنے دہشت زدہ تھے کہ کسی بھی اخبار خاص طور پر اردو اخبارات کو حکومت کی کوتاہیوں کو نشاندہی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ حکومت جب چاہتی ان کے اخبار کو بند کرا دیتی۔ اس لئے سبھی اخبارات حکومت کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتے رہے۔ لیکن ماٹو گزٹ حق گوئی اور بے باکی کی مثال ہے۔ اخبار میں بڑے شستہ انداز میں حکومت کو اس کی بنیادی فرائض سے آگاہ کیا اور ماٹو کے ذریعہ اس نے اپنے ارادہ اور صحافت کے اعلیٰ اصول کا اعلان کیا۔

سرسیّد کے بنارس سے علی گڑھ آنے اور اخبار کی ادارت کا کام سنبھالنے کے بعد جون ۱۸۷۷ء میں اخبار میں کچھ اور تبدیلیاں کی گئیں۔ سرسیّد نے محسوس کیا کہ اخبار کو کچھ اور بہتر بنانا ضروری ہے جس کے لئے کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ اس سلسلے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں یہ اطلاع قارئین کو دی گئی کہ :

> ''صورت جو اس اخبار کی ہے کہ وہ بھی تبدیل ہو جاوے گی۔
> گل، پھول، محراب اور ٹھٹھورے سیدھے حرف اب اس زمانہ
> سادگی اور صفائی میں زیادہ پسند نہیں ہیں پس پیشانی اس کی
> نورانی ہوگی اور اس پر انگریزی و فارسی حرفوں میں صرف 'علی
> گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' لکھا ہوگا۔''(۱)

اس کے بعد اخبار پر صرف علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگریس بھی لکھا جانے لگا۔ پہلے صفحہ پر اخبار کی قیمت اردو اور انگریزی میں لکھا ہوتا تھا۔ اب اخبار پر ماٹو کا لکھنا بھی بند ہو گیا۔ یہ سب تبدیلیاں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ سرسیّد اپنے قارئین کے مذاق و پسند کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ۱۸۹۵ء تک اخبار یوں ہی شائع ہوتا رہا لیکن ۱۸۹۶ء میں اس گزٹ میں ''تہذیب الاخلاق'' کو

---

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵ رمئی ۱۸۷۷ء، بحوالہ سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۶۰

شامل کر لیا گیا اس کے بعد اخبار میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں اب اس اخبار پر ایک دائرہ میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق درج ہونے لگا۔ اسی پر ایک اور دائرہ ہوتا تھا جس میں مدرستہ العلوم مسلمانان کا مونوگرام چھپا ہوتا تھا۔ دائرے کے نیچے انگریزی میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی رہتی ہے:

"The Aligarh i nstitute gazzette of the Mohammadan Anglo Oriental College with which are i n corporated the Mohammadan Social reformer and the progress."(۱)

اسی کے نیچے انگریزی میں آنریری ایڈیٹر کے قلم سے سرسید احمد خاں کا نام درج ہوتا تھا۔ ساتھ ہی اس اخبار کا جلد نمبر، مقام، دن، تاریخ اور سنہ انگریزی اور اردو میں لکھا ہوتا تھا۔ ساتھ ہی گزٹ کی متوقع تبدیلیوں کا بھی ذکر ہوتا تھا۔

شروع میں یہ گزٹ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ شائع ہوتا تھا لیکن ۱۸۸۷ء کے بعد یہ مدرستہ العلوم کی منتظمہ کے تحت شائع ہونے لگا اور اسی کے تحت ۱۸۹۸ء تک شائع ہوتا رہا۔ شروع میں یہ گزٹ سرسیّد کے پرائیویٹ پریس میں چھپتا تھا لیکن جب سرسیّد علیگڑھ سے بنارس جانے لگے تو انہوں نے اپنا پریس سائنٹفک سوسائٹی کو بطور عطیہ دے دیا۔ اس وقت اس پریس کی مالیت لگ بھگ آٹھ ہزار روپیہ تھی بعد میں یہ پریس علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس کے نام سے مشہور ہوا اور آخر تک گزٹ اسی پریس میں طبع ہوتا رہا۔

۱۸۷۷ء تک یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور جمعہ کو شائع ہوا کرتا تھا لیکن جون ۱۸۷۷ء کے بعد یہ اخبار ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا اس تبدیلی کے بارے میں قارئین کو گزٹ کے ذریعہ یہ اطلاع دی گئی کہ :

---

(۱) تہذیب الاخلاق، یکم رمضان ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء، ص ۱۳

''واضح ہو کہ ہمارا اخبار ہفتہ میں دو بار جاری ہوگا ایک شنبہ کو
اور ایک سہ شنبہ کو۔'' (۱)

جب گزٹ میں تہذیب الاخلاق کو بھی شامل کر لیا گیا تو پھر یہ ہفتہ وار ہو گیا اور صرف شنبہ کو شائع ہونے لگا۔ (۲) مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنی کتاب 'حیات جاوید' میں اس کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا تھا اور پھر ہفتہ میں دو بار نکلنے لگا۔ (۳) اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گزٹ آخر تک سہ روزہ رہا۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ بعد میں یعنی ۱۸۹۶ء سے یہ پھر ہفتہ وار ہو گیا تھا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر خورشید وغیرہ نے بھی حالی کے اس بیان کی تائید کی ہے۔

۱۸۶۶ء تک اخبار میں سولہ صفحات ہوتے تھے ان میں سے بارہ صفحات پر خبریں اور مضامین ہوتے تھے اور بقیہ صفحات اشتہارات کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ اشتہار نہ ملنے پر ان مخصوص صفحات پر خبریں اور مضامین چھاپ دیئے جاتے تھے اور سہ شنبہ کو نکلنے والے اخبار میں کل بارہ صفحات ہوتے تھے جن میں سے دو صفحات اشتہار کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ اشتہارات کی تعداد بڑھنے کی صورت میں اخبار کے صفحات کی تعداد بھی بڑھا دی جاتی تھی۔ لیکن مضامین اور خبروں کے صفحات میں کس طرح کی کٹوتی نہیں کی جاتی تھی کبھی کبھی بڑا مضمون آ جانے کی وجہ سے صفحات کی تعداد بھی بڑھا جاتی تھی۔

گزٹ کی اشاعت کا اہم مقصد ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان منافرت کے جذبات کی موجودگی کو کم کیا جاتا تھا اور باہمی افہام و تفہیم کے ذریعہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کو

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵ رمئی ۱۸۷۷ء

(۲) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مع تہذیب الاخلاق، ۹ رجنوری ۱۸۹۷ء بحوالہ سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۶۴

(۳) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۸۳

جذباتی اور خیالاتی طور پر متفق کرنا تھا اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اخبار انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں ایک ساتھ شائع ہوتا تھا۔ سرسیّد نے ہنٹر کی کتاب ' ہمارے ہندوستانی مسلمان' کی تردید ۱۸۷۱ء میں کئی قسطوں میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کی۔ اس گزٹ کی زبان کے بارے میں شمالی ہند کے اخبارات کی رپورٹ ان الفاظ میں ملتے ہیں:

''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ دو زبانوں کا اخبار خیال کیا جاتا ہے کیونکہ بعض اوقات اس میں انگریزی مضامین بھی مع اردو ترجمے کے چھپتے ہیں، لیکن بیشتر اس میں خاص اردو کے مضامین ہوتے ہیں۔'' (۱)

اخبار میں تقریباً تیس فیصد حصہ خبروں کے لئے ،تقریباً پندرہ فیصد اداریہ کے لئے ،اور باقی حالات حاضرہ صحافتی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی نوعیت کی مضامین کے لئے مخصوص ہوتا تھا خبروں میں بھی دو تہائی ملکی خبریں اور ایک تہائی غیر ملکی خبریں ہوتی تھیں۔

۱۸۷۷ء میں سرسیّد احمد خاں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور گزٹ کی ادارت کی ذمہ داری خود سنبھالی۔ ۱۸۷۷ء کے وسط سے مارچ ۱۸۹۸ء تک وہ گزٹ کے ایڈیٹر رہے ان کی وفات کے بعد سید محمود نے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی لیکن کچھ ہی دنوں بعد یہ گزٹ بند ہوگیا۔ لیکن پھر ۱۲ر فروری ۱۹۰۱ء سے نواب محسن الملک کے زیر صدارت گزٹ پھر سے شائع ہونا شروع ہوا۔ گزٹ کے پہلے شمارے میں نواب محسن الملک گزٹ کے خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''سرسیّد احمد خاں مرحوم ہی وہ شخص تھے جنہوں نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کر کے ہم لوگوں کو بتایا کہ ملک یا قوم کی اخلاقی یا دماغی حالت کی

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵ر مئی ۱۸۷۷ء، ص ۶۳

اصلاح اور تمدن اور سیاسی مسائل کی اشاعت اور گورنمنٹ اور عوام کو غلطیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے اخبار سب عمدہ ذریعہ ہے۔ غالباً ہمارا یہ کہنا غلط اور مبالغہ سے خالی ہوگا کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے پہلے کوئی اردو اخبار ایسا نہ تھا جس نے اخبار کے یہ اصلی فرائض سمجھے ہوں اور جس سے اصلی مقصد اخبار کا پورا ہوا ہے۔ سرسیّد نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کر کے ہم لوگوں کو ترقی کی راہ بتائی، ہم کو زمانے کے موافق چلنے پر آمادہ کیا۔ گورنمنٹ کو رعایا کے خیالات سے مطلع کرنے اور رعایا کو گورنمنٹ پر اپنی حاجتیں اور خواہش ظاہر کرنے کا طریقے بتایا۔ علوم و فنون کی اشاعت کے طریقہ سکھائے۔ تعلیم وتربیت کا شوق دلایا، پرزور آرٹکل اور پر جوش مضامین لکھ کر ہمارے خیالات میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا۔ سوسائٹیوں اور انجمنوں کا قائم کرنا۔ متفقہ کوششوں کو ملک وقوم کی ترقی کے لئے کام میں لانا سکھایا۔''(۱)

کالج کی مجلس منتظمین نے بھی یہ محسوس کیا کہ یہی وہ اخبار تھا جس کے ذریعہ قوم مدرستہ العلوم کے حالات سے باخبر ہوتی رہتی تھی۔ سرسیّد احمد خاں کے علاوہ اس وقت کے جید عالم ومفکر اور مشہور مصنف مثلاً مولانا ذکا اللہ، محسن الملک، وقار الملک، مولوی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور وحید الدین سلیم وغیرہ اخبار کے لئے مضامین لکھا کرتے تھے۔ ان کی علمی اصلاحی فکر اور ادبی کاوشیں اگر اخبار کے منتشر اوراق سے جمع کی جائیں تو یہ ایک دلچسپ دستاویز ہوگی۔

سرسیّد احمد خاں کے انتقال کے بعد ۱۸۹۸ء میں گزٹ کالج میگزین میں ضم ہوگیا اور انفرادی حیثیت ختم ہوگئی۔ ایک خاص ضمیمہ کے ذریعہ قارئین کو اس کی اطلاع دی گئی۔

---

(۱) سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص ۲۴۳

"The Aligarh Institute gazzete with the progress has been incorporated with the magazine. So it is only a record of the educational movement of the leading Musalmans of India and expects greater patranage from the member of the same nations."(1)

(Theodore Beck) Niaz Ahmad Khan, Manager

۱۸۹۹ء تک اس پرچہ کا پورا نام ایم۔اے۔او۔کالج میگزین اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع پروگریس رہا۔ لیکن فروری ۱۸۹۹ء کے شمارہ میں گزٹ شامل نہیں ہوا لیکن مئی سے فروری ۱۹۰۱ء تک گزٹ میگزین کے ساتھ ہی نکلا اسی سال ۱۲/فروری سے دسمبر ۱۹۰۷ء تک محسن الملک کی ادارت میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ مع تہذیب الاخلاق چھپتا رہا۔ بعد میں ۱۴/جنوری ۱۹۰۸ء سے وحید الدین سلیم اس کے مدیر ہو گئے اور ۱۴/جنوری ۱۹۰۹ء سے تہذیب الاخلاق کو اس سے الگ کر دیا گیا اور صرف انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اشاعت وحید الدین سلیم کے زیر صدارت شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۱۱ء میں گزٹ سے مدیر کا نام غائب ہو گیا اور اس کی جگہ مہتمم نے لے لیا۔ اس زمانے میں اس کے مہتمم ممتاز الدین تھے۔ ۳۰/مارچ ۱۹۱۳ء کو نواب محمد اسحٰق خان (سکریٹری کالج) کو پھر سے اس گزٹ کا مدیر بنایا گیا۔ انہوں نے چھ افراد پر مشتمل ایک منتظمہ بنائی جس میں ڈاکٹر ضیاء الدین، میر ولایت حسین، مولوی ابوالحسن، مولوی ادریس، حسن محمد حیات اور مقتدیٰ خان شروانی کو شامل کیا گیا اور اشاعت کی ذمہ داری اس کے معتمد مقتدیٰ خاں شروانی کے سپرد کر دیا گیا۔ ۱۲/اپریل ۱۹۱۳ء سے دسمبر ۱۹۲۰ء تک وہ اس کے مدیر رہے۔ ۱۲/دسمبر ۱۹۱۳ء کے اخبار میں قارئین کے لئے ایک اعلان کے ذریعہ مطلع کیا گیا:

''بفضل خدا کالج ترقی کر کے مسلم یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا ہے اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مسلم یونیورسٹی کے درجے

(۱) سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۲

پر پہنچانے کی تجویز ہے۔''(۱)

لہٰذا ۵؍ جنوری ۱۹۲۱ء کے شمارے سے اس گزٹ کا نام ''مسلم یونیورسٹی گزٹ'' ہوگیا جسے مقتدیٰ خان شروانی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس سے ۱۹۲۴ء تک اس اخبار کو شائع کراتے رہے اور آج بھی یہ اخبار اس پریس سے شائع ہو رہا ہے۔

---

(۱) سرسید احمد خاں اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص ۲۴۳

۳۔تہذیب الاخلاق

تہذیب الاخلاق کے معنی ہیں اخلاقی تہذیب یعنی اخلاق کو سنوارنا، سدھارنا۔ کیونکہ زندگی میں اخلاقیات کا بہت بڑا دخل ہے۔ اعلیٰ اور بلند اخلاق ہی انسان کو انسان بناتا ہے اور زندگی میں اعلیٰ اقدار پیدا کرتا ہے۔ سرسیّد احمد خاں مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے تھے اسی لئے انہوں نے انگلینڈ جا کر جدید سائنسی تعلیمی نظام کا معائنہ کیا۔ اور ۱۲/ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو ولایت سے وہ ہندوستان واپس آ کر اپنے سابق عہدے کا چارج لیا اس کے بعد انہوں نے پورا دھیان مسلمانوں کے حصول تعلیم پر لگا دیا۔ لیکن مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں دو سخت رکاوٹیں حائل تھیں پہلی یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی توہم پرستی اس حد تک تھی کہ انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے بلکہ انگریزی تعلیم حاصل کرنے والوں کو کافر سمجھتے تھے۔ اس دور کے مسلمان تعلیم کے مفہوم سے مکمل طور پر ناواقف تھے۔ دوسری سب سے بڑی رکاوٹ اس دور کے گورنمنٹ کی طریقہ تعلیم تھی۔ سرسیّد ہندوستان میں ایک محمڈن یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ موجودہ یونیورسٹیوں کے نظام تعلیم سے ہندوستانیوں میں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں میں حقیقی لیاقت پیدا نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے سرسیّد نے گورنمنٹ کے طریقہ تعلیم کو مسلمانوں کے لئے ناکافی اور ہندوستانی طرز تعلیم کو غیر مفید قرار دیا۔ اس لئے انہوں نے ولایت میں انگریزی زبان میں ایک پمفلٹ شائع کرایا جس کا عنوان تھا 'ہندوستانیوں کے موجودہ نظام تعلیم پر اعتراضات'۔ سب سے پہلے سرسیّد مسلمانوں کی مذہبی خیالات کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی غرض سے ۱۸۷۰ء میں رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری

کیا۔ اس رسالہ کو نکالنے کا ارادہ سرسیّد نے ولایت میں ہی کر لیا تھا اس کے متعلق انہوں نے محسن الملک کو ۱۸۷۰ء میں یہ لکھا تھا کہ :

''ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لئے جاری کرنا تجویز کر لیا ہے اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی میں اور انگریزی میں محمڈن سوشل رفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا منظر نامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوالیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں پر خرید لیا ہے۔''(۱)

پھر دوسرے خط میں ۲۷ رمئی ۱۸۷۰ء کو انہوں نے محسن الملک کو اس پرچہ کے لائحہ عمل اور منصوبہ کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ جمع کریں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور بہ قیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اس میں میں اور آپ دونوں آرٹکل لکھنے والے ہوں گے اور اگر صلاح ہو گی منشی ذکا اللہ صاحب اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹکل لکھنے میں شریک کریں گے۔''(۲)

سرسیّد نے اپنے پرچے ''تہذیب الاخلاق'' کے لئے کاغذ، ٹائیٹل اور اس کا ٹائپ لندن ہی سے بنوا کر اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہندوستان پہنچنے پر سرسیّد نے اپنے دوستوں کی ایک کمیٹی

---

(۱) سرسید احمد خاں، مسافران لندن، ص ۲۶۳

(۲) سرسید کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم، ایڈیٹر معارف، حالی پریس پانی پت، ص ۶۸

بنائی جس میں طے پایا کہ تہذیب الاخلاق کے اخراجات کے لئے ہر ممبر سے ساٹھ روپیہ سالانہ اور عام خریدار سے ساڑھے چار روپیہ سالانہ لیا جائے گا۔ تہذیب الاخلاق کا اجراء ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو سرسیّد نے کیا اور اعلان کیا کہ :

''اس پرچہ میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپہ ہوتے ہیں اور اس سب سے اخبار مصادر دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس پرچے کے اجرا سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسن ومعاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جائیں۔''(۱)

اس شمارے کے متعلق انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ :

'' تہذیب الاخلاق کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی حالت، معاشرت کی اصلاح مقصود ومطلوب ہے اور اسی واسطے سوشل رفارمر یعنی تہذیب الاخلاق اس کا نام رکھا۔''(۲)

تہذیب الاخلاق کا پہلا شمارہ ۱۲۸۷ھ بمطابق ۲۴ر دسمبر ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اور یہ پرچہ لگاتار چھ برس تک نکلتا رہا۔ ایڈیٹر کی ذمہ داری خود سرسیّد نے سنبھالی۔ چونکہ یہ پرچہ صرف قوم کی بھلائی کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اس لئے اس سے جو بھی آمدنی ہوتی تھی وہ رسالے کی ترقی میں خرچ کردی جاتی تھی۔ لہٰذا تہذیب الاخلاق کوئی تجارتی پرچہ نہیں تھا اس لئے آخری جلدوں میں ہر نمبر کی پیشانی پر بطور ماٹو (مونوگرام) یہ عربی فقرہ لکھا جاتا تھا۔

(۱) رسالہ تہذیب احلاق، جلد ۱۱، شمارہ ۱، ۱۸۷۰ء، ص ۲

(۲) ایضاً، ص ۸

"حب القوم من الا یمان فمن یسع فی اعزاز قومه انما یسعیٰ فی اعزازدینه" ترجمہ:
(قوم کی محبت جزوایمان ہے جس نے قوم کا اعزاز بڑھانے کے لئے کوشش کی اس نے دین کے اعزاز کی کوشش کی)۔(۱)

ابتدا میں یہ رسالہ پندرہ روزہ تھا لیکن بعد میں یہ رسالہ ماہ نامہ ہو گیا اس کے لکھنے والوں میں سرسیّد کے علاوہ الطاف حسین حالؔی، محسن الملک، وقارلملک، ذکاءاللہ اور احسان اللہ عباسی وغیرہ تھے۔ سرسیّد کے زمانے میں یہ رسالہ کسی وجوہات کی بنا پر تین بار بند ہوا۔

پہلی بار : ۲۴/دسمبر ۱۸۷۰ء تا ۲۰/دسمبر ۱۸۷۶ء

دوسری بار :۲۳/اپریل ۱۸۷۸ء تا ۲۸/جولائی ۱۸۸۰ء

تیسری بار :۷/اپریل ۱۸۹۳ء تا ۳/فروری ۱۸۹۷ء ہے

سرسیّد کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء سے تہذیب الاخلاق محسن الملک کی ادارت میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ساتھ دسمبر ۱۹۰۷ء تک شائع ہوا۔ بعد میں اس کے مدیر وحیدالدین سلیم ہو گئے جو اشاعت کا انتظام ۱۹۰۹ء تک کرتے رہے۔ کافی مدت کے بعد سید حامد (وائس چانسلر علی گڑھ) نے اس کی اشاعت فروری ۱۹۸۲ء میں شروع کی جو ابھی تک جاری ہے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق کی معنویت کا اندازہ سرسیّد احمد خاں کے مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

"جب ہم کچھ اوپر ڈیڑھ سو برس کی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے
ہیں کہ لندن میں بھی وہ زمانہ ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہندوستان میں
ہے اور وہاں بھی اس زمانے میں اس قسم کے پرچے جاری ہوتے تھے
جن کی سبب تمام چیزوں میں تہذیب وشائستگی پیدا ہوتی تھی۔"(۲)

---

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص۱۶۴

(۲) سرسیداور ان کا عہد، ثریا حسین، ص۲۴۶

'اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر، کی طرح تہذیب الاخلاق نے بھی ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کو متاثر کرنے میں کافی اہم رول ادا کیا۔ ''ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر '' میں مذہبی خیالات پر گفتگو نہیں کی جاتی تھی کیونکہ مارٹن لوتھر اور دوسرے مذہبی رہنما پہلے ہی مذہبی رسم و رواج میں کافی اصلاح کر چکے تھے۔ لیکن تہذیب الاخلاق میں مذہبی بحث ایک لازمی جز بن گئی تھی کیونکہ سرسیّد اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ مسلمانوں میں قومی ترقی مذہب سے وابستہ ہے۔ جس وقت مسلمان تیز رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے اس وقت ان کا مذہب زندہ جاوید تھا۔ جیسے جیسے فرسودہ رسم و رواج بڑھتے گئے اور مسلمان ترقی کے بجائے تنزل کی جانب بڑھنے لگے۔ سرسیّد مسلم قوم کی اصلاح چاہتے تھے اس لئے انہوں نے سب سے پہلے مذہب کی جانب توجہ کی سرسیّد ایک جگہ لکھتے ہیں کہ :

''اسٹیل اور ایڈیسن کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے زمانہ کے لوگ ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے اور قدر کرتے تھے اور ہماری یہ بدنصیبی ہے کہ ہماری تحریروں کو مذہب کے برخلاف کہا جاتا ہے اور ان کا پڑھنا عذاب سمجھا جاتا ہے۔''(۱)

اسی وجہ سے مذہبی اوہام پرستی مسلمانوں کی ترقی و عروج میں حائل تھیں۔ یوں تو اس رسالے میں لکھنے والوں کی تعداد بہت تھی لیکن سب سے زیادہ سرگرم خود سرسیّد، مولوی، سید مہدی علی خاں اور چراغ علی تھے۔ سرسیّد احمد خاں مذہب، اخلاق و معاشرت اور تمدن پر مضامین لکھتے تھے۔ شروع میں اس پرچہ کی کافی مخالفت ہوئی اور اس پرچے کو مات دینے کے لئے بہت سے پرچے مثلاً کانپور سے نورالافاق'' اور نورالانوار'' نکالے گئے۔ اس کے علاوہ اہل حدیث کے مکتب فکر والوں نے بھی ایک رسالہ 'اشاعت السنۃ'، بھی نکالا، ساتھ ہی سرسیّد پر کفر کا فتویٰ بھی

(۱) تہذیب الاخلاق، یکم محرم ۱۲۸۹ھ، ص۵

جاری کیا گیا یہاں تک کہ ان کے دوستوں اور عزیزوں کو بھی نیچری اور کرسٹان کہا گیا۔(۱) ان سب وجوہات سے ایک تعلیمی ادارہ جو کہ سرسیّد کا خواب تھا قائم کرنا مشکل ہونے لگا۔

تہذیب الاخلاق ہندوستانی مسلمانوں میں کافی مقبول تھا چنانچہ اس کے اگلے شمارہ کا لوگوں کو بے چینی سے انتظار رہتا تھا اس رسالے کی مقبولیت کے باعث اس کے مخالفین بھی دھیرے دھیرے تہذیب الاخلاق کے قائل ہونے لگے۔لیکن اس میں سرسیّد کی اصلاحی باتوں کو وہ اچھا نہیں سمجھتے تھے اگر سرسیّد اس رسالے کے ذریعہ مسلمانوں کے خیالات کی ترویج چھوڑ دیتے تو شاید اس رسالے کی زیادہ مخالفت نہ ہوتی۔لیکن ساتھ ہی اس کی مالی امداد بھی کم ہو جاتی جو کہ سرسیّد کی تحریک کے لئے ضروری تھی۔

تہذیب الاخلاق کا خاص مقصد یہ تھا کہ جو خیالات مسلمانوں کی ترقی اور تمدن میں رکاوٹیں ہیں۔اور جن کا مذہب سے کچھ لینا دینا نہیں ہے ان کو جہاں تک ممکن ہو اسے دور کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام ترقی اور تمدن کا دشمن نہیں ہے۔دوسرا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں جو ترقی یافتہ قومیں ہیں ان کی ترقی کے اسباب سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جائے غیر ضروری رسم و رواج سے ہندوستانی مسلمانوں کو نفرت دلائی جائے۔اس کے علاوہ مسلمانوں میں جو بھی اخلاقی برائیاں تھیں انہیں دور کیا جائے۔علوم جدیدہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی دلچسپی بڑھائی جائے۔ اس زمانے کے مسلمانوں میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ وہ لکیر کے فقیر ہوا کرتے تھے۔انہیں علوم قدیمہ سے حد درجہ لگاؤ اور علوم جدیدہ سے نفرت تھی۔ سرسیّد نے اس پرچہ کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو علوم جدیدہ کی طرف راغب کرانے کی کوشش کی۔اس پرچہ کے ذریعہ سرسیّد اسلام کی صحیح تصویر مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے اور ان کے اکابر و اسلاف کے کارناموں سے انہیں روشناس کرانا چاہتے تھے اور اس طرح انہوں نے اس رسالے کے ذریعہ

قوم کے مردہ دلوں کو از سرِ نو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ان تمام مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے سرسیّد اور ان کے دوستوں نے صرف اپنی ہی رائے نہیں بلکہ یورپ کے مصنفین کے خیالات کو بھی جہاں تک ممکن تھا اپنی زبان میں بیان کیا۔

اس پرچہ کے مقبول ہونے کے بہت سے اسباب تھے سب سے پہلا سبب سرسیّد کے دل نشین تحریر اور سید مہدی علی کی دلکش آرٹکل تھے۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ سرسیّد کی تحریر لکھنے کے بعد انسان اپنے عقیدہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ سید مہدی علی خاں کی تحریروں کے بارے میں بھی کم و بیش یہی کہا جاتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اس رسالے میں ہر بات نرمی اور سنجیدگی سے کہی جاتی تھی جو کہ اس زمانے کے برخلاف تھی۔ اس کے ذریعہ کسی شخص کی دل آزاری نہیں کی جاتی تھی بلکہ ہمیشہ قوم کی عام حالت پر سنجیدگی سے غور وفکر کی جاتی تھی۔ اس رسالے کے ذریعہ مخالفوں کے اعتراضات کے جواب اگر نہایت ضروری ہوتے تبھی دیا جاتا تھا اور استدلال کے ساتھ دیا جاتا تھا۔ ورنہ اس کے جاری کرنے کا صرف یہ مقصد تھا کہ جو بات صحیح معلوم ہو وہ لوگوں کے کانوں تک پہنچا دی جائے۔ انہیں ماننے پر مجبور نہ کیا جائے۔

تہذیب الاخلاق میں عام خبریں نہیں چھپتی تھی لیکن مدرستہ العلوم کے متعلق روئدادیں اور تمام حالات اس میں چھاپے جاتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کے اشاعت کا یہ نتیجہ نکلا کہ اس کے مضامین نے لوگوں کے خیالات میں انقلاب برپا کر دیا۔ دوسری طرف کالج کے لئے چندے کی رقم میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اس رسالے میں سرسیّد کی سرگرمیوں اور کوششوں کا ہمیشہ ذکر کیا جاتا تھا جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں مدرستہ العلوم کی عظمت دن بہ دن بڑھتی گئی۔

تہذیب الاخلاق سے پیشتر بہت سے اخبارات مثلاً 'جام جہاں نما' (کلکتہ سے) 'دہلی اخبار' سید الاخبار' اردو اخبار، زبدۃ الاخبار، مراۃ الاخبار، اودھ اخبار، صادق الاخبار، وغیرہ نکل

رہے تھے۔لیکن یہ تمام اخبارات اور پرچے سرسید کے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے تہذیب الاخلاق نکالنا شروع کیا۔اس رسالے کے نکالنے کا مقصد تھا قوم کی ذہنیت کو بیدار کرنا، ان کو زمانے کے ساتھ چلنا سکھانا، مسلمانوں کی ترقی کا سبب دریافت کرنا، ان کے معاشرت کی اصلاح کرنا، انہیں ٹیکنالوجی اور جدید علوم کی طرف متوجہ کرنا اور ملک وقوم میں بیداری اور روشن خیالی پیدا کرنا۔سرسیّد تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''مقصود اس پرچے کے اجرا سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام اس ترقی کے مانع ہیں وہ مٹا دیئے جائیں۔''(۱)

تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے میں لکھتے ہیں کہ :

''اس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تا کہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز مہذب قومیں کہلاویں۔''(۲)

تہذیب الاخلاق کے مقاصد میں ایک یہ بھی تھا کہ اسلام پر عیسائیوں کی نقطہ چینیوں کو تحقیق کے ساتھ رفع کیا جائے اسلام ترقی و تعلیم کے خلاف نہیں۔اس کے لئے انہوں نے بہت سے مضامین لکھے اور یوروپی مصنفین کی تحریریں بھی اردو میں ترجمہ کر کے چھاپی گئیں پہلے شمارے میں سرسیّد لکھتے ہیں کہ:

---

(۱) تہذیب الاخلاق جلد۳، شمارہ۱۔یکم محرم الحرام ۱۲۸۹ھ، ص۲، بحوالہ تہذیب الاخلاق کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، نفیس بانو ص۳۱۱

(۲) تہذیب الاخلاق جلد۱ یکم شوال ۱۸۷۰ء، ص۱

''............ بذریعہ اس پرچے کے جہاں تک ہم سے ہو سکے
ان کے دین دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم
میں ہیں گو ہم کو دیکھائی نہ دیتے ہوں مگر غیر قومیں ان کو بخوبی
دیکھتی ہیں ان سے ان کو مطلع کریں اور جو عمدہ عمدہ باتیں ان
میں ہیں ان میں ترقی کرنے کی ان کو رغبت دلاویں۔'' (۱)

تہذیب الاخلاق نے سب سے زیادہ عصری علوم وفنون کی طرف توجہ دلائی اس نے لوگوں میں ترقی کا شوق پیدا کیا اور مسلمانوں کے ادبی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی معیار کو اونچا کرنے میں کافی اہم رول ادا کیا۔ سرسیّد نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ عام مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا اور اس کی ضروریات وافادیت کا احساس دلایا۔ اس پرچہ نے عام مسلمانوں کو تعلیم کا وہ راستہ دکھایا جن پر چل کر ترقی کے راستے ہموار ہو سکتے تھے۔

نذیر احمد نے اپنے ایک مضمون میں دہلی میں مقیم کئی طالب علموں کا حال لکھا ہے جو مسجدوں میں رہتے تھے اور صرف خانقاہی تعلیم حاصل کرتے تھے بعد میں انہیں جدید تعلیم کی ضرورت وافادیت کا احساس ہوا اور وہ جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ مذہبی اوہام پرستوں نے اس کا الزام نذیر احمد کے سر عائد کیا کہ انہوں نے ہی ان طالب علموں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''حاشا کہ ان کو انگریزی پڑھنے کی ضرورت ہو یا میں نے ان کو
بہکایا ہو۔ بھلا مجھے کے رکعت کا ثواب۔'' (۲)

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شروع میں تہذیب الاخلاق کی بہت زبردست مخالفت

---

(۱) تہذیب الاخلاق جلد ا، شمارہ ا۔ یکم محرم الحرام ۱۲۸۹ھ، ص ۳

(۲) نذیر احمد، مضمون تہذیب الاخلاق، مشمولہ، تہذیب الاخلاق، جلد ا، شمارہ ا یکم شوال ۱۸۹۴ء، ص ۹

ہوئی۔ اس کے باوجود بھی یہ پرچہ اپنے اغراض و مقاصد سے ذرہ برابر بھی منحرف نہیں ہوا۔ تہذیب الاخلاق سے پہلے اور بعد میں بھی بہت سے اخبار ورسائل شائع ہوتے رہے لیکن ان کی اتنی زبردست مخالفت نہیں ہوتی تھی جتنی کہ تہذیب الاخلاق کی ہوتی تھی۔ مرور ایام کے ساتھ تہذیب الاخلاق مستند علماء کے خانوادے میں بھی مقبول ہونے لگا۔ دسمبر ۱۸۷۳ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں تہذیب الاخلاق کے اثرات کو نام بہ نام گنوایا۔

۱۔ جو مسلمان پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے انہوں نے نعل جڑوا لئے اور کان تک نہ ہلایا۔

۲۔ الفاظ، قوم، قومی ہمدردی، قومی خیر خواہی ہمارے روزمرہ میں داخل ہوگئے۔

۳۔ لوگوں کو اپنے خیالات آزادی کے ساتھ ظاہر کرنے کی جرأت ہوئی۔

۴۔ دلوں میں تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا۔ (۱)

تہذیب الاخلاق نے اپنے اغراض و مقاصد میں زبردست کامیابی حاصل کی۔ یہ پرچہ وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری کر رہا ہے یعنی کہ اس کے زیر اثر ہندوستانی قوم اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان ترقی کے راستے پر گامزن ہوئے۔ سرسیّد تیسرے دور کے تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں کہ :

''لوگ سوتے تھے ہم جھنجھوڑتے تھے لوگ بہرے تھے ہم چلاتے تھے وہ زمانہ گیا۔ نہ وہ ہم رہے نہ وہ وہ رہے۔ لوگ جاگے ہیں اور قومی ہمدردی کا راگ گاتے ہیں، الاپتے ہیں، مگر ہاں بے سرے ہیں زمانے نے چال بدلی ہے اور نئی شطرنج بچھائی ہے پھر پرانی چالیں نہ کام کی ہیں اور نہ چلی جاسکتی ہیں۔ بخار دھیما پڑ گیا ہے پھر دوا بھی ایسی نہیں چاہیئے۔ تکفیر کے

---

(۲) تہذیب الاخلاق جلد۱، شمارہ۲، یکم ذیعقدہ ۱۳۱۱ھ، ص ۱۱۷ بحوالہ تہذیب الاخلاق کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ نفیس بانو ص ۱۲۳

فتوے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں ۔نفرت الفت میں بدل گئی ہے......اگر اب تہذیب الاخلاق کا کچھ کام باقی ہے تو صرف انانیت کو مٹانا اور الحق بلوانا ہے۔ بند پانی بہہ نکلا ہے مگر ٹیڑھی راہ چلا ہے اور پتلی پتلی دھاروں میں بہتا ہے ۔اب تہذیب الاخلاق کا کام اس کو راہ پر لانا اور سب دھاروں کو اکٹھا کر دریا بنانا ہے۔''(۱)

سید مہدی علی بھی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ :

''تہذیب الاخلاق تمام علمی اور عملی ،تمدنی اور اخلاقی دینی اور دنیاوی باتوں پر حاوی ہے۔ ہر نقص کا دور کرنا، ہر قسم کی اصلاح کرنی اور ہر طرح کی ترقی کی تدبیریں جتانی اس کا مقصود ہے۔''(۲)

سرسیّد احمد خاں کا خاص مقصد قوم کو ایک بہتر زندگی کا تصور دینا تھا اس کے لئے انہوں نے خود معاشرہ کی درستگی اور اس سے متعلق موضوعات پر مضامین لکھے اور دوسروں سے بھی لکھنے کی فرمائش کی ۔سرسیّد نے رسم و رواج ، ہمدردی، تربیت اطفال ، ازادئ رائے ،عورتوں کے حقوق ،تعلیم وتربیت ،علوم جدیدہ، کاہلی ،طریق تناولِ طعام، اخلاق ، ریاکاری ،خوشامد وغیرہ جیسی معاشرتی واخلاقی مضامین لکھے۔انہوں نے تعلیم پر بھی بہت زور دیا۔تعلیم پر کچھ عنوانات جنہیں سید احمد خاں کی تعلیمی سرگرمیوں کی روداد بھی کہا جاسکتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۔ مذہب اور تعلیم

---

(۱) تہذیب الاخلاق جلد۱،شمارہ۱۔یکم شوال ۱۳۱۱ھ، ص۱

(۲) تہذیب اخلاق کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ،نفیس بانو، ص۱۱۴

- مسلمانوں کی تعلیم وتربیت کے لئے گورنمنٹ کی تدبیریں
- مسلمانوں اور تعلیم زبان انگریزی
- ہندوستانیوں کی تعلیم ولایت میں
- طریقہ تعلیم مسلمانان

سرسیّد نے اپنے مضامین میں مذہب کو جدید زندگی کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے وہ اپنے مضامین میں ایسے مذہبی مسائل کو زیر بحث لائے ہیں جن کا تعلق عام زندگی سے براہ راست استوار تھا۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ مذہبی معاملات سے پہلو تہی کرنا ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے۔ انہوں نے بہت سے دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام ایک بہتر مذہب اور دین فطرت ہے۔ انہوں نے اسلام کا سائنٹفک نقطہ نظر سے مطالعہ اور تجزیہ کیا۔ ساتھ ہی انہوں نے تفسیری مضامین مثلاً سورۃ فیل، سورۃ جن اور السمٰوٰۃ کی تفاسیر لکھی۔ تفسیر السمٰوٰۃ کے ذریعہ مسلمانوں میں جو غلط فہمیاں رائج ہوگئیں تھیں اسے دور کرنے کی کوشش کی۔ اس تفسیر میں انہوں نے اسلام کی رو سے حقیقت کو بیان کیا اور یونانی فلسفے کے نتیجوں کو غلط ثابت کیا۔ انہوں نے اسلام کے دیگر علما جیسے امام غزالی اور شاہ ولی اللہ کے مضامین کا اردو ترجمہ کروایا اور انہیں بھی تہذیب الاخلاق میں شائع کروایا۔

لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ تہذیب الاخلاق اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مضامین فکر انگیز، اخلاقی اور معاشرتی ہوتے تھے۔ ان مضامین کی زبان سادہ، سلیس، شستہ بیان موثر ہوتے تھے۔ تہذیب الاخلاق اور اس میں سرسیّد کے تحریر کردہ مضامین نے یہ ثابت کردیا کہ سرسیّد ایک بہترین صحافی اور مشعل بردار رہنما تھے جو ہمیشہ قوم کی ترقی کے لئے فکرمند رہتے تھے۔

۴۔ مدرستہ العلوم/محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

انیسویں صدی کے نصف میں جب مغلیہ عہد کا آخری چراغ بجھنے ہی والا تھا کہ سرزمین ہند سے ایک ایسی شخصیت ابھر کر سامنے آئی جسے ہم ایک مصلح قوم، مسلمانوں کا مسیحا اور عظیم دانشور کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ میری مراد جواد الدولہ عارف جنگ سر سیّد احمد خاں بہادر سے ہے۔ جنھوں نے ہندوستانی لوگوں کے اندر سے منفی فکر ختم کر کے ان کے اندر مثبت فکر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ زمانے کے تقاضے کو سمجھا اور وقت کی نزاکت وعصری تقاضوں کے پیش نظر سر سیّد نے مسلمانوں کے اندر تعلیمی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی اصلاح کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کی اور ان کی یہ کوشش بلاشبہ کامیاب ثابت ہوئی سر سیّد جدید علوم کے علمبردار تھے اور ان کا ماننا تھا کہ مغرب سے فیض اٹھائے بغیر ہم کسی مفید اور کارآمد تعلیم کا تصور نہیں کر سکتے۔ المختصر سر سیّد کی تمام تحریروں اور تقریروں کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ سر سیّد جدید تعلیم کے حامی تھے۔ جدید تعلیم سے ان کی مراد ایسی تعلیم تھی جو ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ ان ہی سب مقاصد کے تحت سر سیّد احمد خاں نے ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کو مدرستہ العلوم کی بنیاد ڈالی اس تدریسی مرکز کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ جدید علوم کے ساتھ ساتھ یہاں کے طلباء کو عمدہ تربیت سے بھی آراستہ کیا جائے۔ اور اس میں انگریزی کے تمام علوم فنون کی تعلیم دی جاۓ جو نوجوانوں کو سرکاری ملازمت، اور ضرورتوں کے لحاظ سے پورے اتریں۔ نیز یہ کہ یہ مدرسہ انگریزی دانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرے۔ جو انگریزی زبان میں وسعت اور صلاحیت پیدا کر سکے اور سائنس اور ٹکنالوجی جیسے علوم پر اعلیٰ درجے کی واقفیت

ہو سکے لیکن عام تعلیمی اداروں میں اس بات پر کم ہی توجہ دی جاتی تھی اور جس کی جھلک آج بھی علی گڑھ کے طلبا میں دیکھی جاسکتی ہے۔

مدرستہ العلوم کے قیام عمل سے قبل ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں اشتہار کے ذریعہ خواہاں حضرات سے مدرسین کے عہدے کے لئے درخواستیں مطلوب کی گئیں۔اس میں مدرسین کا بھی ذکر تھا۔ایسے مدرسے میں تعلیم کا سلسلہ یکم جون ۱۸۷۵ء سے شروع کیا گیا شروع میں مدرسہ میں سات مدرسین تھے۔اس مدرسے میں داخل ہونے والا پہلا طالب علم مولوی سمیع اللہ کے صاحب زادے محمد حمید اللہ خان تھے۔رفتہ رفتہ ہندوستان کے کونے کونے سے طالب علم آنے لگے۔اس مدرسہ میں انگریزی کے ساتھ ساتھ دینیات اور دوسرے علوم شرقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔جو طلبا انگریزی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے انہیں عام علوم کی تعلیم انگریزی میں دی جاتی تھی۔اور دوسری زبان کے طور پر انہیں عربی وفارسی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تھا۔جو طلبا مشرقی زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے انہیں ریاضی،تاریخ،جغرافیہ اور دینیات کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی اور انہیں انگریزی،دوسری زبان کی حیثیت سے پڑھنا پڑتا تھا۔سات مہینے کی قلیل مدت میں اس مدرسہ میں نواسی طلبا نے داخلہ لیا۔لیکن سال کے آخر میں ان کی تعداد گھٹ کر چھیاسٹھ ہوگئی۔ابتدا میں نصابی کتابیں دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے کچھ مشکلات پیش آئیں جس کی وجہ سے غیر تدریسی کتابیں پڑھانی پڑتی تھیں۔

اس مدرسہ کے تعلیمی نظام میں سرسیّد نے آکسفورڈ اور کیمبرج کے علاوہ ترکی کی پیروی کی کیونکہ ترکی مغرب ومشرق کی بہترین روایات کا ایک عمدہ اور حسین امتزاج پیش کرتا تھا اسی وجہ سے سرسیّد نے اس مدرسہ کے طلبا کے لئے یونیفارم تجویز کیا جس میں ترکی کوٹ اور ترکی ٹوپی شامل تھی۔ مدرسہ شروع ہونے کے ساتھ ہی طلباء کے رہنے کے لئے ایک بورڈنگ ہاؤس کا قیام عمل میں آیا

۔ بعد میں نومبر کے مہینے میں ایک دوسرا بورڈنگ ہاؤس کھولا گیا جن کے وارڈن بتدریج مولوی ابوالحسن اور بعد میں محمد اکبر ہوئے ۔(۱) بورڈنگ ہاؤسوں میں رہنے والے طلبا وقت کے پابند ہوتے تھے ان کے لئے پانچوں وقت کی نماز ، تراویح ، ملاد شریف میں حاضری تلاوت قرآن پاک اور ورزش لازمی ہوا کرتے تھے ۔اسکول کی پڑھائی نو بجے سے ظہر تک ہوتی تھی ۔اس کے بعد چار بجے تک مدرسہ میں دینیات کی تدریس ہوتی تھی ۔طلبا کے لئے شفاخانہ کا بھی انتظام تھا یہ بورڈنگ ہاؤس سرسیّد کے خوابوں کی تعبیر تھی جوانھوں نے برطانیہ کے درس گاہوں میں دیکھے تھے لہٰذا دسمبر ۱۸۹۴ء میں طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :

> ''مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس سے چھپی ہوئی ہے نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔
>
> اے عزیزو! اس کتاب کا نام ''کالج لائف'' یا اقامتی زندگی'' ہے ۔یہی اصل کتاب ہے اور اس کا پڑھنا اور سمجھنا اصل فائدہ اور اصل مقصد زندگی کا، اور اس کالج کا ہے ۔اس کتاب کو تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور داغ دار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہیے ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہے۔''(۲)

۸؍جنوری ۱۸۷۷ء کو ایم ۔اے ۔کالج کا سنگ بنیاد وائسرائے ہند لارڈ لٹن کے

---

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جولائی ۱۸۷۵ء، ص ۴۱۱

(۲) تہذیب الاخلاق، سرسید نمبر، جلد ۱، شمارہ ۱، یکم رجب ۱۳۱۲ھ، ص ۸۵۔۱۸۱

ہاتھوں رکھا گیا۔اس موقع پر سیّد محمود نے ایک رپورٹ پڑھا اور کہا کہ اس جگہ پر کالج کا مرکزی ہال بنے گا جو یو پی کے لفٹنٹ گورنر سر اسٹریچی کے نام سے موسوم ہوگا جنہوں نے ہمیشہ ہماری ہمت افزائی کی اور اس کے بعد پھر کالج کی توسیع کا منصوبہ پیش کیا گیا۔ یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کی کلاسیں باقاعدہ شروع ہوگئیں اور پہلی مرتبہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے چار طلبا نے انٹرنس کے امتحان میں کلکتہ یونیورسٹی سے شرکت کی۔ محبوب عالم نے امتحان اول درجہ میں پاس کیا دوسرے ایک ہندو طالب علم ہرناتھ سنگھ جو سکنڈ ڈویزن سے پاس ہوئے۔ سر سیّد مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے صرف اس لئے آراستہ نہیں کرنا جانتے تھے کہ اس کے ذریعے مسلمانوں میں سرکاری نوکریاں ملیں بلکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ سائنسی علم حاصل کرنے کے لئے مغربی تعلیم حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے اشد ضروری ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ سائنسی تعلیم سے بھی آراستہ ہوں وہ چاہتے تھے کہ اگر مسلمانوں نے مغربی تعلیم حاصل نہیں کیا تو وہ زمانہ کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ یہی وجہ تھی جس نے سر سیّد کو ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی تعلیم اور سائنس کے مطالعہ میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

چونکہ سر سیّد ایک قوم پرست انسان تھے اس لئے انہوں نے کالج کا دروازہ سب کے لئے کھلا رکھا۔ اس میں سبھی قوم و مذاہب کے طلبا تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ یہ ۲۴ر فروری ۱۸۸۴ء کو جالندھر کی ایک تقریر میں سر سیّد نے اس سلسلے میں کہا کہ ''اگر دونوں یعنی ہندو اور مسلمان نے ایک ہی بنچ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی، ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں دونوں اکٹھا رہے۔ اور ایک ہی استاد سے علم کا استفادہ کیا تو دونوں میں اخوت، ہمدردی اور محبت پیدا ہوگئی۔'' سر سیّد اس ادارہ کو دنیا کی ایک بہترین تعلیمی ادارہ بنانا چاہتے تھے جہاں بہترین تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبا کی بہترین

تربیت بھی ہو۔

جب اسکول اور کالج قائم ہوا تو ملک کے کونے کونے سے اس کی شدید مخالفت کی جانے لگی اور یہاں تک کہ سرسیّد پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا یہ بھی فتویٰ دیا گیا کہ جو بھی اس اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا وہ کافر ہوگا۔ فتوے میں اس اسکول کو مسلمانوں کو گمراہ کرنے والا کہا گیا اور یہ مشورہ دیا گیا کہ مسلمانوں کے ایسے اسکول کو مسمار کر دینا چاہیے۔ لیکن سرسیّد اپنے دھن کے پکے تھے اس لئے ان پر ایسے فتوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ سرسیّد اکثر اس کو گنگناتے رہتے تھے:

؎ ''وہ ہو کے ترشِ روح مجھے گالی ہزار دے

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترُشی اتار دے''

سرسید کی دلی خواہش تھی کہ علی گڑھ اسکول و کالج کے تعلیم و تربیت کا معیار اتنا اعلیٰ ہو کہ یہاں کے طلبا اپنے طرز گفتگو، طور طریقے، ادب و آداب اور تعلیمی معیار سے پہچانے جائیں۔ سرسیّد نے اپنی پوری زندگی اسکول و کالج کے لئے وقف کر دی۔

سرسیّد نے ۱۸۷۷ء میں ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے شمارے میں تحریر فرمایا کہ یہ کالج بے تعصبی اور ترقی کے اصول پر مبنی ہے جس کی نذیر مشرق کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی ہے۔ وہ اس کالج کو مشرق و مغرب کے درمیان ایک پُل بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کالج کو جدید و قدیم خیالات کا سنگم کے نام منسوب کیا ہے اور زور دیا کہ اس کالج کے تعلیمی نظام کے سلسلے میں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کی پیروی کا فرق صرف یہ تھا کہ انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن اس کالج میں اسلام سے متعلق تعلیم دی جانے گی۔

سرسیّد احمد خاں نے کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی عمارتوں کو بنوانے کا خاصا دھیان دیا۔ اس کام کے لئے انہوں نے قرض بھی لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دھیرے دھیرے ہندوستانی مسلمان کالج

کی افادیت سے واقف ہوگئے اور اس سے جڑنے لگے۔ اس کالج میں دو ڈیپارٹمنٹ کھولے گئے۔

۱۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ

۲۔ اورینٹل ڈیپارٹمنٹ

انگریزی بطور دوسری زبان پڑھائی جانے لگی اور اس کے لئے صرف ایک گھنٹہ مقرر کیا گیا اورینٹل ڈیپارٹمنٹ میں علوم جدیدہ اور عربی و فارسی ادب پڑھایا جانے لگا کالج کے انتظام کے لئے چار کمیٹیاں بنائی گئیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ کمیٹی مدبرانِ تعلیم السنہ مختلفیہ وعلوم دینویہ کی ہدایت اور رہنمائی پر مدرستہ العلوم کی ترقی منحصر تھی۔

۲۔ کمیٹی مدبرانِ تعلیم مذہب اہل سنت جماعت

۳۔ کمیٹی مدبرانِ تعلیم مذہب شیعہ اثنا عشریہ

۴۔ منتظم مدرستہ العلوم کمیٹی کے ہاتھ میں مدرستہ العلوم اور بورڈنگ ہاؤس کے اندرونی انتظام کا اختیار تھا۔

کمیٹی مدبران تعلیم السنہ مختلفیہ وعلوم دینویہ کے صدر'' کے۔ڈپن'' نائب صدر سر سیّد احمد خاں، سکریٹری مولوی سیع اللہ خاں تھے۔ ایچ۔ جی۔ آئی سڈن، مولوی اکبر اور مولوی عباس حسین آفیسیل رکن تھے۔ دیگر ممبران میں ڈبلو ایچ اسمتھ خان ایلیٹ، ایچ جی کیس، آرکلینڈ کالون، نواب محمد ضیاء الدین احمد خاں، عنایت رسول، منشی ذکاء اللہ، سید محمود، مولوی عبیداللہ، سید حسن کریم بخش، الطاف حسین حالی، محمد اسمٰعیل، چراغ علی، محمد حسین، خواجہ یوسف، اور سید مہدی علی تھے۔

سید احمد مدرستہ العلوم کو ولایت کی یونیورسٹی کا ایک نمونہ ہی نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہاں کی کسی یونیورسٹی کے ساتھ اس کا الحاق بھی چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں کوششیں بھی کی گئیں جب مسٹر بیک کالج کے پرنسپل بنائے گئے تو انہوں نے سرسیّد کے کہنے پر'' کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو لکھ کر الحاق کے امکانات کا پتہ لگانے کی کوشش کی تھی۔''(۱) اس اجمال کی تفصیل انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایک مضمون میں ملتی ہے جس میں کہا گیا تھا کہ :

''اس آرٹیکل کا مقصد ہمارے ناظرین اخبار کے روبرو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے متعلق ایک ایسی تجویز پیش کرنا ہے جس کی نسبت ہم کو یہ خیال دلایا گیا ہے کہ شاید آئندہ اسکا پورا کرنا ممکن ہو۔

کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیاں صدیوں سے صرف دارلعلوم ہی نہیں ہیں وہ ان شخصیتوں کی تعلیم و تربیت کے مقامات بھی ہیں جو پبلک لیف میں بڑی مستعدی سے شریک ہوتے ہیں ......کیمبرج کی یونیورسٹی کو حال میں اپنے رعب داب اور اپنے فرائض کی نسبت ایک زیادہ وسیع تر خیال پیدا ہوا ہے یعنی اس نے ایک ایسا قانون منظور کیا جس کی رو سے وہ کالج جو کیمبرج سے دور واقع ہوں اس کے ساتھ ایفیلیٹ (Affiliate) ہوسکتے ہیں ......ہمارے واسطے سب سے زیادہ کارآمد چیز اس قانون میں یہ ہے کہ اس میں ہر ایک کالج کے ایفیلیٹ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جو قلم رو

(1) Jawaharlal Nehru, The Selected Documents , P.309

انگریزی کے کسی حصے میں واقع ہو۔ یعنی یونیورسٹی مذکور اب
اپنے تئیں ایک خاص جزیرے سے متعلق نہیں سمجھتی بلکہ وہ ایک
امپریل یعنی شاہی یونیورسٹی ہوگئی ہے۔''(۱)

مدرستہ العلوم کا الحاق کیمبرج یونیورسٹی سے نہیں ہوسکا لیکن اس کے یونین کلب کا کیمبرج یونیورسٹی کی یونین سے الحاق ضرور ہوگیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ :

''منجملہ ان چیزوں کے جو مدرستہ العلوم میں دلچسپی کی ہیں،
ایک سڈنس کلب بھی ہے اس کلب کے ساتھ اس کالج کے اول
پرنسپل کا نام وابستہ ہے۔ کلب کا کاروبار عموماً کیمبرج یونین
کے قواعد کے موافق ہوتا ہے جس سے وہ ایفیلیٹ ہوگیا
ہے......جن مضامین پر بحث ہوتی ہے وہ معمولاً سوشل یا نیم
پولیٹیکل قسم کے ہوتے ہیں۔''(۲)

سرسیّد کے تعلیمی نظریہ کے متعلق محسن الملک نے لاہور کے ایک عام جلسے میں کہا تھا کہ :

''سرسیّد مسلمانوں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا چاہتے تھے جو ازروئے
مذہب مسلمان ہو، ازروئے خون ورنگ ہندوستانی ہو، مگر باعتبار مذاق
، رائے اور فہم کے انگریز ہو۔''(۳)

آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں مدرستہ العلوم کے لئے مشعل راہ تھیں اس سلسلے میں سرسیّد نے کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان کے سامنے کہا تھا کہ :

---

(۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴/مئی ۱۸۸۴ء، ص ۲۸
(۲) انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۶/اکتوبر ۱۸۸۵ء، ص ۱۳
(۳) محسن الملک، مجموعہ لیکچر واسپیچز، ص ۳۰۶

''کیمبرج اور آکسفورڈ کی دو یونیورسیٹیاں ہماری ہدایت کے لئے موجود ہیں۔ پس ہمیشہ ہم کو ان کی ہی تقلید و پیروی سے سلسلہ کتب درسیہ کا معین کرنا اور اسی طریق پر تعلیم دینا کافی ہوگا''(۱)

۲۸/اگست ۱۸۸۳ء میں مسٹر تھیوڈر بیک کو کالج فنڈ کمیٹی نے بحیثیت پرنسپل مقرر کیا اور اس کے لئے جو شرائطیں مقرر کی گئیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ پرنسپل عوام سے رابطہ نہیں رکھیں گے کیونکہ یہ مینیجنگ کمیٹی کی ذمہ داری ہے۔

۲۔ کالج کے بجٹ اور مالی امور سے پرنسپل کو کوئی سروکار نہیں ہوگا۔

۳۔ بورڈنگ ہاؤس اور طلبہ کی اقامتی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

۴۔ کالج کے نظم وضبط کی ذمہ داری پرنسپل کو ہوگی۔

کالج کے پرنسپل مسٹر بیک کی تنخواہ چھ سو روپیہ مقرر ہوئی اور پچاس روپیہ مہینہ کیرایہ پر بنگلہ کا انتظام کیا گیا۔ وہ ٹرینیٹی کالج کیمبرج کے گریجویٹ تھے اور یونین کے صدر بھی رہے۔ وہ انگریزی حکومت کے وفادار اور مسلمانوں کے جاں نثار تھے۔ سرسیّد کی طرف وہ بھی چاہتے تھے کہ کسی بھی طرح مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور ہو۔ وہ شروع سے ہی کالج کی کامیابی کے لئے کوشاں تھے حقیقت یہ ہے کہ سرسیّد کے بعد دوسرا مقام بیک صاحب کو ہی حاصل تھا۔ اپنی کوشش وکاوش سے انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں جان ڈال دی۔ بیک صاحب کے زمانہ میں کالج کی عزت ووقار میں کافی اضافہ ہوا اور تعلیمی میدان میں اس نے کافی ترقی کی۔ ملک کے دور دراز علاقوں سے طلباء تعلیم کے لئے علی گڑھ آنے لگے۔ اس طرح سے طلبا کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ بیک صاحب مسلمانوں کے ہمدرد تو تھے ہی لیکن ہندو طلبا کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ

---

(۳) تہذیب اخلاق (مجموعہ مضامین) جلد دوم، ص ۲۶۶

مشفقانہ تھا۔ اس کالج میں ہندو طلباء کی تعداد ۱۷ فیصد سے ۳۲ فیصد تھی۔ شروع میں کالج میں اسٹاف کی کمی کی وجہ نتیجہ خراب رہا لیکن بعد میں ۱۸۹۴ء میں نتیجہ ۹۰٫۵ فیصد رہا۔ ۱۸۸۹ء سے ۱۸۹۹ء تک انٹرمیڈیٹ کے نتائج غیر تسلی بخش رہے۔ کافی دنوں تک کالج میں انگریزی کا کوئی پروفیسر نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود انٹرنس کے نتائج اچھے رہے۔ ۱۸۹۲ء سے ۱۸۹۹ء تک مختلف مضامین میں گیارہ طلبا ایم۔ اے کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔ قانون کے امتحان میں بھی نتائج تسلی بخش رہے۔ اس طرح دھیرے دھیرے کالج تعلیمی میدان میں دن بہ دن ترقی کرتا گیا اور کالج میں سارے مضامین کی پڑھائی انٹرمیڈیٹ سے لیکر ایم۔ اے تک شروع کردی گئی۔

قانون کا شعبہ قائم کرنے کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ ۵/ مارچ ۱۸۹۰ء کو کمیٹی نے وکیل دواریکا ناتھ بنرجی کو پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر بحیثیت قانون کے پروفیسر کی تقرری کی۔ قانون میں داخلہ کے لئے میٹرک پاس ضروری کردیا گیا۔ سید محمود نے اپنا کتب خانہ شعبہ قانون کو عطیہ کردیا۔ انہوں نے دیگر اخراجات کے لئے مالی امداد بھی مرحمت فرمائی۔ ۱۸۹۷ء میں سید کرامت کے رخصتی کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے عہدہ سنبھالا۔ اس وقت کالج کے اساتذہ میں سے مسٹر نسبیٹ (انگریزی)، مولانا عباس حسین (عربی)، محمد اسحٰق (فارسی)، بھوانی چندر چکرورتی (ریاضی) آسوتوش بھٹہ چاریہ (سنسکرت)، میر ولایت حسین (فارسی)، والٹر رائے (انگریزی)، ہیرالڈ کاکس (ریاضی)، والیس (انگریزی، تواریخ)، مسٹر پٹنگ (انگریزی)، مولوی عبداللہ انصاری (دینیات اور مذہبی امور)، ضیاء الدین (ریاضی)، مولوی خلیل احمد (عربی) تھے۔

کالج کے انتظام کے لئے یکم جنوری ۱۸۹۶ء کو ایک بورڈ آف مینجمنٹ کی تشکیل دی گئی۔ اس کے اراکین کی تعداد چودہ تھی ان میں چھ ٹرسٹی، سات ممبران اسٹاف تھے ہندوستان اور

یورپین اساتذہ کے علاوہ ایک ہندو استاد بھی شامل تھے۔اس کالج نے نجی مخالفت اور مالی غبن کا بھی سامنا کیا جب سرسیّد نے اپنے بیٹے سید محمود کو اپنا جانشین مقرر کرنا چاہا تو اس کی شدید مخالفت ہوئی۔مخالفت کرنے والوں میں مولوی سمیع اللہ اور وقار الملک تھے۔۱۸۸۳ء میں اس کالج میں ایک غبن کا معاملہ بھی سامنے آیا۔ایک کلرک جس کا نام شام بہاری لال تھا، نے تقریباً ایک لاکھ سترہ ہزار تین سوترپن روپیہ جعلی چیک سے غبن کرلیا۔سرسیّد کو اس کا بہت صدمہ ہوا اور آخر کار ۲۸/مارچ ۱۸۹۸ء کو ان کی وفات ہوگئی۔

سرسیّد کی وفات کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی تجویز پر سرسیّد میموریل فنڈ قائم کیا گیا۔کہ دس لاکھ روپیہ جمع ہوجائے اور کالج کو یونیورسٹی کے درجے تک پہنچایا جاسکے۔اور اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔ بینک کے سارے قرض ادا کردیئے گئے۔اور تعمیرات کا کام پھر سے شروع ہوگیا۔قلیل مدت میں کالج میں بہت سی عمارتیں بنائی گئیں۔۲۴/اپریل ۱۸۸۵ء کو اسٹریچی ہال کی تعمیر شروع ہوئی جون ۱۸۸۷ء میں لائبریری اور سنٹرل ہال کے درمیان جوبلی بلڈنگ تعمیر کی گئی۔اسی وقت بورڈنگ ہاؤس کے لئے چودہ کمرے تعمیر ہوئے۔۱۸۹۴ء میں وکٹوریہ گیٹ بھی مکمل ہوا۔جامع مسجد کی تعمیر ۱۸۷۹ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ سڈنس یونین کلب ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی۔اس کو پرنسپل جی۔ایچ۔بی سڈنس کے نام سے موسوم کیا گیا۔(۱) سڈنس کلب کے زیراثر محمڈن اورینٹل کالج میگزین ۱۸۹۱ء سے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہر مہینے نکلتا تھا جس میں کالج کے تمام حالات، جلسوں کی رودایں، کھیل کی سرگرمیاں اور طلبا کے امتیازات واعزازات شائع ہوتے تھے۔ابتداً یہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ضمیمے کے طور پر نکلتا تھا لیکن جلد ہی ۱۸۹۴ء سے میگزین کی شکل میں نکلنے لگا۔یونین کی موجودہ عمارت ''رام پور حامد ہال'' کے نام سے ۱۹۰۵ء میں تعمیر ہوئی۔

(۱) یہی کلب یونیورسٹی کی تشکیل کے بعد ۱۹۲۱ء میں اسٹوڈنٹس یونین کے نام سے موسوم ہوا۔

نومبر ۱۸۹۰ء میں ''ڈیوٹی سوسائٹی'' کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی اس کا بنیادی مقصد مادرِ درسگاہ کی خدمت کرنا تھا۔ اس انجمن میں چار کمیٹیاں تھیں۔

۱۔ کمیٹی اسکالرشپ

۲۔ بورڈنگ ہاؤس کمیٹی

۳۔ کمیٹی تجارت اور

۴۔ کمیٹی مسجد

ان تمام کمیٹیوں کے نگراں ''معیان الغرض'' کہلاتے تھے۔ اس میں شامل اشخاص مسٹر ماریسن، مسٹر ہورسٹ، سمیع اللہ، مشتاق حسین اور ولایت اللہ تھے۔ انگریزی زبان کا ذوق وشوق بڑھانے کے واسطے ایک کلب جو کہ ''انٹرنس ڈبیٹنگ کلب'' کے نام سے قائم کیا گیا چونکہ سرسیّد کے مدرستہ العلوم کا بنیادی مقصد انگریزی تعلیم تھا اس وجہ سے طلبا اور اساتذہ اسکی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ اس کے ممبران سے انگریزی میں گفتگو کرنے پر اصرار کیا جاتا اور اردو بولنے والوں پر جرمانہ ہوتا تھا۔

کالج کے رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں مختلف سالانہ جلسے بھی ہوا کرتے تھے۔

۱۔ کالج فاؤنڈیشن میٹنگ......۳۰ دسمبر کو مدرستہ العلوم کی یادگار کے موقع پر شام میں ایک ضیافت ہوتی تھی۔

۲۔ پرائز اینول میٹنگ ......طلبا کو انعامات وتمغات دینے کے لئے منعقد کی جاتی تھی۔

۳۔ برادرہڈ ڈنر ......انجمن الاخوہ کی جانب سے مارچ میں ایک دعوت ہوتی تھی۔

۴۔ اینورسری اسڈنس یونین کلب......مع ایوننگ پارٹی کلب مذکور کے اول قائم ہونے کی یاد

میں جلسہ ہوتا۔

۵۔محفل میلاد شریف ...... یہ ماہ ربیع الاول کو ہوتا اگر چھٹی ہو جائے تو کالج کھلنے پر

ہوتا تھا۔

۶۔جلسہ ختم قرآن شریف ...... یہ جلسے ماہ رمضان میں ہوتا تھا۔

۷۔اتھیلٹک اسپورٹس ......نومبر میں دو دن تک ہوتے تھے۔

۸۔اینول میٹنگ ڈیوٹی ......سالانہ چھٹی موسم سرما سے پہلے انجمن الغرض کا

جلسہ ہوتا اور اسی چھٹی میں چندہ جمع کرنے کی ہدایت دی جاتی۔

عام کالجوں کی طرح اس کالج میں بھی طلبا نے ۱۸۸۸ء کو ہڑتال کیا اسوقت محمد سلیمان بورڈنگ ہاؤس کے نگراں تھے۔ایک طالب علم حسین بانگرو نے ایک بیرے کو تھپڑ مارا۔سرسیّد نے بانگرو اور چند ساتھیوں کو کالج سے نکال دیا۔طلبا میں ناراضگی پیدا ہوئی۔اور ہاسٹل چھوڑ کر رسل گنج پکی سرائے چلے گئے بعد میں طلبا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور معافی مانگ کر واپس آ گئے۔بعض طلبا کو سزا بھی دی گئی۔

کالج کے طلبا پڑھائی کے ساتھ ساتھ مقابلے کے امتحان کی بھی تیاری کرتے تھے۔ ہیرالڈ کاکس کی نگرانی میں سول سروس کے امتحان کی تیاری کا اہتمام کیا گیا اس کا آغاز پانچ مسلمان طلبا سے ہوا۔

یوں تو یہ ایک مسلم ادارہ تھا لیکن اس کالج میں ہندو طلبا کی بھی ایک اچھی تعداد تھی اور ہندو مسلمان طالب علموں میں کسی طرح کی کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی اس کا دروازہ ہر مذہب وملت کے لئے کھلا رہا۔اس سلسلے میں سرسیّد نے مدرسۃ العلوم کی رپورٹ میں کہا تھا :

''اس وقت ہمارے کالج میں ۱۶۷ طالب علم داخل ہیں جن

> میں سے ۱۲۹ مسلمان اور ۳۷ ہندو اور ایک پارسی ہے۔ اور ہندو مسلمان دونوں بورڈ بھی ہیں جس سے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس کے بانی......کا کبھی یہ خیال نہ تھا کہ اس کے علم کے فائدے کسی خاص فرقہ پر محدود رکھے اور جو روشنی انسانی ہمدردی کی ان کے دل میں ہے اس کو تعصب کے سیاہ دھبوں سے داغدار کرے۔"(۱)

اس کالج کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو طالب علم ایشوری پرشاد تھا جو کہ تحصیل کھیر ضلع علی گڑھ کا رہنے والا تھا۔ اس کالج میں ہندو طلبا کے ساتھ ساتھ ہندو اساتذہ اکرام بھی تھے جن میں اہم مندرجہ ذیل ہیں :

ابنا پرشاد بھٹہ چاریہ، برج موہن لال، بختاور لال، بنسی دھر، پیارے لال، جادو چندر چکرورتی، بھوانی چند چکرورتی، دانی رام، شیو شنکر لال، پنڈت کیدار ناتھ، گووند پرشاد، ماتا پرشاد، رام شنکر مصرا، ہرناتھ سنگھ وغیرہ۔(۲)

یہ کالج سرسیّد کے خوابوں کی تعمیر تھا۔ وہ شب و روز کالج کی تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے کے کوشاں تھے اس کالج کی کچھ ایسی خصوصیات تھیں جو کہ اس زمانے کے دوسرے اداروں میں نہیں تھیں۔ یہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ ایک نہایت صاف خصوصیات یہ تھی کہ اس میں ہر سال جس قدر روپیہ تعلیمی وظائف پر خرچ کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے کسی ادارے میں اتنا خرچ نہیں کیا جاتا تھا۔

۲۔ کالج کی عمارات شاندار بنائی گئی تا کہ یہ مسلم عزیمت کا مظہر ہوں۔

---

(۱) سرسید احمد خاں، رپورٹ ترقی تعلیم مدرستہ العلوم مسلمانان، واقع علی گڑھ ۱۸۷۷ء، ص ۳

(۲) یہ اساتذہ ۱۸۷۵ء تا ۱۸۹۸ء تک تدریس سے منسلک رہے، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۲/دسمبر ۱۹۲۰ء، ص ۲

۳۔انگریزی اور اورینٹل زبانوں کے دو الگ الگ شعبے قائم کیے گئے۔

۴۔کالج کے قوائد میں یہ اصول قرار پایا کہ کم سے کم پرنسپل ، دو پروفیسر اور اسکول کا ہیڈ ماسٹر یوروپین ہو۔ کیونکہ تعلیمی اور سیاسی لحاظ سے ایسا کرنا ضروری اور مفید تھا۔

۵۔کالج اقامتی ادارہ تھا اور اس کی اپنی یونیفارم تھی۔ تربیت جسمانی اور پابندی وقت کا خیال رکھا جاتا تھا۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہندوستان کا پہلا قومی کالج تھا اس کالج سے پہلے پورے ہندوستان میں کوئی قومی کالج نہیں تھا اس کے قائم ہونے کے بعد پورے ہندوستان میں بہت سے قومی کالج وجود میں آئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک کے ہر قصبہ اور شہر میں پرائیویٹ اسکول اور کالج بہت بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ اس کالج نے قوم میں علم کی محبت جگائی۔ درحقیقت سرسیّد نے محمڈن کالج قائم کرکے پورے ملک پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ سرسیّد نے ۱۸۷۰ء میں محمڈن کالج اور محمڈن یونیورسٹی کا جو خواب دیکھا تھا لہٰذا ان کے محمڈن کالج کا خواب تو ان کی زندگی ہی میں یعنی ۱۸۷۷ء میں پورا ہوگیا اور ان کے جانشینوں نے مسلم یونیورسٹی کا خواب ۱۹۲۰ء میں پورا کردیا۔ اس طرح سرسیّد کی خواہش مسلم یونیورسٹی کی شکل میں پوری ہوگئی۔ جہاں کہ بلا امتیاز قوم وملت کے سبھی طلبا تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ اس مادر درسگاہ میں مہندر پرتاپ سنگھ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، نثار احمد خان شروانی، سید محمود، رفیع احمد قدوائی، قاضی عبدالغفار، بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، شیخ عبداللہ، ٹھاکر ملکھان سنگھ، شیخ عبداللہ (پاپا میاں) بانی ویمنس کالج، جیسے فداکارانِ قوم ووطن کو اپنی آغوش میں پال کر وطن کی خدمت کے لئے وقف کردیا۔ ہندوستان کی مکمل آزادی کا مطالعہ بھی سب سے پہلے اسی مادر درسگاہ سے اٹھا۔ اسی طرح محمڈن اورینٹل کالج نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے ملک وقوم کے لئے سرسیّد کا عطا کردہ عطیہ ثابت ہوا۔

۵۔ایجوکیشنل کانفرنس

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سر سیّد احمد خاں اپنی ذہانت اور تدبر سے اپنی پس ماندہ قوم کو مذہبی، تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لئے کوشاں رہے اور اس کے لئے انہوں نے بہت سے اقدامات کئے۔ ان میں سے ایک موثر اقدام ۲۷؍دسمبر ۱۸۸۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا قیام تھا جس کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی گئی۔ اس تنظیم میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں اور آگے چل کر اس کا نام ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' رکھا گیا۔ جو آج بھی اس نام سے مشہور ہے۔(۱) جب اس کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے صدر مولوی سمیع اللہ خاں اور بانی سکریٹری سر سیّد منتخب ہوئے۔ اور یہ طے ہوا کہ اینگلو اورینٹل کالج کا سکریٹری اس کا بھی سکریٹری ہوگا۔ لیکن ذمہ داریوں کا اضافہ ہونے کی وجہ سے ۱۹۰۴ء میں نواب محسن الملک کی سکریٹری شپ کے دوران صاحب زادہ آفتاب خان کو کانفرنس کا جوائنٹ سکریٹری بنا دیا گیا۔ عملاً بھی کانفرنس کے کاموں کی نگرانی وہی کرتے تھے بعد میں وزیر ہند کی کاؤنسل کا ممبر مقرر ہو کر صاحبزادہ آفتاب خان کو انگلستان چلے جانے پر ۱۹۱۷ء میں حبیب اللہ خان شروانی اس کے جوائنٹ سکریٹری اور نگراں مقرر ہوئے ۱۹۲۰ء میں جب اورینٹل کالج مسلم یونیورسٹی بن گئی تو وہی اس کے پہلے آنریری سکریٹری قرار پائے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ مشرقی علوم کے اور بالخصوص دینی تعلیم کے فروغ پر بھی برابر زور دیتی اور ان کے لئے عملی اقدامات کرتی رہی کیونکہ سر سیّد دینی تعلیم کے بھی دل سے حامی تھے۔ ۱۸۸۶ء کے اجلاس میں جب کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی تو اس

(۱) سرسید کی تعلیمی تحریک، اختر الواسع، جامعہ مکتبہ نئی دہلی، ۱۹۵۸ء، ص ۲۹

موقع پر اس کانفرنس کے قیام کے مقاصد کی وضاحت سرسیّد نے یوں پیش کی جو مندرجہ ذیل ہے :

۱۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا۔

۲۔مسلمانوں میں تعلیم کے لئے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تابمقدور عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔

۳۔علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا بطور خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔

۴۔ جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہو اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔قرآن خوانی اور حفظ قرآن کے لئے جو مکتب جاری ہیں جو روز بروز تنزل کی طرف گامزن ہیں ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کا اہم مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم اور اصلاح ترقی کی راہوں پر گامزن کرنا تھا۔اسی کے مدنظر ۱۸۸۶ء کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں اس کے جلسے منعقد ہوتے رہتے رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کانفرنس میں شریک ہو کر قوم کی بھلائی کے لئے کام کر سکیں اور عام لوگوں میں بھی بیداری پیدا ہو۔نتیجتاً علی گڑھ مسلمانان ہند کا تعلیمی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔

کانفرنس کا دوسرا اہم مقصد مسلمانوں کو سیاست سے الگ رکھنا تھا۔۱۸۸۸ء کے خطبۂ صدارت میں سرسیّد نے اعلان کیا کہ 'ہماری محمڈن ایجوکیشنل کانگریس میں (جس کے مقاصد محض متعلق تعلیم مسلمانوں میں) کوئی پالیٹیکل معاملہ پیش نہیں ہوگا،۔ ملک کی ہر طرح کی ترقی کے

لئے مسلمانوں کو تعلیمی پسماندگی سے دور کرنا ضروری تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ کانفرنس نے ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد اور اتفاق پر بھی زور دیا اور یہی وجہ ہے کہ ۱۸۹۰ء میں گنگا جمنا کے سنگم پر جو خطبہ پڑھا گیا اس کے الفاظ یہ تھے :

> ''ہندو مسلمانوں میں باہم چولی دامن کا تعلق ہے جو کسی طرح جدا نہیں ہو سکتے...... آرزو ہے کہ تمام قیصری رعایائے ہند صرف اپنے مذہبی معبدوں میں ممتاز ہو سکیں۔'' (۱)

ایک جگہ سرسیّد نے ایک تجویز پیش کرتے ہوئے کہا کہ :

> ''مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کر کے اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لئے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے موسوم ہو۔ یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص نہ ہوگا بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام پر جہاں کے لوگ اس جلسے کے منعقد ہونے کی خواہش کریں اور اس کا انتظام فرماویں، منعقد ہوا کرے گا۔'' (۲)

مندرجہ بالا مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دو طریقے تجویز کئے گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہر سال مختلف جگہوں پر کانفرنس کا اجلاس کیا جائے اور مسلمانوں کی ترقی کے لئے تجاویز پیش کی جائیں۔ دوسرا ہر شہر اور قصبہ میں کانفرنس کے مقاصد کے لئے دو کمیٹیاں قائم کی جائیں جو کہ

---

(۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال، امان اللہ خاں شروانی، کلاسیکل پرنٹرس، چاوڑی بازار، دہلی ۱۹۹۴ء، ص ۳۰

(۲) مرقع کانفرنس مرتب انوار احمد مار ہروی، علی گڑھ ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۳

مسلمانوں کی ترقی کے لئے کام کریں۔ ہر سال کانفرنس کی طرف سے ایک کتاب چھپتی تھی جس میں کانفرنس کے اجلاس کی کاروائی کی رپورٹ ہوا کرتی تھی۔

سرسیّد کی پیش کردہ تجویز کو اجلاس نے منظور کرلیا۔ مولانا شبلی نعمانی کی تجویز کے مطابق یہ طے پایا کہ کانفرنس کے صدر کا دفتر علی گڑھ میں رہے گا۔ جو آج بھی شمشاد مارکیٹ کے سلطان جہاں منزل میں بدستور قائم ہے۔ سرسیّد نے ۲۸ / دسمبر ۱۸۸۶ء کو ایک کمیٹی تشکیل کی جس میں ایک جلسہ منعقد کر کے حسب ذیل قواعد مرتب کئے گئے۔

دفعہ ۱۔ مختلف اضلاع اور صوبہ جات کے لوگوں کا وہ مجمع جو مسلمانوں کی ترقی کا خواہاں ہو۔ اور ان کی بھلائی اور قسم کی ترقی تعلیم میں کوشش کرنے کو متحد ہو جب وہ کسی جگہ اجلاس کرے تو مذکورہ بالا لقب سے ملقب ہوگا۔

دفعہ ۲۔ اس مجمع میں جو لوگ شریک ہوں گے وہ دو لقب سے ملقب کئے جائیں گے ممبر اور وزیٹر۔ ممبر وہ لوگ تصور کئے جائیں گے جو ہر سال پانچ روپیہ زر چندہ واسطے اجرا کانگریس کے دیں گے اور باقی شریکان جلسہ وزیٹر سمجھے جائیں گے۔

دفعہ ۳۔ ہر قوم اور مذہب کے لوگ جو درحقیقت دل سے مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی تعلیم چاہتے ہیں اس جلسہ کے ممبر ہوسکیں گے۔

دفعہ ۴۔ اس مجمع کا ہیڈ کوارٹر علی گڑھ میں ہوگا اور مینیجنگ کمیٹی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ جو وقتاً فوقتاً اس کا سکریٹری ہوگا اور تمام خط و کتابت متعلق کانگریس اس کے ممبروں سے اور کمیٹیوں سے اس کے ذریعہ ہوا کرے گی۔

دفعہ ۵۔ سکریٹری محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی جو وقتاً فوقتاً ہو اسکا خزانچی تصور کیا جائے گا۔ اور جو روپیہ کانگریس کی بابت وصول ہو اس کی رسید دے گا۔

دفعہ ۶۔ اس کانگریس کی بابت جو روپیہ وصول ہو اس کا کسی بینک میں جمع کرنا اور خرچ کرنا سالانہ حساب مشتہر کرنا اور انہیں اصولوں کے مطابق ہوا کرے گا۔ جو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے فنڈ کے لئے اس قواعد میں معین ہیں اور ان کی تعمیل خزانچی سے متعلق رہے گی۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں شاہین اور اکابرین کی فکر و عمل کے تین مقاصد تھے۔ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنا، ان کے ماضی کے سرمایہ کو محفوظ کرنا اور ان کی معاشرت میں اصلاحی اقدام کرنا۔

سرسیّد کی اس کوشش میں بہت سے لوگوں میں اپنے قوم کی خدمت کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ آزادی کے بعد اس میں کافی روکاوٹیں آئیں لیکن کانفرنس نے اسے بڑی خوش اسلوبی سے دور کیا کانفرنس کے کاموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تعلیمی کام

۲۔ اصلاح تمدن

۳۔ ثقافتی خدمات

۴۔ مالیاتی امور

۱۔ تعلیمی کام : بنیادی طور پر کانفرنس کے قیام کا مقصد مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ کیونکہ اسکے بعد ہی مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف شعبوں کی طرف دھیان دیا گیا۔

(الف) ابتدائی تعلیم : کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ابتدائی تعلیم پر کافی زور دیا گیا اور روایتی طرز تعلیم پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور ان کی ترقی پر زور دیا گیا۔(۱) ۱۹۱۱ء میں مسٹر گوکھلے کے جبریہ اور مفت ابتدائی تعلیم کی تائید کی۔ کانفرنس میں اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی کیے۔ مثلاً

---

(۱) سرسید احمد خاں (مرتب)، مجموعہ رزولیوشن دہ سالہ، آگرہ ۱۸۹۶ء، ص ۱۰

اپنے قاصد کے ذریعہ مدارس و مکاتب کا معائنہ کرانا اور اس بات کی کوشش کی کہ غریب طلبہ سرکاری مدارس میں ہوں۔ ساتھ ہی جہاں ابتدائی تعلیم کے ادارے نہیں تھے وہاں مکاتب قائم کرنے کی کوشش کی۔(۱)

۱۹۱۲ء میں کانفرنس نے ایک اجلاس میں تجویز پاس کیا کہ مسلمان بچوں کی صنعتی سائنسی اور تکنیکی تعلیم کے لئے عملی اقدام کئے جائیں اور اس طرح کی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے وضائف قائم کے جائیں۔(۲) کانفرنس نے اس کے لئے حکومت پر بھی زور ڈالا۔ جس کے نتیجہ میں حکومت ہند نے ایک سرکولر حکومت کے نام جاری کیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) مکتبوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اردو اور قرآن شریف کی تعلیم دیں۔

(۲) جن مقامات پر عملی کاموں میں اردو رائج ہو وہاں پر اردو کی تعلیم میں آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔

(۳) مکتبوں کے واسطے خاص نصاب تیار کئے جائیں۔

(۴) نصاب میں اردو ریڈروں کے مضامین میں مسلمانی روایات کو شامل کیا جائے اور ان بیانات کو خارج کر دیا جائے۔ جن کو مسلمان ناپسند کرتے ہوں۔

(۵) جہاں کہیں قابل عمل ہو مسلمان استاد مقرر کئے جائیں۔

(۶) مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علیحدہ علیحدہ انسپکٹر مقرر کئے جائیں۔(۳)

آگے چل کر کانفرنس نے ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے اور اسکولوں کی حالت بہتر بنانے پر کافی زور دیا۔ اس زمانے میں کانفرنس نے پرائمری اسکولوں میں جدید تعلیم دینے پر بھی زور

---

(۱) مرقع کانفرنس، انوار احمد مارہروی، ص۱۲

(۲) روئداد اجلاس، ۲۷/مارچ ۱۸۱۳ء، علی گڑھ، ص۲۰

(۳) مرقع کانفرنس، انوار احمد مارہروی، ص۱۳

دیا۔اس لئے ملک کے مختلف مقامات پر ابتدائی تعلیم کے لئے خصوصی مکاتب کھولے گئے جو مندرجہ ذیل ہیں۔

مارہرہ، آنولہ، جلالی، چھرہ، ریواڑی، تلہر، بریلی، اٹاوہ، بلندشہر، بدایوں، مرادآباد، سہارنپور، لکھنو، گورکھپور، بنارس، الہ آباد، آعظم گڑھ، علی گڑھ، آگرہ، مظفرنگر، فیض آباد، اترولی، ہرداوگنج، جے پور، سکندراراؤ وغیرہ۔ان اسکولوں میں سے کچھ تو بند ہو گئے کچھ آج بھی اپنی اسی ترقی کی راہ پر گامزن ہیں جن کی مالی امداد آج بھی کانفرنس کرتی ہے۔

(ب) ثانوی تعلیم : کانفرنس نے ثانوی تعلیم پر کافی توجہ دی کانفرنس کی کوششوں سے بہت سے ابتدائی مکاتب اور اسکول ترقی کر کے ہائی اسکول اور انٹر کالج ہو گئے۔کانفرنس نے طلبہ کے لئے اقامت گاہوں کا بھی انتظام کیا۔سورت میں ایک اقامت گاہ کے لئے ہزاروں روپیہ صرف کیا گیا۔کانفرنس کے نصابات، طریقہ تعلیم اور امتحانات وغیرہ کی طرف کافی توجہ دیا۔اس نے اسکولوں میں میوزیم کا بھی قیام کیا۔

(ج) اعلیٰ تعلیم : جب کانفرنس نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مقصد میں کامیاب ہو گیا تو کانفرنس نے اعلیٰ تعلیم کی طرف دھیان دیا۔لہٰذا کانفرنس کی کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ ایم۔اے۔او کالج کو ترقی دیکر اسے مسلم یونیورسٹی بنا دیا۔مسلم یونیورسٹی کا قیام ۱۸۹۸ء کے لاہور کے اجلاس میں اعلان کیا گیا۔۱۸۹۹ء میں کانفرنس نے یہ طے کیا کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے علی گڑھ موزوں ترین مقام ہے۔۱۹۰۸ء کے کانفرنس میں مجوزہ یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا گیا۔۱۹۰۹ء میں اس تجویز کی تائید کی گئی اور اس کے لئے سرمایہ فراہم کیا جانے لگا۔ ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔۱۹۲۵ء میں انجینئرنگ کالج کھولنے کا منصوبہ بنایا گیا اس کے علاوہ ملک کے دوسرے مقامات پر بھی اعلیٰ تعلیمی ادارے کھولے گئے۔

مدرسین کوتربیت فراہم کرنے کے لئے مختلف مقامات پرٹریننگ کالج کھولے گئے۔مسلم یونیورسٹی کا ٹیچرس ٹریننگ کالج کانفرنس کی ہی دین ہے۔کانفرنس نے ٹریننگ کالج میں ایک کتب خانہ کھولا اس وقت کالج کے پاس کوئی اپنی عمارت نہ تھی۔کانفرنس نے ہی کالج کو عمارت دی۔حقیقت میں اس ٹیچرس ٹریننگ کالج کا آغاز کانفرنس کےصدر دفتر سلطان جہاں منزل سے ہی ہوا۔(۱)

(د) مذہبی تعلیم : کانفرنس نے مذہبی تعلیم پر بھی کافی زور دیا بالخصوص اس نے حفظ قرآن اور دینیات کی تعلیم جاری رکھنے پر زور دیا۔موجودہ مذہبی مکاتب اور قرآنی مدارس کے معیاروں سے بے اطمینانی کا اظہار کیا گیا۔اوران مکاتیب کی اصلاح پر زور دیا گیا۔۱۸۹۸ء میں ایک تجویز کے ذریعہ ایم۔اے۔او کالج میں دینیات کی تعلیم کولازمی بنانے پر زور دیا گیا۔کانفرنس کی کوششوں سے سرکار نے بھی سرکاری مدارس میں مسلم طلبہ کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔دیہاتی مسلمانوں کو مذہبی تعلیم سے آگاہ کرنے کے لئے مخصوص مکاتب کھولے گئے۔ مساجد کے ائمہ کوٹریننگ کے لئے بہت سے مدارس کھولے گئے۔بہت سی مذہبی کتابیں لکھی گئیں جن میں 'سیرت النبی' خاص ہے۔لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج مسلم یونیورسٹی میں جو دینی تعلیم کا انتظام ہے وہ کانفرنس کی ہی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

(ہ) صنعت وحرفت کی تعلیم : ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ قوم کی اقتصادی خوشحالی کے لئے صنعت وحرفت کی تعلیم ضروری ہے کانفرنس نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا اور ۱۹۰۴ء میں تجارتی اور صنعتی تعلیم کی وضائف دیئے جانے کی اپیل کی لیکن قوم نے اس پر کوئی خاص توجہ نہ کی۔۱۹۳۳ء میں لاہور کے اجلاس میں صنعت وحرفت کے فروغ پر خاص طور سے زور دیا گیا۔مسلمانوں کی بیکاری کے مسئلے پرغور کرنے اور معاشی حالت بہتر بنانے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کے ممبران ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد، حافظ محمد ابراہیم اور مولانا سید طفیل احمد

---

(۱) مرقع کانفرنس،انواراحمد مارہروی، ص۲۰

منگلوری بنائے گئے ۔ان لوگوں نے ایک رپورٹ تیار کی جسے میرٹھ کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ باوجوداس کےصنعت وحرفت کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا۔

(ی) تعلیم نسواں : سرسیّد احمد خاں عورتوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا چاہتے تھے مردوں کی تعلیم کا معقول انتظام کرنے کے بعد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی خصوصی دھیان دیا۔ کانفرنس یہ چاہتا تھا کہ عورتوں کی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جو انہیں مذہبی اور بااخلاق بنائے۔۱۸۹۹ء میں ایک تجویز پاس کی گئی جس کے مطابق ہرصوبہ میں لڑکیوں کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا جائے۔

خان بہادر محمد عبداللہ تعلیم نسواں میں خصوصی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیخ محمد عبداللہ اوران کی بیگم صاحبہ نے ۱۹۰۵ء میں لڑکیوں کے لئے ایک اسکول قائم کیا۔ بیگم بھوپال نے اس کے لئے مالی امداد فراہم کی۔ بعد میں کانفرنس نے عورتوں کی ہمت افزائی کے لئے ایک لیڈی کانفرنس قائم کیا۔ اس کانفرنس میں خود مسلم خواتین تعلیم نسواں کوفروغ دینے کے سلسلے میں غور وفکر کرتی تھیں۔اس کی میٹنگ ہرسال علی گڑھ میں ہوتی تھی۔ تعلیم نسواں کی ترقی کے لئے بہت سی کتابیں اور رسائل شائع ہوئے۔

شیخ عبداللہ اور انکی بیگم کی کوششوں کے نتیجہ میں علی گڑھ میں لڑکیوں کا اسکول ترقی کرکے ویمنس کالج میں تبدیل ہوگیا جو کہ آج مسلم یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے اس میں گریجویشن تک کی پڑھائی ہوتی ہے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج ہندومسلمان لڑکیوں کے لئے بہت سے انٹراورڈگری کالج موجود ہیں۔

(ذ) علوم مشرق کی تعلیم : کانفرنس مغربی تعلیم کے علاوہ مشرقی تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ دیا۔ عربی و فارسی کے فروغ کے لئے ہمیشہ زور دیا جاتا رہا۔ عربی اور فارسی پڑھنے والوں کے

لئے وضائف کا انتظام کیا گیا اور ان کتابوں کو محفوظ کرنے کے لئے تحقیق اور اشاعت پر زور دیا گیا۔(۱) کانفرنس نے عربی مدارس کو مفید بنانے کے لئے وہاں کے طلبہ کو علوم جدید سے بھی آراستہ کرنا شروع کیا۔ اس طرح سے کانفرنس نے علوم مشرق کی ترقی میں کافی اہم رول ادا کیا۔

مسٹر تھیوڈور بیک کی زندگی تک یہ شعبہ بڑی کامیابی سے کام کرتا رہا۔ اس میں علیگڑھ کے طلبا نے بڑا نمایاں حصہ لیا۔ مسٹر بیک کی وفات کے بعد اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جاسکی۔

مسلمانوں کی تعلیمی پستی میں ان کی مفلسی سب سے بڑی وجہ تھی جو ان کی اقتصادی زبوں حالی تعلیم حاصل کرنے میں روکاوٹ پیدا کرتی تھیں۔ اس کے لئے کانفرنس نے وضائف کا انتظام کیا اس کے لئے سر سیّد اور ان کے دوست تھیوڈور ماریس اور مسٹر بیک نے بہت ساتھ دیا۔ غرض جب جب ملک میں مشرقی علوم کو کوئی خطرہ پیدا ہوا کانفرنس نے ان کی تائید اور تحفظ کے لئے تجاویز منظور کیں اور عمل اقدامات سے بھی گریز نہیں کیا۔

(۲) اصلاح تمدن: ۱۸۵۷ء کے بعد مسلم علماء نے مسلمانوں کی اصلاح تمدن کی طرف خصوصی توجہ دی۔ لوگوں میں اوہام پرستی، تباہ کن رسوم، عیس پسندی، بیہودہ مشاغل اور ضعیف عقائد بری طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جاگیرداری کے خاتمہ کے بعد مسلمانوں میں روزگار کا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔(۲)

کانفرنس نے اوہام پرستی اور تباہ کن رسومات کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے مسلمانوں کو غلط رسومات اور مذہب کے نام پر فضول خرچی کرنے سے روکا۔ بیکاروں کو کام کرنے کی طرف راغب کیا۔ ۱۹۰۱ء میں اصلاح تمدن کا ایک شعبہ قائم کیا گیا۔ اس شعبہ نے تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان خراب رسومات کے خلاف لوگوں میں احساس بیداری پیدا کیا۔ اس

---

(۱) روئداد اجلاس، پنجم، آگرہ ۱۸۹۰ء، ۱۰۲

(۲) سر سید احمد خاں، خلیق احمد نظامی، پبلیکشنز ڈویزن، نئی دہلی ۱۹۶۶ء، ص ۹۲

مقصد کے تحت بہت سے رسائل جیسے ''عصر جدید'' اور ''سودمند'' جاری کیا گیا۔

شعبہ اصلاح تمدن کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے۔

۱۔شادی وغم، زیور ولباس وغیرہ جملہ اخراجات میں فضول خرچی نہ کرنا۔

۲۔مسکرات کی جملہ اقسام سے پرہیز کرنا۔

۳۔اولاد کا نکاح ایام نابالغی یا ان کے خلاف ورزی نہ کرنا۔

۴۔اطفال خوردسال کو قطعی زیور نہ پہنانا اور نہ شوق دلانا۔

۵۔تندرست پیشہ ور گداگروں کو خیرات نہ دینا۔

۶۔جدید طرز معاشرت کے اسراف کو روکنا۔

۷۔صیغہ اصلاح تمدن کے کسی بھی ممبر کا بیکار نہ رہنا۔(۱)

اصلاح تمدن کا حلقہ کافی وسیع تھا کانفرنس نے اصلاحی پروگرام کو صرف بیاہ کی رسموں تک محدود نہیں رکھا بلکہ جیل میں بند قیدیوں میں بھی واعظ و تعلیم کا سلسلہ جاری کیا۔

(۳) ثقافتی خدمات : تہذیب کا وہ حصہ جو زبان وادب اور علوم وفنون سے متعلق ہے ثقافت کہلاتا ہے۔اس زمانہ میں اردو زبان صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ایک بڑے طبقہ کی زبان تھی لیکن اس کا دائرہ بہت محدود تھا۔اس زبان کو فروغ دینے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے بہت بڑا رول ادا کیا کیونکہ کانفرنس کا مقصد اردو زبان کو عام فہم، سادہ اور عام لوگوں کی زبان بنانا تھا۔ اردو کے متعلق سرسیّد کا بھی یہی نظریہ تھا۔اس سلسلے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کہا ہے کہ :

> ''تکلفات تصنعات سے بری کر کے اردو کے شائستہ بے تکلف اور سادہ علمی زبان بنانا امام الہند شاہ ولی اللہ کے خانوادہ دہلی کی قسمت میں تھا۔مولانا اسمٰعیل شہید کی زبان جو 'صراط مستقیم'

(۱) روئداد اجلاس، ۱۵، ۱۹۰۱ء، ص۱۲۶

میں نظر آتی ہے ۔آج بھی فصاحت و سادگی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے مرزا نوشتہ اسد اللہ خاں غالبؔ کے خطوط کی زبان ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کا سب سے پہلا حقیقی مصنف جس نے زبان کی ہر قسم کی سیاسی ،تعلیمی ، مذہبی ، علمی اخلاقی مباحث اور مضامین کے قابل بنایا وہ سرسیّد کی ذات تھی ۔''(۱)

سرسیّد کی وجہ سے لکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اردو زبان کی بقا اور فروغ کے لئے کافی نمایاں کام کیا ۔جیسے نواب محسن الملک ، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالؔی ، مولانا شبلی ، مولانا وحیدالدین سلیم ، مولانا ذکا اللہ وغیرہ ۔ اردو زبان کی ترقی کے لئے ۱۹۰۳ء میں دہلی میں 'انجمن ترقی اردو' کا قیام عمل میں آیا اس کی ترقی کے لئے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کافی اہم رول ادا کیا۔(۲)

کانفرنس نے اردو کی ترقی کے لئے بہت سی کتابوں کی تصنیف و اشاعت کرایا۔قومی رہنماؤں کے خطبات اور مضامین کے مجموعہ کانفرنس نے شائع کئے ۔اس سلسلے میں مولانا ابو الکلام آزاد نے کہا ہے کہ :

''اردو خطابت کی تربیت گاہ دراصل یہ ہی کانفرنس ہے۔اس کی آغوش میں وقت کے بلند پایہ اربابِ ادب کی خطیبانہ صلاحتیں بیدار ہوئیں ۔(۳)

---

(۱) خطبۂ صدارت، انجمن ترقی اردو ۱۹۱۵ء، بمقام پونا، بحوالہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال، امان اللہ خاں ص ۱۶۹

(۲) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۲۴۔۱۲۲

(۳) موج کوثر، بحوالہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال، امان اللہ خاں، ص ۱۷۱

کانفرنس نے اردو زبان کی ترقی کے لئے بہت سے سوانح عمریاں اور کتابیں شائع کیں۔ ان میں حیات محسن، وقار حیات، ہمایوں نامہ، صولت شیر شاہی، سلاطین مصر، تحفتہ المجاہدین وغیرہ بہت مشہور ہوئیں۔ کانفرنس نے 'کانفرنس گزٹ' نام کا ایک اخبار بھی شائع کیا اور اردو اخبار نویسوں کے لئے ایک تنظیم کا بھی قیام کیا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ کانفرنس نے اردو کی ترقی کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیا۔

(۴) قومی یکجہتی : مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے ہمیشہ ہی قومی یکجہتی کو کافی اہمیت دیا۔ اس نے شروع سے اب تک قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے کافی کام کیا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کبھی بھی سیاست میں علیحدگی پسند کو بڑھاوا نہیں دیا۔ کانفرنس کے لئے قومی یکجہتی مسلمانوں کی ترقی کے لئے بہت اہم اور ضروری تھا۔ سرسیّد کی قومی یکجہتی، اخوت اور بھائی چارہ کے نظریہ کو پھیلانے میں کانفرنس کا بہت اہم رول رہا ہے۔ اس نے قومی یکجہتی کے نظریہ کو پھیلانے کے لئے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا اس پلیٹ فارم سے سرسیّد نے اعلان کیا کہ:

''قومی ہمدری اور قومی امور کے سرانجام میں اتفاق سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں۔ قومی یکجہتی اور ایکتا ہی قومی ترقی کا پہلا زینہ ہے۔''(۱)

سرسیّد وقتی طور پر مسلمانوں کو سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے کہ مسلمان پہلے اپنی تعلیمی ترقی کی طرف متوجہ ہوں۔ سرسیّد کے نزدیک سیاسی شعور ثانوی تھا۔ کانفرنس کے ابتدائی اجلاسوں میں اس بات کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اس سلسلے میں کانفرنس کے ایک رکن محمد حیات خان نے اپنے خطبہ صدارت ۱۸۸۸ء میں اعلان کیا تھا کہ 'ہماری محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں کوئی

---

(۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال، امان اللہ خاں، ص ۱۷۳

پولیٹیکل معاملہ پیش نہیں ہوگا،۔

سرسیّد کے رفقا بھی قومی یکجہتی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے اور سرسیّد کے شانہ بشانہ قومی اتحاد اور یکجہتی کے لئے جدو جہد کرتے رہے۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قومی یکجہتی کے لئے بہت سنجیدہ تھی۔ اس نے اپنے پلیٹ فارم سے اس کے لئے کافی جدو جہد کیا۔ ۱۹۳۱ء میں کانفرنس کی منظور کی گئی قرارداد اس کی زندہ جاوید مثال ہے۔

> ''اس کانفرنس کے نزدیک ہندوستان میں مختلف فرقوں کی باہمی کشاکش تعلیمی، قومی اور ملکی ترقی میں مانع ہے اور اس کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ مختلف اقوام کے بچے ابتدا سے تعلیم پائیں۔ جس سے ان میں باہمی کشاکش کی جگہ یگانگت کی مستقل بنیاد قائم ہو۔ اس لئے یہ کانفرنس ہندو مسلمان درس گاہوں کے مہتمموں سے درخواست کرتی ہے کہ وہ دوسرے فرقہ کے بچوں کے لئے ایک مقرر تعداد مثلاً ایک چوتھائی کہ جگہ مخصوص کردیں اور امید کی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلم یونیورسٹیاں اس تجویز پر عمل درآمد کرنے کی ابتدا کریں گی۔(۱)

مندرجہ بالا تمام بنیادی نکات کے مطالعے سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے سرسیّد کے مشن کو کافی فروغ دیا۔ اس کانفرنس کی فلاح و بہبود کے لئے (تعلیمی، سماجی، معاشی، مذہبی، حب الوطنی وقومی یکجہتی) یعنی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کیونکہ سرسیّد چاہتے تھے کہ ہماری قوم کا ہر فرد روحانی اعتبار سے سچا مسلمان ہو ذہنی

---

(۱) آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال، امان اللہ خاں، ص ۱۷۴

خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو اور جسمانی اعتبار سے ہندوستان کا فوجی ہو۔ ان خیالات کی ترجمانی ہمیں سرسیّد کے مختلف تقاریر کے مطالعے سے بھی ہوتا ہے مثلاً سرسیّد نے ایک جلسے میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ادارے کا ہر طالب علم ایسا ہو جس کے ایک ہاتھ میں قرآن، دوسرے ہاتھ میں سائنس و فلسفہ اور سر پر کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کا تاج ہو۔''(۱) لہٰذا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانوں کی پسماندگی سے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اہم رول ادا کیا اور کر رہا ہے جسے کبھی بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔

---

(۱) خطباتِ سرسید، ص ۲۷۶

باب پنجم

سرسیّد اور سیکولرزم

'**سیکولرزم**' لفظ سیکولر سے مشتق ہے، جو انگریزی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''لادینیت'' کے ہیں۔مگر سیکولرزم کے معنی کے معاملے میں مغربی نقطۂ نظر اور ہندوستانی نقطۂ نظر میں کسی حد تک فرق ہے۔کیونکہ یورپ میں سائنسی اور صنعتی انقلاب کی وجہ سے لوگوں کے غور وفکر میں نمایاں تبدیلی ہوئی اور پرانی روایات پر بھی غور وفکر کیا گیا اور پرانے رسم ورواج کو جو صرف توہمات پر مبنی تھا یا پھر مذہبی عقائد کی وجہ سے کٹر پن آ گیا تھا۔ان سب باتوں کو سائنسی اور عقلی نقطۂ نظر نے ناقابل قبول قرار دے دیا جبکہ مشرقی نقطۂ نظر سے سیکولرزم کے تحت مذہب کو سیاست سے آزاد رکھا گیا اور یہی وجہ تھی کہ آزادی ملنے کے بعد ہندوستان میں لامذہبی جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی۔ جہاں سبھی مذاہب کو اپنے اپنے طور پر پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور سیکولر مزاج ہی تھا کہ علامہ اقبال نے اپنے ابتدائی دور زندگی میں قومیت کو غیر متعصب نقطۂ سے دیکھنے اور سمجھنے کی تلقین کی تھی اور کہا تھا کہ ہم ہندوستانی ہونے کی وجہ سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں اور اس کے بعد کسی مذاہب کے ماننے والے ہیں جس کی عمدہ مثال ان کی نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' ہے۔ہاں یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر بعض وجوہ کی بنا پر وہ جمال الدین الحسینی افغانی کے پان اسلامزم (Pan Islamism) کے قائل ہوئے اور کہا کہ ''مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا'' کیونکہ علامہ اقبال کے خیال میں پان اسلامزم کا نظریہ اسلامی نقطۂ نظر کا حامل تھا۔اس کے لئے ایک بہت بڑی لفظی معرکہ آرائی مولانا حسین احمد مدنی سے چل پڑی۔انہوں نے اپنی ایک نظم میں مولانا حسین احمد مدنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں کہا تھا کہ:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر زِ مقام محمد عربیست

یعنی وہ شخص جو ملت کو وطن کے ساتھ منسوب کرتا ہے وہ رسول اللہ صلعم کے مقام کو ہی نہیں جانتا بلکہ اس بات پر مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر اقبال میں ایک عرصے تک بحث چلی اور آخر میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی دریدہ ذہنی کا اقبال کرتے ہوئے افسوس ظاہر کیا۔ یہاں اس بات سے یہ نتیجہ نکلا کہ مغربی نقطۂ نظر کے مطابق قوم کا تصور جغرافیائی حدود یا کسی ایک فرقے کے ہم خیال کثیر افراد کا کسی ایک حاکم کے زیرِ حکومت ہو جانا قومیت کی تعریف میں آتا ہے۔ سر سیّد جمال الدین افغانی کے پان اسلامزم سے متفق نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس وقت ہمیں بین الاقوامی صورت حال سے ہٹ کر ملکی یا قومی صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہیے جس کے لئے ہندوستانی قوم کو خصوصاً مسلمانوں کو اعلیٰ سائنسی علوم کی بے حد ضرورت ہے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ جب تک عوام کے اندر تعلیم نہیں آئے گی اس وقت تک ملک کے اندر قومی اتحاد اور سماجی و معاشرتی فلاح و بہبود نہیں ہو سکتی۔

سر سیّد کے بارے میں سوچتے ہوئے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ سر سیّد کوئی ایسا قانون یا کلیہ وضع نہیں کر رہے تھے جس میں کسی طرح کی تبدیلی کی گنجائش نہیں تھی۔ جس شخص کی نظر زمانے کے نشیب و فراز پر گہری ہو اور جس کی انگلیاں زمانے کی نباض ہوں تو وہ بدلتے وقت اور حالات سے کیسے چشم پوشی کر سکتا تھا۔ اب اسے مصلحت کوشی یا کوئی اور نام دیا جائے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انہیں ایک ہی فکر رہتی تھی کہ مسلمانوں کی بدحالی کیسے دور ہو اور اس بدحالی کو دور کرنے کے لئے ان سے جو بن پڑا اس سے گریز نہیں کیا۔

سر سیّد دوسری قوموں کی بھلائی بھی چاہتے تھے لیکن مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہہ تھی اس

لئے انہوں نے ان کے مسائل کو زیادہ سنجیدگی سے لیا۔ ہندوستان کی ترقی کے لئے دونوں قوموں کی اہمیت کو یکساں تسلیم کرتے تھے جس کا اظہار خود انہوں نے اپنے پرچے ''تہذیب الاخلاق'' میں کیا تھا کہ ''ہندوستان ایک خوبصورت دلہن کے مانند ہے اور ہندوستان اس کی دو آنکھیں ہیں''(۱) گویا ہندوستان کی خوصبورتی اس کی عظمت کسی ایک قوم کے دم سے ممکن نہیں۔ اگر مسلمان قوم بدحال و پریشان رہتی ہے تو اس سے ہندوستان کی معاشی، تعلیمی، سیاسی اور سماجی زندگی بہتر نہیں ہوسکتی اس لئے سرسیّد نے اگر مسلمانوں کی فکر زیادہ کی تو مجموعی طور سے اس میں ہندوستان کی فلاح و بہبود مضمر تھی۔ سرسیّد کی شخصیت ممتاز قوم پرور اشخاص میں سے تھی ان کے افکار و کارناموں میں وہ تمام خوبیاں ملتی ہیں جنہیں آج ہم سیکولرزم کہتے ہیں۔ سرسیّد کی تخلیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب پر ان کا پختہ عقیدہ تھا اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے شرارت پسندوں کے اسلام پر لگائے گئے الزامات کا منھ توڑ جواب دیا ہے۔

سرسیّد احمد خاں کے مطابق اعلیٰ مغربی تعلیم ہندو مسلمان دونوں کے لئے ضروری ہے حالانکہ ہندو بھائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حالت زیادہ پست تھی۔ اسی خیال کے پیش نظر انہوں نے ابتدا میں اسلامی مدرسے اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا دروازہ ہندو مسلمان دونوں کے لئے یکساں طور پر کھولا تھا یہاں تک کہ کالج کے بانیوں اور منتظمین میں دونوں فرقوں کے لوگوں کو شامل کیا۔ جس سے سرسیّد کے سیکولر خیالات کی تائید ہوتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ سیکولرزم اور قوم دونوں کے لئے صاف طور پر اردو زبان میں کوئی مناسب لفظ نہیں ہے۔ جو قوم اور سکولر لفظ کے صحیح مفہوم کو ادا کر سکے۔ مثلاً نیشن (Nation) کے لئے بھی لفظ قوم استعمال ہوتا ہے اور کمیونیٹی (Community) کے لئے بھی لفظ قوم ہی رائج ہے۔ اس لئے جب لفظ قوم بولا جاتا ہے تو کبھی کمیونٹی، اس کے معنی ہوتے ہیں اور کبھی اس کے معنی قوم کے ہوتے

(۱) سفرنامہ پنجاب، سرسید احمد خاں، مرتبہ اقبال علی، علی گڑھ ۱۸۸۴ء، ص ۱۶۷

ہیں۔سرسیّد کے مختلف بیانات اور خطبات میں جب لفظ قوم استعمال ہوتا ہے تو کہیں پر اس کے معنی مسلم فرقے کے بطور ہوئے اور کہیں پر قوم۔جس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں۔ وہ قوموں کی عادتوں اور طبیعتوں کا اختلاف ملک کی جغرافیائی خاصیت پر منحصر بتاتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ :

> ''یورپین مختلف خیالات اور مختلف مذاہب کے ہیں مگر سب ایک قوم میں شمار ہوتے ہیں گو ان میں دوسرے ملکوں کے لوگ بھی آ کر بس جاتے ہیں، وہ آپس میں مل جل کر ایک ہی قوم کہلاتے ہیں غرض کہ قدیم سے قوم کا لفظ ملک کے باشندوں پر بولا جاتا ہے......اے ہندو مسلمانوں کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔کیا اسی زمین پر تم دفن نہیں ہوتے یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔اسی پر مرتے ہو اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں اس اعتبار سے سب ہی ایک قوم ہیں۔''(۱)

ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ مرحوم نے ایک بار سرسیّد سے سوال کیا تھا اور انہوں نے اپنے سیاسی مسلک پر کسی اثر کی پرزور تردید کرتے ہوئے اس کو حالات کے تجزیے کا نتیجہ بتایا تھا۔یہ حالات کیا تھے اور کیوں پیدا ہوئے تھے؟ کوئی دیانتدار مورخ ان عوامل و اثرات سے لاعلمی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ سرسیّد کا تصور قومیت اس زمانے کے ہندوستان میں ایک بالکل نئی آواز تھی۔شاید ہی کسی دوسرے ہندوستانی نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا

(۱) سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ سراج الدین، کشمیری بازار، لاہور ۱۸۹۰ء، ص ۱۷۹

اظہاراس جرأت، خلوص اور سچائی سے کیا ہو جیسا کہ سرسیّد نے ۳/فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں کہا تھا انہوں نے کہا تھا کہ:

''لفظ قوم سے میری مراد ہندو اور مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ معنی ہیں جس میں لفظ نیشن (قوم) کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ امر چنداں لحاظ کے قابل نہیں ہے کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے۔ کیوں کہ ہم اس کی کوئی بات نہیں دیکھ سکتے لیکن جو بات ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم سب خواہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک ہی سرزمین پر رہتے ہیں......ہم سب کے فائدے کے مخرج ایک ہی ہیں......یہی مختلف وجوہات ہیں جن کی بنا پر ان دونوں قوموں کو جو ہندوستان میں آباد ہیں ایک لفظ سے تعبیر کرتا ہوں کہ 'ہندو' یعنی ہندوستان کی رہنے والی قوم ......جس زمانے میں میں قانونی کاؤنسل کا ممبر تھا تو مجھ کو خاص اسی قوم کی بہبودی کی دل سے فکر تھی۔''(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نے جو ان کے سیاسی افکار سے متفق نہیں تھے، کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر ہندوستان نے سرسیّد کی اس رائے کی روح کو سمجھا ہوتا اور اس کی پیروی کی ہوتی تو آج ملک کی تاریخ کا رخ دوسرا ہوتا۔

سرسیّد احمد خاں کے خیالات اب تمام ملک میں پھیل چکے تھے ان کے خیالات کی تائید مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ ہندوؤں کی طرف سے بھی ہونے لگی تھی۔ جس وقت وہ علی گڑھ کالج کے لئے چندہ مانگنے پنجاب پہنچے تو وہاں کے جلسوں پر ہر گورنمنٹ اسکول کی طرف سے

(۱) سفرنامہ پنجاب، سرسید احمد خاں، ص ۱۶۷

سر سیّد کو ایک ایڈریس پیش کیا گیا جس کو لالہ بھگت رام نے پڑھا جس میں سر سیّد کی حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا بھر پور اعتراف کیا۔ اسی طرح انڈین ایسوسی ایشن لاہور کے سیاست نامہ جس پر دستخط کرنے والوں میں ۱۴ ہندو اور صرف ۵ مسلمان تھے۔ سر سیّد کو بہترین الفاظ میں نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا۔ ایم۔اے۔او کالج کے افتتاح کے بعد پہلا ایڈریس جو مہاراجہ سریندر سنگھ بہادر والئی پٹیالہ کو دیا گیا اس موقع پر سر سیّد نے کالج کی پالیسی کا بھی اظہار کیا۔

سر سیّد کی خدمات نے ملک وقوم کے لئے جو راستہ اختیار کیا وہ زندگی کے ہر شعبہ میں کارآمد نظر آتا ہے۔ سر سیّد کی خدمات مذہبی، سیاسی، تعلیمی اور معاشرتی سبھی میدانوں میں نمایاں نظر آتی ہیں اور اس کے لئے ہمیں زندگی کے ایک ایک پہلو پر الگ الگ نظر ڈالنی چاہیے۔ مذہبی عقائد کے بارے میں سر سیّد کو بہت زیادہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا اور مخالف لوگوں کے مذہبی اعتراضات ان کے سارے کاموں میں الجھن ڈالتے رہے۔ لیکن سر سیّد نے اپنی عقل وفہم پر بھروسہ کر کے ہر اعتراض کا جواب قرآن اور حدیث سے تلاش کر کے ایسا دیا کہ لوگوں کی ریشہ دوانیاں زیادہ کارگر نہیں ہوئیں۔

سب سے پہلا مسئلہ جو تعلیمی راہ میں حائل تھا وہ قومیت کا مسئلہ تھا یعنی ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو الگ الگ فرقے سمجھ کر متحدہ قومیت کے اصول کو ٹھکراتے رہتے تھے۔ سر سیّد نے اسلام کے اصلِ اصول کو بلکہ خود اسلام کو قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی بتایا اور مذہب نے انہیں یہ بھی بتایا کہ بانی اسلام نے تمام عمر قوم کی خیر خواہی میں بسر کی، جو لوگ گمراہ تھے ان کو یہ ہدایت دی، جو وحشی تھے ان کو انسان بنایا اور جو ایک دوسرے کے دشمن تھے ان میں بھائی چارے کی بنیاد ڈالی۔ جو آپسی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے ان میں کشور کشائی کا مادہ پیدا کیا۔ دین اور دنیا دونوں کو درست کیا ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا۔ اور فرمایا کہ '' حب الوطن من

الایمان''یعنی وطن سے محبت ایمان کا جز و ہے۔قوم کی سرداری کوقوم کی خدمت کے معنی سمجھا
ئے اور کہا کہ '' سید القوم خاد مھم''یعنی قوم کا سردارقوم کا خادم ہوتا ہے۔سرسید نے
اپنی تمام زندگی ، طاقت اور ہمت کوقومی خدمت اور خیر خواہی کے لئے وقف کر دیا۔اور اسی قومی
خدمت کے پیش نظر سرسیّد نے مسلمانوں کے ہاتھوں ذلت بھی اٹھائی۔ مذہبی توہم پرستی اور غلط
خیالات جو دنیاوی ترقی میں حائل تھے اپنی پرزور تحریروں اور تقریروں سے ان کو غلط ثابت کیا۔
ہندو مسلمانوں میں جہاں تک ممکن ہوا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں ہر کوشش کی کیوں کہ دونوں کی
عزت اسی بات پر موقوف تھی اور ہے کہ آپس میں مل جل کر رہیں جتنے مدرسے اور کالج قائم کئے
ان میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور ان سے دونوں کے فوائد ملحوظ رکھے۔ ہمیشہ اپنی تقریروں
میں دونوں قوموں کو اسی بات پر نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت ،اتفاق و اتحاد میں ہے۔
مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں شیعہ سنی وغیرہ شامل تھے ان میں اتفاق واتحاد کی بنیاد ڈالی۔
مدرستہ العلوم میں ہر مسلمان فرقے کی تعلیم وتربیت کا انتظام علیحدہ کیا اور ہر فرقے کے طالب
علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔سنی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے
روکا۔کبھی مخالفین کے مذہبی اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔یہ سب اس لئے کیا کہ قوم میں
اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے۔ جب انگریزی تعلیم جاری ہوگئی تو اس وقت بھی مذہب ہی
نے ان کو یہ سمجھایا کہ جب تک سائنس اور اصول اسلام میں مطابقت نہ کی جائے تب تک ان کو
رے اور سادہ طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوسکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے
ہیں اس لئے ان کے دل میں بدظنی پیدا ہونا بالکل قرین قیاس ہے چنانچہ اس کام کو بھی انجام
دینے کا ذمہ انہوں نے اپنے اوپر لیا۔اس سلسلے میں مولانا حالؔی لکھتے ہیں کہ :

''ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسیّد قومی خدمات اُسی

سرگرمی اور ذوق وشوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک
مرتاض اور نفس کش زاہد عبادت الٰہی بجالاتا ہے نہ بیماری اور نہ
ضعیفی ان کے ذوق وشوق کو کم کرتی ہے اور نہ گرمی یا سردی کی
شدت یا کسی حرج مرج سے ان کی ہمت قاصر ہوتی ہے۔
چالیس برس تک برابر انہوں نے مخالفتیں جھیلیں......ان کی
بہن کے انتقال کی خبر ان کو اس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی
کانفرنس کی کاروائی میں مصروف تھے جب تک جلسہ اپنے
معمولی وقت پر برخاست نہ ہوا وہ بہن کی تجہیز وتکفین میں
شریک نہ ہوئے......الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں کہ
ان کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی امنگ تھی جس پر
دنیا کے معمولی خلجان غالب نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی
امنگیں کم ہوتی جاتی تھیں وہ امنگ بڑھتی جاتی تھی۔''(۱)

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا کہ سرسیّد پر کسی تنگ نظری یا فرقہ پرستی کا غلبہ نہیں ہوتا تھا اور وہ عقلی دلائل اور ذہنی شعور سے ہر معاملے میں برمحل فیصلہ لینے کے قائل تھے اور ایسے منصف مزاج شخص سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کسی قسم کے فرقے واریت یا مذہبی عصبیت کا شکار ہوجائے گا۔اس لئے کسی بھی مرحلے میں ان پر سیکولرزم کو نظرانداز کرنے کا شبہ تک نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سرسیّد کے تعلقات جن لوگوں سے تھے وہ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان نہایت پرخلوص اور محبت سے بھرپور ہوتے تھے اور وہ اپنے دوستانہ تعلقات میں کسی مذہب وملت کا خیال دل میں نہ لاتے تھے۔چنانچہ بقول مولانا الطاف حسین حالؔی :

---

(۱) حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۳۱۱-۳۱۰

''جب سید محمود پیدا ہوئے تو سید محمود اور مسٹر راس مسعود سے نہایت دوستانہ اور عزیزانہ محبت تھی۔ مسٹر راس کی میم صاحبہ نے انگریزی رسم کے مطابق اپنا نام نومولود مسعود کو دیا۔ سرسیّد کہتے ہیں کہ ہم نے نہایت خوشی سے ان کا نام بچے کے نام کے ساتھ شامل کیا اور اسی سبب سے ان کا نام سر راس مسعود قرار پایا۔ اس بات سے سرسیّد کی سیکولرزم پر عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسرا نمونہ راجہ جے کشن داس بہادر۔سی۔ایس۔آئی کی طرف محبت بھرے اشارے میں کہا ہمارا یہ داڑھی منڈا دوست یہاں موجود ہے اور سید راس مسعود کو اپنے بغل میں بیٹھائے ہوئے ہے۔ ان کو اپنا معزز اور محسن بھائی سمجھتا ہوں اور سید محمود ان کو چچا کہتے ہیں ۔ اور سید راس مسعود دادا راجہ کہتے ہیں پس ہم اپنے دوستوں سے محبت رکھنے میں کچھ بھی فرق نہیں رکھتے۔''(۱)

سرسیّد جس کو دوست سمجھ لیتے تھے اس کی طرف سے ان کا دل ایسا صاف ہوجاتا تھا کہ اس کی نسبت برائی کا تصور بھی نہ آتا تھا۔ کسی کی شکایت یا درانداز ی ان کو دوست سے جب تک کہ اعلانیہ اور متواتر دوستی کے خلاف باتیں سرزد نہ ہوں بدگمانی نہیں ہوتی تھیں۔ ظاہرداری کا ملنا درحقیقت ان کو پسند نہ تھا۔ اور یہ بات ان کی بلاتفریق مذہب وملت تھی۔ یہ بات بھی اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ سرسیّد نہایت آزاد خیال تھے۔ پھر بھی دوستی کے معاملات میں بڑے کنزرویٹیو (Conservative) تھے۔ غرض وہ ہر بات کا فیصلہ خود اپنی عقل وشعور سے کرتے تھے۔ جس میں رشتہ داری مذہب یا سیاسی پہلو حارج نہیں ہوتا تھا۔ سالم نام کا ایک یہودی صنعا یمن کا رہنے والا

(۱) حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۴۴۱

غازی پور میں سرسیّد کے پاس آیا اور کہا کہ تمام ہندوستان میں معاش کی تلاش کے لئے پھرا ہوں کہیں کوئی صورت نہیں نکلی۔ سرسیّد نے پوچھا کہ تنخواہ کیا لوگے اس نے دس یا پندرہ روپیہ کہے۔ سرسیّد نے کہا کہ میں ۲۵ روپیہ مہینہ دوں گا۔ مجھے عبرانی زبان سیکھاؤ۔ سرسیّد کے ایک دوست کہتے تھے کہ اس خوشی کے مارے بڑھ کر سید کی داڑھی چوم لی اور کہا کہ آج تک مجھے ایسا کوئی شخص نہیں ملا جس نے درخواست سے زیادہ پیسہ دیا ہو۔ وہ چونکہ آوارہ مزاج تھا اس لئے اس کو ضرورت کے لحاظ سے پیسہ دیتے رہتے۔ اور باقی تنخواہ جمع کر کے جب وہ وطن جانے لگا تو اس کے حوالے کر دی۔ یہودی عموماً اسلام کے دشمن ہوتے ہیں اس بات سے سرسیّد یقیناً لاعلم نہیں تھے مگر ان کی فراخ دلی نے ضرورتمندوں کو دروازے سے مایوس نہ کیا۔ سرسیّد احمد خاں بلا لحاظ مذہب وملت سب کی یکساں خدمت کرتے تھے ایک ہندو جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا اس کی غلاظت اپنے ہاتھوں سے دھوتے تھے۔ اس لئے وہ لوگ بھی ان کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ نورالحسن نقوی اس کے بارے میں یوں فرماتے ہیں کہ :

> ''اصلیت یہ ہے کہ سرسیّد کو عصبیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ انہوں نے مسلمانوں کو سقیم حالت میں نہ دیکھا تو ان کی بھلائی کی تدبیریں کیں۔ اگر وہ کسی فرقے کو اس حال میں دیکھتے تو بے دریغ اس کی مدد کرتے۔ مسلمانوں کو اس گردابِ بلا سے نکالنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے ہم وطن غیر مسلموں کی ترقی کے بھی خواہاں تھے۔ آگے چل کر جب انہوں نے اس راز کو پالیا کہ ہندوستان کی ترقی کا راز تعلیم کے عام ہونے میں مضمر ہے تو انہوں نے ہندو مسلمان دونوں کے

لئے تعلیمی ترقی کے منصوبے بنائے جب غازی پور میں انہوں
نے ایک اسکول قائم کیا تو اس کا سنگ بنیاد راجہ سر دیو نارائن سنگھ
بہادر اور مولانا فصیح اللہ کے ہاتھوں رکھوایا۔ راجہ جے کشن داس
برسوں تک سائنٹفک سوسائٹی کے بااختیار عہدیدار رہے۔"(۱)

اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اردو زبان کے بارے میں ہندو مسلمان دونوں میں اختلاف اور بدگمانی پیدا ہونے لگی تھی۔ ۱۸۶۴ء میں اٹاوہ کے بابو دینا ناتھ گنگولی نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمانوں کے عہد میں اس کا سیکھنا کار آمد تھا لیکن اب اسے ترک کر دینا چاہیے۔ ورنہ ہندو اپنی مذہبی کتابوں سے بے بہرہ ہو جائیں گے اور سنسکرت کو جو ہندوستان کی اصلی زبان ہے اسے ترقی دینا چاہیے۔ سرسیّد نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس بات کی شدید مخالفت کی تھی اور سنسکرت کو ایک مردہ زبان بتایا تھا۔ سرسیّد کی رائے تھی کہ ہندو مسلمان ایک مشترکہ زبان بولتے ہیں اردو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے یا فارسی رسم الخط میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہندو جس کو ہندی کہتے ہیں میں اسی زبان کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں۔ سرسیّد کے یہاں بھی اس بات سے کافی تلخی پیدا ہو چکی تھی اور یقین ہو گیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن نہیں۔ انہوں نے مولانا حالیؔ کو بتایا تھا کہ :

"ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے
میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ
متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انہوں نے کہا کہ
آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی
کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی

(۱) سرسید اور ہندوستانی مسلمان، نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۹ء، ص ۵۶

بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ انہوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"(۱)

سرسیّد کی زندگی کے جہاں بہت سے کارناموں کا ذکر آتا ہے ان میں ان کا اہم کارنامہ تعلیم کے مسائل کا ہے۔ انہوں نے بہت ہی غور وفکر کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ تمام مسائل کا حل اور تمام مصائب کا علاج جدید تعلیم ہے۔ قیام انگلستان کے زمانے میں جو حالت اس وقت ہندوستان کی تھی وہ کبھی انگلستان کی بھی رہ چکی تھی۔ وہاں ایڈیس اور اسٹیل جو تہذیب کے دیوتا سمجھے جاتے تھے تا کہ انسانی زندگی کو جھوٹی بناوٹوں سے پاک کریں اور جھوٹی پوشاک کو ہٹا کر لباس، بات چیت اور برتاؤ میں سادہ پن پیدا کریں۔ سرسیّد کہتے ہیں کہ "ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر" جس وقت شائع ہوئے تھے اسوقت انگلستان کی جہالت اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ کیا مرد کیا عورت علم حاصل کرنے سے نفرت کرتے تھے۔ عورت کا پڑھا لکھا ہونا بدنامی کا باعث ہوتا ہے۔ خلاف تہذیب باتیں کرنا ایک بڑی وضع داری گنی جاتی تھی۔ اسپیکٹیٹر میں ایڈیسن نے یہ لکھا تھا کہ اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا تا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے پڑھنے والے اخلاق اور خوش طبعی دونوں باتوں سے نصیحت حاصل کریں۔ میں ہر روز ان کی نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں

(۱) حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۹۴

بسایا۔ میں اپنی نسبت سے صرف یہ کہوں گا کہ فلسفے کو مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانے کی کوٹھیوں سے نکال کر جلسوں اور چائے خانوں میں پھیلاؤں گا جو کام اڈیسن اور اسٹیل نے اپنے پرچوں سے انگلستان میں لیا۔ سرسیّد نے وہی کام ''تہذیب الاخلاق'' میں لیا۔ تہذیب الاخلاق میں انہوں نے بار بار لکھا ہے کہ سوتوں کو جھنجھوڑ کر اٹھانے کا کام اس وقت تک جاری رہے گا جب تک قوم میں بیداری ہمدردی اور خیر خواہی جیسی خوبیاں نہ پیدا ہو جائیں ان میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اپنی عزت کرنا خود سیکھیں۔ جدید علم کی طرف متوجہ ہوں اور اجتماعی قوت کا احساس پیدا ہو(۱)۔ یہ تہذیب الاخلاق کا کارنامہ تھا کہ مسلمانوں نے مذہبی علوم اور غیر مفید رسم رواج میں تمیز کرنا سیکھایا۔ بقول مولوی نذیر احمد یہ تہذیب الاخلاق کا تصرف تھا کہ مسلمان جو پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتے تھے انہوں نے نعل جڑ والئے اور کان تک نہ ہلایا۔ غرض تعلیم کے معاملے میں سرسیّد نے جو جان بازی و جان نثاری دکھائی اس کی نظیر کسی ملک میں بھی تلاش کی جائے وہ مشکل سے ملے گی۔(۲) تعلیم کے معاملے میں انہوں نے بڑی فراخ دلی سے کام لیا اور جدید تعلیم کے حصول کے لئے دونوں قوموں یعنی ہندو اور مسلمانوں کو رغبت دلائی۔

سرسیّد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ہندوستانیوں اور خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کی ہر شعبہ کو گہری نظر سے دیکھا اور اس میں اصلاح کا تہہ دل سے ارادہ کر لیا۔ انہوں نے بے عملوں کو جدوجہد کا درس دیا۔ ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا اور آبا و اجداد کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنے اندر وہی اوصاف پیدا کرنے کے لئے آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب سے روشناس کرایا۔ غور و فکر میں اجتہاد کی اہمیت کو جتایا۔ تجزیہ اور استدلال کی ضرورت سے باخبر کیا۔ تعلیم کے معاملے میں انہوں نے اپنے ہم

---

(۱) تہذیب الاخلاق، جلد اشمارہ ا، یکم شوال ۱۳۱۱ھ، ص ا

(۲) بحوالہ تہذیب الاخلاق کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، نفیس بانو، ص ۱۱۸

خیال ہندوؤں سے اپنے قدم بہ قدم چلنے کی خواہش کی بلکہ تعلیم کے دروازے بلاتفریق مذہب وملت سارے ملک کے باشندوں کے لئے کھلا رکھا۔ اور کسی کو مذہب وملت کی بنا پر اپنے قائم کئے ہوئے درسگاہوں میں جانے سے نہیں روکا بلکہ خوشی خوشی ان کو علم کے زیور سے مالا مال کرنے کا راستہ دکھایا۔ چنانچہ محمڈن کالج کا پہلا گریجویت ایک ہندو طالب علم تھا جو بعد میں مشہور ومعروف تاریخ دان ایشوری پرساد کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جس طرح تعلیم کے معاملے میں سرسیّد کا کارنامہ یگانۂ روزگار ہے اسی طرح دوسرے زندگی کے شعبوں میں بھی ان کی رہنمائی قابل تسلیم ہے چنانچہ ہندوستان کے آزادی کی تحریک میں ہندو اور مسلمان دونوں شانہ بہ شانہ ایک دوسرے کے شریک تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ دونوں فرقے علیحدہ ہوتے گئے یہاں تک کہ ہندوستان اور پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور پھر بنگلہ دیش بن جانے سے تین حصے ہوئے۔ سرسیّد کو اب علیحدگی پسندوں میں شمار کیا جانے لگا۔ اس کے بارے میں بہت سے دلائل پیش ہوئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کے حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ سرسیّد کو مسلمانوں کی طرف خصوصی توجہ کرنی پڑی اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دینا پڑا کہ تعلیمی صورت حال بہتر بننے تک سیاست سے دور رہیں۔ سرسیّد کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ بحالت موجودہ انگریزوں کا تسلط ہندوستان سے ہٹانا ممکن نہیں ہے مولانا سید احمد شہید بریلوی کی تحریک بالاکوٹ کے مقام پر ناکام ہو چکی تھی۔ اگرچہ یہ جہادی تحریک انگریزوں کے خلاف بڑی منظّم تھی اور لوگوں نے بڑے جوش وخروش سے انگریزی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا عزم کر رکھا تھا مگر عصری ترقی یافتہ آلات اور فن جنگ کی کمی کی وجہ سے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور سرسیّد نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ موجودہ حالات کے پیش نظر طاقت کے ذریعہ نہیں بلکہ قوم کو صرف جدید تعلیم سے اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت سے نجات پا سکے اور ایسی تعلیم انگریزی زبان کے

ذریعہ ہی حاصل کی جا سکتی ہے کیوں کہ جدید علوم کی کتابیں صرف یورپین زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور جن کے تراجم انگریزی زبان میں ہو چکے ہیں اور زیادہ تر جدید تحقیقات اور ایجادات کا بیان خود انگریزی زبان میں ہی بنیادی طور پر کیا گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی عالمی زبان یا لنگا فرینکا بن چکی ہے۔

سر سیّد نے زبان کے بارے میں کسی قسم کی عصبیت کو حصول علم کے راستے میں حائل نہیں کیا بلکہ تعلیم کے بارے میں زیادہ تر فیصلے اپنی عقل وفہم کے مطابق کئے مذہب کی طرح زبان کے بارے میں بھی مخالفت کا زبردست مقابلہ کرنا پڑا۔ ہندوستان میں عام طور سے یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ انگریزی زبان صرف کرسچن بنانے کے لئے عام ہندوستانیوں پر ٹھونسی جا رہی ہے۔ مسلمانوں میں انگریز اور انگریزی سے نفرت کا جذبہ زیادہ شدید تھا اور اسی لئے مسلمان تعلیم کے معاملہ میں ہندوؤں سے پچاس سال پسماندہ رہ گئے۔ تعلیم اور زبان کے بارے میں سر سیّد کے فیصلے ان کی دور اندیشی، فراخدلی اور کھلے دماغ کی دلیل ہے۔ اور یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ جس بات کو انہوں نے قوم وملت کے لئے کارآمد سمجھا اس میں کسی قسم کی عصبیت حارج نہیں ہونے دیا۔ گویا وہ فطری طور پر ایک سیکولر ذہن لے کر ہی پیدا ہوئے تھے۔

سرِ دست دیسی زبانیں اتنی ترقی یافتہ نہیں تھیں کہ جن کے ذریعہ تعلیم دی جا سکے نیز یہ کہ صرف درسی کتابوں کا ترجمہ ناکافی تھا اور وہ یہ کہ محمڈن کالج میں مشرقی علوم کا شعبہ قطعاً ناکام ہو گیا۔ یہ حالات تھے جن کے تحت سر سیّد پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ جدید علوم کا ذریعہ انگریزی ہے اور انہوں نے اسی راستے پر قدم بڑھانا شروع کر دیا۔ کچھ لوگوں نے یہ طعنے بھی دیئے کہ آپ خود مشرقی علوم کے حامل تھے اور اب خود اس کی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ تب انہوں نے ایک مضمون میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :

''یہ بات سچ ہے کہ مگر اس زمانے اور حال کے زمانے اور
زمین اور آسمان میں فرق ہے وہ زمانہ تھا کہ اس میں انگریزی
علوم کی حاجت نہ تھی یا یہ کہو کہ قدر نہ تھی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے
لئے ادنیٰ درجے کی مشرقی تعلیم کافی تھی اس زمانے کے مناسب حال
اس زمانے کے مناسب حال سے بلاشبہ اس شخص کو جو سچے دل سے اپنی
قوم وملک کی ترقی کا خواہاں ہے اس کا خیال پیدا ہونا کہ ہم دیسی زبانوں
کے ذریعہ سے اپنے ملک وقوم کی ترقی دیں نہایت واجب اور سچا خیال ہو
سکتا ہے مگر رفتہ رفتہ تمام حجابات رفع ہوتے گئے اور خود زمانے نے بتادیا
کہ کدھر جاتے ہو اور راستہ کدھر ہے۔''(۱)

اگر سر سیّد انگریزی کی تعلیم پر زور دیتے تو انگریزی حکومت کو یہ بہانہ مل جاتا کہ مسلمان تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ اور یوں بھی ایک بہانہ مسلمانوں کو تباہ کرنے کا حکومت کو مل جاتا جو ۱۸۵۷ء سے بدظن تھی۔ اور اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو جانے سے سیاسی طور پر اقتدار چلا جانا ایک بڑا سبب مسلمانوں کی بربادی کا ہوا۔ اور اسی کے ساتھ انگریز حاکموں کے غیض وغضب کا نشانہ بنے۔ عہدے اور جاگیریں ختم ہو گئیں۔ اور اقتصادی حالت خراب ہو گئی۔ جہالت جو مسلمانوں میں عام تھی اور مسلمانوں میں جو علوم رائج تھیں وہ بلاشبہ غیر مفید تھیں کیونکہ اس کا حل جدید تعلیم کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ چاہے وہ ملازمت کا ہو یا کاروبار کا۔ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر نے لکھا ہے کہ جابجا مسلمانوں کی زبون حالی اس وجہ سے تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی نوکریوں کو ترستے تھے اور اپنی غربت کو دور کرنے کی کوئی تدبیر نہ کر پائے تھے۔ (۲) جواہر لال نہرو نے بھی سر سیّد کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم

---

(۱) تہذیب الاخلاق، ۱۸۸۱ء، ص۲۴، بحوالہ سر سید اور ہندوستانی مسلمان، نورالحسن نقوی، ص۱۲۲

(۲) ہمارے ہندوستانی مسلمان، ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر، مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، لاہور ۱۹۸۴ء، ص۳۸

جس میں انگریزی زبان بھی شامل تھی جو مغرب کی دین تھی یعنی انگریزوں کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم دینا بے حد ضروری تھا ورنہ وہ ہندؤوں سے بہت پیچھے رہ جاتے۔ جنہوں نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانا بہت پہلے شروع کر دیا تھا۔ نورالحسن نقوی نے بھی اپنی کتاب ''سرسیّد اور ہندوستانی مسلمان'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کا ہر شعبہ سرسیّد کا رہین منت ہے لیکن ان کی نظام فکر میں جس چیز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے وہ مسئلہ تعلیم ہے۔ سیاست اور مذہب کے میدان میں انہوں نے بدرجۂ مجبوری قدم رکھا۔ سرسیّد سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی نہ کرتے تو مسلمان بدستور انگریزوں سے انگریزی زبان اور مغربی علوم سے نفرت کرتے رہتے اور آئندہ ہر قسم کی ترقی سے محروم رہ جاتے۔ اگر وہ امور مذہب اور لغو رسم ورواج میں تمیز نہ کرنا سکھاتے تو مسلمان جہالت کی تاریکی سے نہ نکل پاتے اور جدید تعلیم کو بدستور گناہ خیال کرتے رہتے۔ انہوں نے سیاسی اور مذہبی معاملات میں دخل اندازی کر کے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کی مخالفت مول لی۔ لیکن یہ ان کی کوشش ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان آخرکار تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں یہ بھی کہہ دینا ضروری ہے کہ سیاست اور مذہب دونوں میں انہوں نے اپنے عقل وشعور سے مجتہدانہ اقدام اٹھایا اور کٹر مذہب پرستوں سے جان جوکھم میں ڈال کر مقابلہ کیا۔ جس سے ان کے سیکولر ذہن کی تائید ظاہر ہوتی ہے۔

معاشرت میں یا سماجی زندگی کے رکھ رکھاؤ میں جن باتوں پر سرسیّد نے زور دیا ان میں پہلی بات صدقِ مقال کو سرسیّد ایسی صفت بتاتے ہیں جو انسان کو قطب وابدال کے درجے سے بڑھا دیتی ہے۔ سچائی انسان کا اعتبار بڑھا دیتی ہے سرسیّد نے اکثر کہا کہ مذاق میں بھی کوئی دوسرے کو جھوٹا نہ کہے۔ اس طرح دل سے جھوٹ و برائی اور غیرت دل سے جاتی رہتی ہے قوم ذلیل وخوار اور نامہذب ہو جاتی ہے۔ دوسری بات جس کو وہ تہذیب کی علامت خیال کرتے تھے

وہ وقت کی پابندی نہ ہونے سے وقت برباد ہو جاتا ہے۔ سرسیّد خود وقت کے پابند تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ساری قوم وقت کی پابندی کرے۔ اسی لئے وہ انگریزی قوم کو وقت کی پابندی کیوجہ سے اعلیٰ اور افضل سمجھتے تھے۔ تیسری چیز جو تہذیب اور شائستگی کا نمونہ پیش کرتی ہے وہ الفاظ اور لہجے کا پتہ کی ادائیگی ہے۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ اختلاف بے شک بری چیز نہیں ہے لیکن متانت اور شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنا چاہئے۔ کیونکہ ناشائستہ گفتگو غیر مہذب ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ چوتھی چیز لباس کی صفائی ہے جو انسان کے شائستہ اور غیر شائستہ ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ سرسیّد اس بات پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا مذہب انہیں اعلیٰ درجے کی صفائی کی تلقین کرتا ہے اور صفائی کو ایمان کا جزو کہا جاتا ہے۔ سرسیّد عمدہ اور چست لباس کو شائستگی کی علامت خیال کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کسی مذہب قوم کے لباس کی پیروی کر بھی لیں تو نقصان نہیں۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ کئی بار دوسری قوم کے لوگوں نے لباس بطور تحفے کے رسول اللہؐ کو بھیجا۔ جو بھیجنے والے کی روش کے مطابق تھا۔ آپ نے اسے قبول کیا اور پہنا بھی۔ اس لئے ہم لباس کے بارے میں کیوں اتنے متعصب واقع ہوتے ہیں۔ تجارت کے بارے میں بھی سرسیّد کی رائے تھی کہ تجارت سے اقتصادی حالت بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ مگر اس بات کا احساس تھا کہ مسلمان تجارت سے ذہنی مناسبت نہیں رکھتے نہ وہ آٹا دال بیچ سکتے نہ ہی سوت کپاس، وہ بڑے پیمانے پر تجارت کر کے سوسائٹی میں اقتصادی حالت کو بہتر بنا کر باعزت ہو سکتے ہیں۔ سرسیّد نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ تمام عمر تنگی بسر کر کے بھی مذہب کی بدولت نجاتِ ابدی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جنہوں نے لاکھوں روپیے جائز طور پر پیدا اور خرچ کئے وہ بھی نجات ابدی پا سکتے ہیں۔ یعنی دین اور دنیا کا ایک مستحکم رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ سرسیّد کا کہنا تھا کہ دین چھوڑ دینے سے دنیا نہیں جاتی مگر دنیا چھوڑ دینے سے دین جاتا رہتا ہے۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ افلاس تنگ دستی

اور فاقہ کشی کے عالم میں ضرورت پڑنے پر اور پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے لوگ دین ایمان کو خیر آباد کہہ دیتے ہیں وہ مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے ہاتھ میں دنیا دیکھنے کی خواہش مند تھے۔ وہ طالب علموں سے کہتے تھے کہ "ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں جدید علوم کا تحفہ اور سر پر کلمہ توحید کا نام ہو"۔(۱) اس سلسلے میں مولانا عبدالحق دہلوی کی ترکِ دنیا کی نصیحت پر سرسیّد نے فرمایا کہ قوم کے بڑے بڑے عالم متقی اور نیک لوگ بھی دنیا کو ترک نہیں کر سکے۔ سرسیّد نے مولانا سے پوچھا کہ میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے رہنے سہنے کے لئے کبھی کوئی کچی یا پکی حویلی بھی بنوائی ہے کبھی اپنے رہنے کے لئے چھپّر ڈلوایا ہے آپ کے پاس پہننے کے لئے جوڑے ہیں۔ اس وقت آپ کو اس نصیحت پر کبھی عمل کرنے کا اتفاق نہیں ہوتا کہ "شاید نفسِ نفیس واپسی بود"۔ پس جس بات پر آپ کبھی عمل نہیں فرماتے تو دوسروں کو اس کے کرنے کی کیوں نصیحت فرماتے ہیں۔ جناب ایسی باتیں کہہ دینی اور لکھ دینی آسان ہے مگر اس پر کسی کو عمل کرتے نہیں دیکھا...... آپ بھلا ایسی باتیں جاہل مسلمانوں کو برباد کرنے کو کیوں فرماتے ہیں...... خدا سے یہ دعاء مانگو کہ ہم ان نعمتوں کے سبب مغرور نہ ہو جائیں اور اپنے خدا کو جس نے وہ نعمتیں ہمارے لئے وقف کر دی ہیں بھول نہ جائیں۔(۲)

سرسیّد کا یہ بھی خیال تھا کہ بہت سے لغویات دین کے نام سے مسلمانوں کی زندگی میں داخل ہو گئی تھی۔ جس کو ختم کئے بغیر معاشرے کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ رسم ورواج کی پابندی کو آنکھ بند کر کے ریت رواج پر عمل پیرا ہونے کو وہ بندر کی نقل کرنے سے تشبیہ دیتے ہیں کیونکہ اسطرح انسان میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنی عقل وفہم کو کام میں لا کر نیک و بد کی تمیز کر سکیں۔ سستی یا کاہلی کو بھی وہ برا سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ محبت وفر دوری نہ کرنا اور اپنے کاموں میں چستی نہ دکھانا ہی کاہلی نہیں ہے بلکہ دلی قوا کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔ سرسیّد

---

(۱) مکتوب سرسید، ۵ر نومبر ۱۸۷۳ء، بنام مولوی عبدالحق دہلوی، مکتوباتِ سرسید، ص ۲۲۵

(۲) خطباتِ سرسید، ص ۲۷۶

اپنے قوم کے لوگوں کو یورپ کے باشندں کی طرح مستعد اور چاق چو بند دیکھنا چاہتے تھے۔

سر سیّد کے اس انداز فکر نے ترک دنیا کے نظریے کو زد کیا ہے۔ یہ وہ اہم کام تھا جو آگے جل کر اقبالؔ نے اپنی شاعری کے ذریعہ انجام دیا اور قوم کے بے عملی سے نجات دلائی۔ سر سیّد نے عبادت میں ایذا پسندی کو ردّ کیا اور کہا کہ خدائے تعالیٰ نے جو ہمیں قوائے جسمانی عطا کئے ہیں ان قوتوں کو برقرار رکھنے کے لئے ایسا کام نہ کریں جن سے ان کی قوت برباد ہو جائے۔ انہوں نے ایک بار ''تہذیب الاخلاق'' کے اپنے ایک مضامین میں زہد و ریاضت کو ایک بخیل نیکی ٹھہرایا جو صرف اپنی ذات کے لئے کی جاتی ہے پس کیسی بڑی غلطی ہے کہ تن پروری کو عبادت سمجھا جائے اور اصلی فیاضی سخاوت اور ہمدردی کو عبادت نہ سمجھا جائے۔ حضورؐ نے اس بات پر فخر کیا کہ میں حاتم طائی جیسے سخی اور قصریٰ جیسے انصاف پسند بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوا۔ گویا سخاوت اور انصاف کا مرتبہ دنیا میں بہت بلند ہے اور خدا اور رسول کے نزدیک بڑی عبادت میں شامل ہیں۔ سر سیّد کے مزاج میں رجائیت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری تھی کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے۔ بھروسہ رکھا جائے یہی وجہ ہے کہ سر سیّد نے اپنے کاموں میں کبھی ہمت نہیں ہاری ان میں رجانیت اور خود اعتمادی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ قوم کی بد نصیبی سے نکالنے کے لئے تدبیریں سوچتے تھے اور ایسے طریقے ڈھونڈ نکالتے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کو زبوں حالی سے نجات دلا سکے۔ ان کو اپنے مقاصد کی بلندی اور کامیابی پر یقین تھا اسی لئے ہزاروں مخالفتوں کے باوجود سر سیّد نے اپنا مشن جاری رکھا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اپنی ترقی کے لئے دوسروں کی مدد کا سہارا ڈھونڈا جائے ان کا خیال تھا کہ ہر شخص اپنی ترقی کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق کسی بیرونی امداد کا انتظار کئے بغیر کوشش کرے۔ کسی ملک کی خوبی اور عمدگی اور قدر و منزلت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن،

اخلاق و عادات پر منحصر ہے کیونکہ قوم شخصی انفرادی حالات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایک قوم کی تہذیب درحقیقت مرد وعورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے جس سے وہ قوم بنی ہے اور جس طرح قومی ترقی مجموعہ ہے شخصی محنت، شخصی ایمانداری اور شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل بھی مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی خودغرضی اور شخصی برائیوں کا۔ پس قوم کی ہمدردی اور سچی خیر خواہی اور غور وفکر کرو کہ تمہاری قوم کی زندگی اور چال چلن عمدہ ہو تاکہ تم بھی ایک معزز قوم بنو جبکہ قوم خود اپنی اصلاح کرسکتی ہے۔ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح سرکار پر منحصر ہے اس وقت تک اصلاح وترقی کا کام قوم میں نہیں ہوسکتا۔ ''تہذیب الاخلاق'' کا مقصد قوم کو دینی اور دنیاوی ابتری کی حالت کا جتلانا اور سوتوں کو جگانا تھا۔ سڑے ہوئے پانی کو ہلانے سے بدبو پھیلے گی۔ مگر حرکت میں آ جانے سے خوشگوار توقع تھی۔ ۱۸۹۸ء میں سرسیّد اس دنیا سے رخصت ہو گئے وہ ساری زندگی قوم کی بھلائی کے کاموں میں مشغول رہے انہوں نے ساری کوششیں کیں جن کی ایک باہمت اور عالی حوصلہ انسان سے توقع کی جاسکتی ہے۔

پچھلے صفحات میں جن عادات وخصلات پر سرسیّد نے عمل کرنے کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسیّد نے اپنی زندگی میں جن جن کاموں کو قومی ترقی اور خاص طور پر مسلمانوں کی اصلاح کے لئے قدم اٹھایا اس میں زیادہ تر فیصلے عقلی دلائل پر ہوئے اور کوئی بھی تقلیدی قدم کسی مذہبی، سیاسی، معاشرتی طے شدہ اصولوں پر نہیں اٹھایا کیونکہ سرسیّد اچھی طرح جانتے تھے کہ جتنی تحریکیں اصلاح قوم کے لئے چلائی گئی ہیں وہ زمانے کے تبدیل ہوجانے کی وجہ سے فرسودہ اور غیر مفید ہیں اور جدید معاشرے میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہ گئی ہیں۔ سائنٹفک ترقی اور نئی نئی ایجادات وتحقیقات نے پرانے معاشرتی نظام کو فرسودہ قرار دیا ہے اور مغربی تعلیم اور تربیت کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے اور مشرقی ممالک جس

میں ہمارا ہندوستان بھی ہے اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا ہے جو مغربی ترقی یافتہ اقوام کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے سیاسی آزادی حاصل کرنے سے زیادہ مفید جدید علوم وفنون میں ترقی کرنا ضروری ہے اس موقع پر یہ ذہن نشین ہونا چاہیے کہ سرسیّد کے تصور میں صرف مسلمانوں کی ہی اصلاح اور ترقی پیش نظر نہیں تھی بلکہ ہندوستان کے کل مجموعی آبادی کی ترقی ان کی منزل مقصود تھی۔ البتہ یہ بات انہوں نے محسوس کر لی تھی کہ ہندو تعلیم اور تجارت میں نیز علوم فنون میں مسلمانوں سے بہت آگے ہیں اس لئے وہ زیادہ تر توجہ مسلمانوں پر مرکوز کرنا ضروری سمجھا تا کہ مسلم قوم بھی اپنے ہم وطنوں کے برابری تک پہنچ جائے۔ سرسیّد آزادی کے اتنے بڑے دلدادہ تھے کہ وہ کسی بھی قیمت پر غیر ملکی غلامی کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ یہ چیز فطری طور پر انکے اندر موجود تھی ۔ ان سارے کاموں کے لئے سیکولر نقطۂ نظر ضروری تھا اور سرسیّد کے کردار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی معاملات میں سیکولر نقطۂ نظر کو پیش کیا اور جو قدم اٹھائے ان میں اسی اصول کے پیش نظر اپنی بات ہر مرحلے میں دوسرے ارباب علم وفن سے یا تو تسلیم کرالی یا پھر امکانی حد تک مخالفت کا مقابلہ کیا۔

سرسیّد کے سیکولر خیالات کا مظاہرہ ان کی گونا گوں تحریروں سے ہوتا ہے۔ اس میں قومی نقطۂ نظر ہمیشہ نمایاں نظر آتا ہے جس میں قوم سے ان کا مطلب ہندو اور مسلمان دونوں کے متحدہ ایک قوم بننے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی کا نظریہ بھی اس سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ''اسلام نے دنیا کو یورپ کی طرح قوموں اور ملکوں میں تقسیم
> نہیں کیا بلکہ اختلافاتِ مذہبی کی بنا پر ملتوں میں تقسیم کیا ہے۔
> لیکن اس معنی میں بھی ملت، قومیت کے اس قدر منافی نہیں ہے

کہ مختلف ملتوں کا وجود قومیت کو پیدا نہ ہونے دے۔''(۱)

اس طرح مولانا محمد علی کا نظریہ یہ تھا کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے حضرات ملک کی بھلائی، اس کی ترقی اور آزادی کے لئے ایک ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو حب الوطنی کے اس اسلامی پس منظر اور آیات قرآنی کی روشنی میں ان کے فرائض کو یاد دلایا ہے۔ اپنے اخبار ''ہمدرد'' میں مولانا نے ایک مضمون میں لکھا کہ :

''اسلام ہرگز حبِ وطن اور غیر مسلموں کے ساتھ آزادی اور حریت اور نبی نوع انسان کی خدمت میں تعاون کرنے کے خلاف نہیں اور اس معنی میں ہر مسلم کو ملک پرور محبّ وطن بنالازمی ہے۔ اور خدا نہ کرے وہ دن آئے کہ مسلمانان ہند...... غیر مسلم بھائیوں سے اپنے دل میں نفرت کو جاگزیں ہونے دیں۔''(۲)

مولانا محمد علی کے خیالات کو سرسیّد کے خیالات سے کتنا قریبی رشتہ ہے یہ اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا خود علی گڑھ کے طالب علم اور جنگ آزادی کے سورما لیڈر تھے وہ اپنے عہد کے متقی و دیندار عظیم مفکر، ادیب، صحافی، سیاسی لیڈر اور شاعر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم اپنی خامیوں کو دور کریں اور مولانا کی تحریر و تقریر سے ہندو اور مسلمانوں کے مابین تعلقات کو زیادہ مستحکم بنائیں۔ انہوں نے سرسیّد مرحوم کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے اس خیال کی سچائی کا اعتراف اس شعر سے کیا تھا:

؎ سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی ابتدا تم تھے تو اس کی انتہا ہم ہیں

(۱) رسالہ 'ستون' علی گڑھ تحریک نمبر، نئی دہلی، برائے نومبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۵

(۲) ایضاً ، ص ۴۶

اس شعر سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا محمد علی نے جو جنگ آزادی میں دلیرانہ حصہ لیا وہ سرسیّد کی دین تھی۔ یہیں سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ سرسیّد بنیادی طور پر قوم پرست اور سیکولر نقطۂ نظر کے حامل تھے اور ان کی ہر نصیحت اور ذاتی عمل اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ سرسیّد نے قومی اصلاح اور ترقی کے لئے جو راہ اختیار کی تھی اس میں ان کی فطرت اور جبلت کا اثر تھا کہ وہ سچے انسانیت کے خادم تھے۔ اور انسانیت کسی قسم کی مذہبی یا معاشرتی تفریق کو گوارہ نہیں کرتی۔ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی اضافہ کر دینا حق بجانب ہوگا کہ حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد ہے کہ:

''ہر انسان ماں کے شکم سے آزاد جنم لیتا ہے اور اس کو کوئی غلام نہیں بنا سکتا۔'' (۱)

مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کی آزادی کے وہ مایہ ناز معمار تھے جنہوں نے وطن عزیز کی آزادی کی خاطر اپنی جان قربان کر دی۔ انہوں نے اپنی تحریر و تقریر سے تحریک آزادی میں ایک ایسی روح پھونکی جس سے ہندوستانیوں میں خود اعتمادی جرأت اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا مصمم ارادہ ایمان کی پختگی کی طرح مستحکم ہو گیا۔ مولانا محمد علی نے غلامی کے خلاف آواز بلند کی ان کا کہنا تھا کہ ''انسان صرف اللہ کی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔'' (۲)

سرسیّد خیالات تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی طرف بھی بہت زیادہ تھے۔ انہوں نے تربیت کے متعلق طلبا کو ان الفاظ میں اگاہ کیا کہ :

''چند ہندوستانیوں کا کاونسل میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ترقی

---

(۱) تقریر وکٹوریہ، اسکول غازیپور، مجموعہ لکچر، ص ۱۲۰

(۲) رسالہ 'ستون' علی گڑھ تحریک نمبر، ص ۴۵

کا فروغ ہے۔ میری اس پیش گوئی کو بھی یاد رکھو کہ وہ دن دور نہیں
کہ ہر ضلع میں ایک شخص کا کاؤنسل میں داخل ہونا ضروری ہوگا وہ
دن آوے گا کہ تم خود قانون بناؤ گے اس پر عمل کرو گے۔ صرف
ایک چیز چاہئے یعنی تربیت اور لیاقت تم دیکھو گے کہ
ہندوستانیوں کو علوم وفنون اور تربیت ولیاقت میں ترقی کرنے
کی کس قدر ضرورت ہے۔''(۱)

سرسیّد نے کسی موقع پر بھی آزادی خیال میں جھجک محسوس نہیں کی۔ جب انہوں نے 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' نکالا تو اس کے سرنامے پر یہ عبارت لکھی تھی۔'' جائز رکھنا آزادی کا ہے کام ایک دانہ گورنمنٹ کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا۔''(۲) لہٰذا انہوں نے اس مذکورہ عبارت کا ہر موقع پر اپنی تمام تحریر وتقریر میں خیال رکھا۔ سرسیّد نے جب آنکھ کھولی تو ان کے گردوپیش جاگیردارانہ ماحول و معاشرت کا نظام موجود تھا آرام طلبی اور خوشامد پرستی کے دلدادہ لوگ بھی شامل تھے۔ سرسید نے عوام کے اس حلقے میں نہ تو سانس لی اور نہ ہی اس معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھا بلکہ۔ انہیں پہلی مرتبہ عوامی زندگی کو دیکھنے کا تجربہ ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ جہاں پر بادشاہوں کے بیٹوں کے تن سر سے جدا دیکھے۔ بڑے بڑے گھرانوں کی پردہ نشین خواتین کو دستِ طلب بڑھاتے ہوئے اور سید زادیاں کہتے ہوئے بھی سنا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظالمانہ حکمرانی کا دور بھی دیکھا۔ ان کی نظر میں زوال اور عروج کے سارے گوشے تھے دراصل سرسیّد کا ذہن اس سماجی اور مذہبی زندگی کی نمائندگی کر رہا تھا جہاں سماج اونچے نیچے خانوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ سرسیّد کی یہ منطق کہ سِول سروس کا امتحان ولایت میں

(۱) مجوعہ لکچر، تقریر وکٹوریہ اسکول غازی پور، ص ۱۲۰

(۲) سرسید کی صحافت، اصغر عباس، ص ۷۵

ہو۔ یہ سرسیّد کے ان شرفاء کی نمائندگی کرتی ہے جوان کے ذہن میں ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد سما گئے تھے اور یہ نظریہ سرسیّد کے ان عظیم کارناموں پر حرف لاتا ہے جنہوں نے اسلامی نظریہ اور سیاسی اعتبار سے اس ملک میں انجام دیئے۔ سرسیّد اگر چہ سیکولرزم کے تہہ دل سے حامی تھے مگر کانگریس کے مخالف تھے انہوں نے کانگریس کی مخالفت میں جو وجوہات بیان کئے ہیں وہ خدشات آج بھی موجود ہیں۔ کیونکہ جمہوری طریقۂ کار کی کامیابی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ ملک کے سبھی لوگوں کی علمی سطح برابر ہو جبکہ ہندوستان میں سبھی کی علمی سطح برابر نہیں ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت کم تعلیم یافتہ تھے۔ سرسیّد کا یہ اعتراض تھا کہ اگر ملک میں عوامی حق کی خود اختیاری کے ذریعہ حکومت بنے گی تو اس وقت کاؤنسل میں چار ہندو ہونگے تو ایک مسلمان بھی ہوگا۔ یہ تصور سرسیّد کی طرح طرح کی خدشات میں مبتلا کر رہا تھا۔ کانگریس کو متحدہ قومیت کا دعویٰ تو ہے لیکن جب مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ آیا تو اس نے تناسب آبادی سے بھی کم مراعات دیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے کچھ بڑے لیڈر علیحدہ ہو گئے۔ ہندوستان اسی تنگ نظری کے باعث ۱۹۴۷ء کی آزادی پر تقسیم ہو گیا اور جو الفاظ ۱۸۶۷ء میں سرسیّد نے بنارس کے کمشنر شیکسپیئر سے کہا تھا۔ جس کا ذکر اس باب کے شروع میں آ چکا ہے وہ سچ ثابت ہوا۔ جمہوریت کے علمبرداروں نے انسانی حقوق کے دعوے تو بہت کئے مگر جمہوریت کے نام پر دنیا کے پسماندہ طبقے کا استحصال برابر جاری رہا۔ چنانچہ سرسیّد کی دور بینی، دوراندیشی اور حق گوئی کو تسلیم کر لینا پڑتا ہے۔ اسی سلسلے میں توقیر احمد فلاحی نے اپنی کتاب ''سرسیّد کا اصلاحی مشن'' میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

> ''مخصوص حالات میں سیاست سے بے تعلقی پر آمادہ اور تحصیل
> علم کو مرکزی حیثیت دینا، انگریزوں کی وفاداری اور انڈین نیشنل

کانگریس کی مخالفت، سرسیّد کی زندگی کے اہم مباحث ہیں جن پر
غیر جانبداری کے ساتھ قدرمبسوط گفتگو کی گئی ہے۔ تصور قومیت
اس کا دوسرا مبحث ہے۔ فی الحقیقت سرسیّد کا تصور قوم مبہم اور گنجلک
نہیں ہے اسلامی نظریۂ قومیت کے علمبردار بنیں گے۔ اس خادم
ملک وملت نے **کان الناس امت الواحدہ** کی روح سے اولاد
آدم کو روشناس کرایا۔ دوسری طرف تمام باشندگان ملک کو بلا
فرق و امتیاز ایک قوم قرار دیا۔ ہاں ۱۸۵۷ء کے نا مساعد
حالات کے پس منظر میں ہندی مسلمان نسبتاً زیادہ ان کی
توجہات کے مستحق تھے۔ اس لئے ان کی طرف سرسیّد کی خصوصی
نظر عنایت فرقہ واریت کی غمازی نہیں تھی۔ بلکہ وطن عزیز سے عین
محبت پر ناطق شہادت تھی۔ اور اسی طریقۂ عمل میں پورے ہندوستان
کی امن اور سلامتی اور خوشحالی وفارغ البالی کا راز مضمر تھا۔'' (۱)

قوم وقومیت جیسے الفاظ کی اصطلاح کو وسیع مفہوم میں دوبارہ رائج کرنے کا سہرا اگرچہ سرسیّد کے سر ہے۔ اور انہوں نے ہی مسلمانوں کی بدتر حالات کو سمجھ کر پھر سے ترقی کے راستے پر چلنے کی طرف راغب کیا۔ اس سلسلے میں حیات جاوید کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہمارے نزدیک یہ کہنا کچھ غلط نہیں ہے کہ قوم وقومیت وقومی
ہمدردی اور قومی عزت کے الفاظ جن وسیع معنوں میں کہ اب
ہندوستان میں عام طور پر بولے جاتے ہیں یہ درحقیقت سرسیّد
ہی کی تحریروں نے جو اول سوسائٹی اخبار میں اور اس کے بعد

(۱) سرسید کا اصلاحی مشن، توقیر عالم، مطبوعہ، اردو پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۹۸ء، ص ۱۹

تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئیں لوگوں کو بولنے سیکھائے
ہیں۔''(۱)

سرسیّد احمد خاں نے ۲۶ رجنوری ۱۸۸۴ء کو اپنی تقریر جو انجمن اسلامیہ امرتسر کے زیر اہتمام کی تھی۔ اس میں قومی ترقی کے بارے میں جو باتیں انہوں نے کہی تھیں اس کا ذکر توقیر عالم نے اس طرح کیا ہے :

''مدرستہ العلوم بے شک ایک ذریعہ قومی ترقی کا ہے یہاں پر قوم سے میری مراد صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی سے ہے۔ مدرستہ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لئے اور جو افسوسناک محرومی ان کو یورپین سائنسز اور لیٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا ہے۔ مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں ہی پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے وہ دونوں کو دی جاتی ہے۔ ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو اور کسی کو مسلمان کہیں مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹیو یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کے ہندوستانی کہتے ہیں۔''(۲)

معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے تو سرسیّد کو سیکولر مانا ہی جاتا ہے کیونکہ سیاسی اور معاشی معاملوں میں سرسیّد نے ہندو اور مسلمان دونوں کو نفع اور نقصان میں برابر کا شریک مانا اور ان کی

---

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۳۵۷

(۲) سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب، ص ۱۰۶، بحوالہ سرسید کا اصلاحی مشن، توقیر عالم۔

تعلیم وترقی کے لئے دونوں قوموں کو برابر کا درجہ دیا۔لیکن مذہبی معاملے میں سرسیّد نے فراخ دلی سے کام لیا۔ اگر چہ وہ اسلام کے سچے حمایتی اور پیرو تھے اور اعتقاد کے معاملے میں نہایت مستقل پیرو مذہب تھے۔اور اسلام کو سچا مذہب مانتے تھے۔اور اسی اسلامی قوانین کے سچائی کے لئے دوسرے مذہب والوں کی کتابوں کا مطالعہ کر کے نہایت فراخ دلی سے ان سب باتوں کو جو دوسرے مذہبوں میں حقیقت پسندانہ تھیں اور جو اسلامی قوانین کی تائید بھی کرتی تھیں،ان باتوں کو دیگر مذاہب کی مذہبی کتابوں سے تلاش کر کے سامنے رکھا اور ان شہادتوں پر اپنے مذہب کی سچائی کی تائید کی۔ یہی فراخ دلی انہوں نے بائیبل کی تفسیر لکھ کر اور قرآن وحدیث سے اس کی تطبیق کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ان کی تصنیف ’’تبیین الکلام‘‘ اس سلسلے کی بڑی معرکہ کی تصنیف ہے۔اس کتاب کے لکھنے پر ان کو عام مسلمانوں کی ناراضگی اور کفر کے فتوؤں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔کیوں کہ اگر کوئی مسلمان ایسی کتاب لکھے جس کا مقصد ’’انجیل‘‘ کی مقدس تفسیر لکھنا اور اس کی تائید کرنا اور اس کو آسمانی کتاب ماننا ہو تو بلاشبہ عام لوگ ان سے متنفر ہونگے۔ کیوں کہ زمانۂ سلف میں کسی نے بھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔ بقول حالؔی ’’تبیین الکلام‘‘ کی اشاعت کے بعد مولوی مہدی علی عرف نواب محسن الملک جیسے رفیق اور دوست نے بھی سرسیّد پر چھپا پادری ہونے کا الزام لگایا۔اور تکفیر کا فتویٰ دیا۔(۱) سرسیّد کی یہ جواں مردی قابل ستائش ہے کہ انہوں نے عیسائیت اور اسلام کی اچھی اچھی باتوں کو اکٹھا کر کے اس بات کا فراخ دلی سے ثبوت دیا کہ دوسرے مذہب کی کتابوں میں جو باتیں اچھی ہیں ان کو بلاکسی تعصب کے قبول کرنا چاہئے۔ یہ سب کام سرسیّد نے صرف اس لئے کیا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں محبت پیدا ہو۔کیوں کہ قرآن مجید کے مطابق اگر کوئی فرقہ ہمارا دوست ہوسکتا ہے تو وہ عیسائی ہیں۔اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ سرسیّد کا خیال سیکولرزم کی طرف مائل تھا۔اور وہ فرقہ واریت کو انسانی برادری کے لئے

(۱) حیاتِ جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۱۶۵

ایک بلا سمجھتے تھے۔عیسائی فرقے کو اہل کتاب مانا جاتا ہے۔اور ان کے ساتھ کھانا پینا رہنا اور دوستانہ تعلقات مذہب کے منافی نہیں مانا جاتا۔سرسیّد نے اس معاملے میں یہ اضافہ اور کیا کہ لباس وضع قطع اور کھانا پینا جیسی باتوں میں انگریزوں کے طریقے کار کو پسند کیا۔عام اور خاص مسلمانوں میں جو لباس، رہن سہن کے طریقے اور کھانے پینے کے انداز رائج ہو چکے تھے ان کو ترک کرنے کا مشورہ دیا جس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ صفائی اور خوشحالی میں رہن سہن کے وہ آداب جو انگریز قوم میں رائج ہیں بہت مفید اور عزت و وقار کو بڑھانے والے ہیں۔اس بات پر پڑھے لکھے مسلمانوں نے اور خاص طور پر علمائے ملت نے اعتراضات کئے یہاں تک کہ سرسیّد کو ''نیچری'لا مذہب اور چھپا پادری'' تک کہہ ڈالا۔مگر سرسیّد نے جو باتیں اپنی عقل وشعور سے اسلام کے بنیادی اصولوں کو پسند کیا اور رسم ورواج سے جو باتیں معاشرے میں داخل ہوگئی تھیں ان کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔کیونکہ ان کی نظر میں بے کار کی بحث تھی۔جن سے سچے اسلام کے پیرو کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں تھا۔دنیاوی رسم ورواج ان کے خیال میں نہ صرف گمراہ کن ہوتے ہیں بلکہ اس کی پیروی میں قیمتی مال واسباب صرف ہو جاتے ہیں۔عتیق احمد صدیقی کے خیال کے مطابق یہ حقیقت ہے کہ سرسیّد کا ذہن فرقہ پروری کی آلودگی سے کبھی پاک نہیں تھا تاہم مسلمانوں کی فرقہ وارانہ سیاسی تنظیموں کے خاردار تھے اور انہوں نے اپنے دامن کو الجھنے سے بچایا۔لیکن محمڈن اورینٹل ایسوسی ایشن نے صورت حال اس حد تک بدل دی کہ سید امیر علی جو فرقہ پرستی اور برطانیہ نوازی میں سرسیّد سے بہت آگے تھے انہوں نے بھی اس ایسوسی ایشن کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ :

''خود انہوں نے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن بنائی جو میرے خیال میں ایک نامسعود قدم تھا اور جیسے اشتعال انگیزی پر محمول

کئے جانے کا امکان تھا۔''(۱)

ہمارے خیال میں عتیق صاحب کا یہ خیال کہ سرسیّد کا ذہن فرقہ پروری کی آلودگی سے اگر چہ کبھی پاک نہیں رہا وہ سرسیّد کے ساتھ کسی قدر ناانصافی ہوگی۔ کیونکہ ان کی ابتدائی زندگی سے لیکر اورسرکاری ملازمت میں آنے تک اورسرکاری ملازمت کے زمانے میں کوئی ایسی مثال نمایاں طور پر ان کی تحریروں اور تقریروں سے ظاہر نہیں ہوتی کہ انہوں نے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے فرقہ والوں کونظر انداز کیا ہوخاص خاص موقعوں پر یہ دیکھنے میں آیا کہ دوسرے مذہب والوں کی خاطر خدمت میں انہوں نے وہی جانفشانی اور ہمت اور جرأت دکھائی جو اپنے فرقے والوں نے برتی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے حادثے کے بعد انہوں نے ہندو بچوں، بڑوں اور بزرگوں کی ویسی ہی حفاظت اور پرورش کی جیسی وہ اپنے ہم مذہبوں کی کرتے تھے۔ اس سلسلے میں شیکشپیر کی جان و مال کی حفاظت میں انہوں نے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا تھا اور ان کی حفاظت میں اپنے فرقے کے مسلمانوں کو صاحب موصوف پر حملہ آور نہیں ہونے دیا۔ اور خود دن ورات شیکشپیر کے بچوں اور مکان کی حفاظت تن تنہا کرتے رہے جس سے یہ بات تو ظاہر ہوگئی کہ نیکی کے کام میں وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ جس کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے وہ کس مذہب فرقے یا قوم کا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ کچھ ان کے ساتھیوں کی بے وفائی نے ان کے دل میں اُن ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف بدظنی پیدا کردی تھی جس سے ان کا اعتماد ہندوؤں کی طرف سے اٹھ گیا تھا اس کی مثال یہ ہے کہ راجہ شیو پرشاد جو مہاراجہ بنارس کے وزیر اور سرسیّد کے گہرے دوست اور شریک کار بھی تھے۔ جب انہوں نے اردو ہندی کا سوال اٹھایا تو سرسیّد کا ذہن اسقدر بدلا کہ انہوں نے صاف کہد یا کہ اب ہندو مسلمان یکجا رہنے کی حالت میں نہیں ہیں۔ راجہ شیو پرساد کے بارے میں مسٹر

(۱) سرسید احمد خاں کا سیاسی مطالعہ، عتیق احمد صدیقی، جامعہ مکتبہ نئی دہلی ۱۹۷۷ء، ص ۲۹۰، بحوالہ
Wasti, Memoirs of Syed Amir Ali, P.34

ہیوم کی رائے کا کچھ حصہ درج کیا جاتا ہے۔ جو عتیق احمد صدیقی کی کتاب ''سرسیّد کا سیاسی مطالعہ'' نے اس طرح منقول ہے :

''قدیم برطانوی عملے کے ایک فرد تھے برسوں پہلے پچھلے درجے کے
سرکاری ملازم رہے...... انہوں نے ایک خاص حیثیت حاصل کرلی لیکن
دیسی صحاب میں کلکتے سے لے کر پشاور تک کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی
ان کی عزت ہے......''(۱)

سرسیّد کی بے تعصبی یا سیکولرزم کی بابت مولانا الطاف حسین حالی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے خیال میں اور دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والے اشارات سے زیادہ قابل تسلیم ہے۔ مولانا حالی نے پہلے تو اپنے دیباچہ میں یہ بات نہایت زور دے کر کہی ہے کہ ہمارے بہت سے احسانات میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ اگر چہ ہماری قوم میں بڑے بڑے بادشاہ اور دانش مند وزیر اور بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو پیش تھے وہ براہِ راست کچھ رہبری نہ کرسکے۔ جن حالات میں ہمارے بزرگوں نے اپنے کارناموں کو انجام دیا ہے وہ ہمارے حالات سے بالکل جداگانہ ہیں۔ سرسیّد کی زندگی ہمیں سبق دیتی ہے کہ زمانے کی مخالفت کو سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کردیں اور دنیا میں آرام سے عزت کی زندگی بسر کریں۔ سرسیّد کی ترقی کے اسباب جو کچھ ۱۸۵۷ء کے بعد ظہور میں آئے وہ ان کے لئے بچپن ہی سے تیار تھے۔ حالی کہتے ہیں کہ سرسیّد کے اخلاق، عادات وخیالات کا دنیا پر روشن کرنا اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ وہ عادات وخیالات کہاں سے آئے۔ انسان کی

(۱) سرسید احمد خاں کا سیاسی مطالعہ، عتیق احمد صدیقی، ص ۲۸۱

کچھ خصلتیں فطری طور پر اپنے بزرگوں سے ملتی ہیں۔ اور وہی اخلاق و عادات ان کی زندگی میں شامل ہوتے ہیں۔ جو بچپن سے نامعلوم طور پر وہ اپنے خاندان یا سوسائٹی سے سیکھتے ہیں۔ اور یہ اکتسابات رفتہ رفتہ اس درجے تک پہنچ جاتی ہے جس کی نسبت حدیث میں آیا ہے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے لیکن آدمی اپنی جبلّت سے نہیں ٹل سکتا۔ اس لئے سرسیّد کے ان عادات واطوار پر ان کی ماں کا بہت زیادہ اثر قائم ہوا۔ بچپن سے سرسیّد پر نہ تو ایسی پابندی تھی کہ کھیلنے کودنے کی بالکل پابندی ہو اور نہ ایسی آزادی تھی کہ جہاں چاہیں اور جن کے ساتھ چاہیں کھیلتے کودتے پھریں۔ ان کی بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کے ماموں، ان کی خالہ اور دیگر رشتے داروں کے چودہ پندرہ لڑکے ان کے ہم عمر تھے۔ جو آپس میں کھیلنے کودنے کے لئے کافی تھے۔ ان کے بزرگوں کی طرف سے اجازت تھی کہ جس کھیل کو تمہارا جی چاہے شوق سے کھیلو مگر کسی کھیل کو چھپا کر مت کھیلو۔ انہوں نے یہاں تک اجازت دے دی تھی کہ سب بھائی مل کر گٹیریاں بھی کھیلو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

سرسیّد کی مذہبی زندگی میں دو باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو ایک مذہبی آدمی میں بہت کم ہی ملتی ہیں۔ حالانکہ اسلامی حمیت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ باوجود اس کے مذہبی تعصّبات سے وہ بالکل پاک تھے جس بے تعصبی سے انہوں نے مقدمات کے فیصلے کئے اور جس طرح ہر مذہب وملت کے لوگوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بحیثیت جج کے بے طرف دارانہ رہا۔ ہر قوم اور ہر فرقے کے لوگوں نے اس کو برابر تسلیم کیا ہے۔ یہی حال انکے برتاؤ دوستی و ملاقات اور سماجی معاملات میں تھا اور یہی رنگ ان کے مذہبی جھگڑوں کے متعلق بھی تھا۔ جو سنی، شیعہ، مقلد، غیر مقلد اور ہندو مسلمان میں ہمیشہ پیش آتے تھے ان معاملات کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے حل کیا اور یہی وجہ تھی کہ سرسیّد ہمیشہ جلسوں میں جہاں ہندو مسلم جمع ہوتے تھے دونوں قوموں کو اتحاد و

اتفاق اور ایک دوسرے کی خیر خواہی و خیر اندیشی کی نصیحت کرتے تھے۔مثلاً ایک موقع پر انہوں نے ایک تقریر میں کہا تھا:

''گائے کی قربانی پر جو ہندو مسلمانوں میں ہمیشہ تکرار رہتی ہے
اس کی نسبت وہ صاف صاف کہتے تھے کہ اگر ہم میں اور ہندوؤں
میں دوستی قائم رہے تو یہ دوستی ہمارے لئے گائے کی قربانی سے بہت
زیادہ بہتر ہے اور مسلمانوں کا اس پر اصرار کرنا محض جہالت ہے۔''(۱)

ایک سال بقرعید کے موقع پر کالج کے چند طالب علموں نے ملکر ایک گائے قربانی کرنے کے لئے خریدی عین بقرعید کے دن نماز کے بعد سرسیّد کو جب یہ خبر ملی کہ کالج میں گائے کی قربانی ہونے والی ہے۔ یہ سن کر وہ از خود رفتہ ہو گئے فوراً گاڑی تیار کرائی اور اپنی کوٹھی سے کالج تک آدمیوں کی ڈاک لگا دی۔ اور وہ گائے طالب علموں سے چھین کر اس کے مالک کو واپس کرادی۔ طالب علموں کو آئندہ کے لئے قطعی ممانعت کردی کہ کالج کے احاطے میں کبھی کوئی ایسا نہ کرنے پائے۔

ہندوستانی قومیت واتحاد کے سلسلے میں سرسیّد کے افکار وخیالات کا برملا اظہار کچھ یوں ملتا ہے۔ ہندوستان چونکہ مختلف قوموں وتہذیبوں کا سنگم ہے۔لہٰذا آپسی بھائی چارگی کو بنائے رکھنے کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں برادرانہ تعلقات واتحاد کی ضرورت ہے اور ان کی پہچان صرف اور صرف مندر اور مسجد کے کہیں اور نہ ہو۔ایک موقع پر ان کی خوشحالی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ جب انہوں نے بریلی کے ہندو و مسلمان کے اتحاد کا ذکر سنا کہ بریلی کے مسلمانوں نے بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی نہیں کی اور محرم کے موقع پر ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر محرم منایا۔ سفر پنجاب کے دوران انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ ایک ملک میں سبھی رہنے والے ایک قوم کہلاتے ہیں اور یہ کہ ہندو، مسلمان، عیسائی یہ سب مذہبی الفاظ ہیں کیونکہ ملک میں رہنے والے

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص ۷۸۵

سبھی افراد ملک کی ترقی اور بہبود میں اپنا اپنا کردار بخوبی ادا کرتے ہیں۔(۱) اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ اب وہ زمانہ نہیں ہے کہ مذہب کے نام پر ملک میں قوموں کی پہچان ہو۔موصوف نے اپنے اکثر و بیشتر تقریروں میں ان باتوں کا ذکر کیا ہے کہ:

''ہندوستان ایک دلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دلہن بھینگی ہو جاوے گی اور اگر ایک دوسرے کو برباد کردیں گے تو وہ کانی ہو جائے گی، پس اے ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ یا کانا۔''(۲)

مذکورہ سفر کے دوران ہی انہوں نے ہندو مسلم یگانگت پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا کہ:

''ہندوستان میں رہتے سہتے دونوں کا خون بدل گیا۔دونوں کی رنگتیں ایک سی ہوگئیں۔دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ ہوگئیں۔مسلمانوں نے ہندوؤں کی سینکڑوں رسمیں و عادتیں لے لیں۔یہاں تک ہم دونوں نے آپس میں مل کر ایک نئی زبان پیدا کر لی۔جو نہ ہماری زبان تھی، نہ ان کی۔درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار اہل وطن ہونے کے ایک قوم ہیں۔اور ہم دونوں کے اتفاق اور باہمی ہمدردی اور آپس کی محبت سے ملک کی اور ہم دونوں کی ترقی و بہبودی ممکن ہے۔''(۳)

---

(۱) سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ، ص ۱۷۹

(۲) سفرنامہ پنجاب، سرسید احمد خاں، ص ۹۴

(۳) سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ، مرتبہ سراج الدین، ص ۱۳۵

سرسیّد نے انجمن پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں جو الفاظ کہے تھے اس کا اظہار انہوں نے اس طرح سے کیا ہے :

''میری تمام آرزو یہ ہے کہ بلالحاظ قوم اور مذہب کے تمام انسان آپس میں ایک دوسرے کی بھلائی پر متفق ہوں۔ مذہب سب کا بے شک علیحدہ علیحدہ ہے مگر ان کے لحاظ سے آپس میں کوئی دشمنی کی وجہ نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک دستر خوان پر مختلف قسم کے کھانے موجود ہیں ان میں سے کوئی کسی کھانے کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو۔ مگر اس اختلاف طبائع کی وجہ سے اس دستر خوان پر بیٹھنے والوں کو باہم رنج نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دنیا میں مختلف مذہبوں کی وجہ سے مذہب والوں میں کوئی وجہ باہمی رنج پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہر شخص اپنے ایمان کا مختار بلکہ میری رائے میں اُس پر مجبور ہے۔ اس لئے کہ جس چیز کا یقین اس کے جی میں ہے اسی کو وہ اختیار کرے گا اور وہ یقین دوسروں کے دل میں اثر نہیں کرتا۔ اچھا ہے تو اس کے لئے اور برا ہے تو اس کے لئے۔ لیکن آپس کی محبت میں جو انسانوں کی راحت میں سب سے بڑا جزو ہے، اس سے کچھ نقصان نہیں آسکتا۔'' (۱)

---

(۱) حیات جاوید، الطاف حسین حالی، ص۷۸۶

كتابيات

۱۔اختر جوناگڑھی احمد میاں: سرسید احمد خاں کا علمی کارنامہ، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچ، ۱۹۶۴ء

۲۔اختر الواسع: سرسید کی تعلیمی تحریک، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۵ء

۳۔اسمٰعیل پانی پتی (مرتبہ): سرسید احمد خاں کا سفرنامہ مسافران لندن، مجلس ترقی ادب روڈ، لاہور ۱۹۵۹ء

۴۔اسمٰعیل پانی پتی (مرتبہ): مکاتیب سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہو، ۱۹۸۹ء

۵۔اسمٰعیل پانی پتی (مرتبہ): خطبات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۳ء

۶۔اسمٰعیل پانی پتی (مرتبہ): خطبات سرسید، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ب ت

۷۔اسمٰعیل پانی پتی (مرتبہ): مقالات سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء

۸۔اسمٰعیل پانی پتی (مرتبہ): مقالات سرسید، جلد ۸، مجلس ترقی ادب، لاہور، ب ت

۹۔اصغر عباس: سرسید اقبال اور علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

۱۰۔اصغر عباس: سرسید کی صحافت، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء

۱۱۔اقبال علی سید (مرتبہ)، سرسید احمد خاں کا سفرنامہ پنجاب، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء

۱۲۔الطاف علی بریلوی (مرتب) علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی ۱۹۷۰ء

۱۳۔امام لدین (مرتبہ): مکمل لکچرز و اسپیچیز، محمد فضل الدین، لاہور ۱۹۰۰ء

۱۴۔امان اللہ خاں شروانی: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال کلاسیکل پرنٹرس چاوڑی بازار، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

۱۵۔انصاری محمد ضیاء الدین: اشاریہ مندرجات تہذیب الاخلاق، مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

۱۶۔ ” (مترجم): علی گڑھ تحریک، شعبہ رابطہ عامہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء

۱۷۔انصاری محمد ضیاء الدین: مولانا آزاد، سرسید اور علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

۱۸۔انوار احمد مارہروی: مرقع کانفرنس، علی گڑھ، ۱۹۳۵ء

۱۹۔انوار الحسن: سرسید احمد خاں، اداۂ فروغ اردو، لکھنؤ، ب ت

۲۰۔بیدار عابد رضا (مرتب): ہندوستانی مسلمانوں عصری دستاویزات کے آئینہ میں، خدابخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء

۲۱۔توقیر عالم : سرسید کا اصلاحی مشن، اردو پرنٹنگ پریس، دہلی، ۱۹۹۸ء

۲۲۔ثریا حسین: سرسید اور ان کا عہد، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۳ء

۲۳۔حافظ محمود خان شروانی: پنجاب میں اردو، اپکار پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۱ء

۲۴۔حالی الطاف حسین: حیات جاوید، لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی، ۱۹۷۹ء

۲۵۔خورشید عبدالسلام: سرسید احمد خاں، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۲ء

۲۶۔رزاقی شاہد حسین: سرسید اور اصلاح معاشرہ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۶۳ء

۲۷۔ریاض الرحمٰن شروانی: مقالات قومی سمنار آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سلطان جہاں منزل علی گڑھ، ۲۰۰۰ء

۲۸۔زبیری محمد امین: تذکرہ سرسید، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۱ء

۲۹۔سلطان محمود حسین: اردو کی نثری تاریخ میں سرسید کا مقام، انیس انٹر پرائزز، دہلی، ۱۹۷۶ء

۳۰۔سید حامد: علی گڑھ تحریک، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء

۳۱۔سید نور اللہ: تاریخ تعلیم ہند، لاہوتی پرنٹ ایڈز، پہاڑی املی، جامع مسجد دہلی، ۱۹۷۳ء

۳۲۔شان محمد: سرسید تاریخی و سیاسی آئینے میں، انوار بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۶۷ء

۳۳۔شرر عبدالحلیم: سرسید کی دینی برکتیں، مطبع کریمی، لاہور، ۱۳۴۰ھ

۳۴۔شروانی حبیب الرحمٰن خاں: سرسید کی یاد، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۵ء

۳۵۔صادق حسین اقبال، ہمارے ہندوستانی مسلمان، لاہور، ۱۹۸۴ء

۳۶۔صدیقی رشید احمد، سرسید کا مغربی تعلیم کا تصور اور اس کا نفاذ، علیگڑھ میں، خدابخش لائبریری پٹنہ، ۱۹۸۹ء

۳۷۔صدیقی عتیق احمد (مرتب): سرسید بازیافت، سرسید اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۹۰ء

۳۸۔صدیقی عتیق احمد (مرتب): سرسید احمد خاں کا سیاسی مطالعہ، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۷۷ء

۳۹۔طارق محمود: سرسید احمد خاں، بک کارنر جہلم، پاکستان، ۱۹۸۸ء

۴۰۔طفیل احمد منگلوری (مرتب): محمڈن کالج ڈائرکٹری (۱۸۷۵ء-۱۹۱۱ء)، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۱۳ء

۴۱۔طیب بخش: اعتقاداتِ سرسید اور شرر بدایونی، بدایوں، ۱۹۸۵ء

۴۲۔ظفر حسن: سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۹۰ء

۴۳۔ظہیرالدین احمد: سرسید احمد خاں، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۱۹۳۹ء

۴۴۔عبدالحق: سرسید احمد خاں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۹ء

۴۵۔عبدالحق: مطالعہ سرسید احمد خاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۷ء

۴۶۔عبدالحق: سرسید حالات وافکار، ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۹ء

۴۷۔عبداللہ سید: سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ، چمن بک ڈپو، دہلی، ب ت،

۴۸۔عبداللہ شیخ محمد: مشاہدات وتصورات، فیمیل ایجوکیشنل ایسوسی ایشن، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء

۴۹۔عزیزالدین اختر (مرتبہ): مضامین سرسید مع تبصرہ از نسیم قریشی، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، ب ت

۵۰۔عشرت علی قریشی: سرسید اپنے اقوال وافکار کے آئینے میں، شعبۂ رابطہ عام، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء

۵۱۔فوق کریمی: سرسید کے سیاسی افکار، کریمی پرنٹرس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

۵۲۔فوق کریمی: اسباب بغاوت ہند (سرسید احمد خاں) دوسری بار ترمیم واضافہ، یونیورسٹی پبلشرز، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

۵۳۔فرید قمر الہدیٰ: سرسید اور اردو زبان وادب، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء

۵۴۔قدسیہ بیگم: سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستانی نشاۃ الثانیہ، کتابستان، الہ آباد، ۱۹۸۱ء

۵۵۔ماریسن تھیوڈور: تاریخ مدرسۃ العلوم از آغاز ۱۹۰۳ء، مترجم ومرتب، عابد رضا بیدار، ب ت

۵۶۔محمد فارق (مترجم): حیات سرسید احمد خاں، مطبع احمد، علی گڑھ، ۱۹۰۳ء

۵۷۔مسعود حسین خاں: مقدمہ تاریخ اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۹ء

۵۸۔مشتاق احمد: سرسید کا اسلام، نامی پریس، دہلی، ۱۹۶۰ء

۵۹۔مشتاق حسین (مرتبہ): مکاتب سرسید، فرینڈ بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

۶۰۔ممتاز معین: مسز وانصار زاہد خاں، تاریخ علی گڑھ، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۸۸۱ء

۶۱۔منشی سراج الدین (مرتبہ): سرسید احمد خاں کے لکچروں کا مجموعہ: کشمیری بازار، لاہور، ۱۹۹۰ء

۶۲۔منظر جلیسری، مصطفیٰ حسین: مرقع تاریخ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، یونین بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

۶۳۔موسیٰ خان محمد: مسلم یونیورسٹی کے بھولے اصول، مطبع عہد آفرین، حیدرآباد، ب ت

۶۴۔مولوی عبدالحق دہلوی: مکتوبات سرسید، بنارس، ۱۹۷۳ء

۶۵۔ناظر خوش محمد (مرتبہ): مرثیہ سرسید مرحوم، رفاہ عام پریس، لاہور، ۱۸۹۸ء

۶۶۔نجابت علی میر: سرسید احمد خاں مترجمہ سید ابوالحسنات، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۹ء

۶۷۔نظامی خلیق احمد (مرتب): ارمغان علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۸۷۴ء

۶۸۔نظامی خلیق احمد (مرتب): سرسید احمد خاں، رعنا پبلشرس، نئی دہلی، ۱۹۷۴ء

۶۹۔نظامی خلیق احمد (مرتب): سرسید احمد خاں مترجمہ (اصغر عباس): پبلی کیشنز ڈویژن، نئی دہلی، ۱۹۷۱ء

۷۰۔نظامی خلیق احمد (مرتب): سرسید اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۳ء

۷۱۔نفیس بانو، تہذیب الاخلاق کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، ۱۹۹۴ء

۷۲۔نقوی نورالحسن: سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

۷۳۔نقوی نورالحسن: سرسید کا خواب، مجلس اشاعت ادب، دہلی، ب ت

۷۴۔نورالرحمٰن: تذکرہ جوالدولہ عارف جنگ
ڈاکٹر سرسید احمد خاں مرحوم، شمس پریس، آگرہ، ۱۹۲۵ء

۷۵۔ " حیات سرسید، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

۷۶۔نہر جواہر لال: میری کہانی حصہ اول ودوم، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۳۹ء

۷۷۔ولایت حسین میر: آپ بیتی یا ایم۔اے۔او۔کالج
علی گڑھ کی کہانی، علی گڑھ ۱۹۷۰ء

۷۸۔وحیدالدین سلیم (مرتبہ): (ایڈیٹر معارف) سرسید کے خطوط، حالی پریس پانی پت، ب ت

تصانیف سرسید

۱۔آثار الصنادید،	مطبع سید الاخبار، دہلی،	۱۸۴۷ء
۲۔ابطال غلامی،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۳ء
۳۔احکام طعام اہل کتاب،	مطبع نول کشور، کانپور،	۱۸۶۸ء
۴۔ازالتہ الغین عن ذی القرنین،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۸۹ء
۵۔اسباب سرکشی ہندوستان کا جواب مضمون،	مفصلائٹ پریس، آگرہ،	۱۹۵۹ء
۶۔التماس بخدمت ساکنان ہند در باب ترقی تعلیم اہل ہند،	پرائیوٹ، پریس، غازی پور،	ب ت
۷۔انڈین نیشنل کانگریس پر سرسید احمد خاں کا لکچر،	نامی پریس کانپور،	ب ت
۸۔تبرئتیہ الاسلام عین شین الامتہ والفلام،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۸۹۵ء
۹۔تبین ن الکلام فی تفسیر التورات والانجیل، جلد اول و دوم،	پرائیویٹ پریس، غازی پور،	۱۸۶۵ء
۱۰۔تحریری فی اصول التفسیر ،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۲ء
۱۱۔ترقیم فی قصہ اصحاب الکہف والرقیم،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۰ء
۱۲۔تسہیل فی حبر الثقیل،	تیموں کا چھاپہ خانہ، آگرہ،	۱۸۴۴ء
۱۳۔تفسیر الجن والجان مافی القرآن،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۳۰۹ھ
۱۴۔ تفسیر القرآن حصہ اول،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۸۸۰ء
۱۵۔ تفسیر القرآن، حصہ دوم،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۸۸۵ء
۱۶۔تفسیر القرآن، حصہ سوم،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۸۸۸ء
۱۷۔تفسیر القرآن، حصہ چہارم،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۸۹۲ء
۱۸۔تفسیر القرآن، حصہ پنجم،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۸۹۵ء
۱۹۔تفسیر القرآن، حصہ ششم،	مفید عام، آگرہ،	۱۹۰۴ء
۲۰۔جام جم	چھاپہ خانہ سنگ لیتھوگرافک، اکبر آباد،	۱۸۴۰ء

۲۱۔جلاء القلوب بذکر المحبوب،	لیتھوگراف پریس، دلی،	۱۸۴۳ء
۲۲۔حب وطن وترقی علم در بیان اہل ہند،	پرائیویٹ پریس، غازیپور،	۱۸۶۳ء
۲۳۔الخطابات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ،	ملک فضل الدین، لاہور،	۱۸۷۰ء
۲۴۔خلق الانسان علیٰ مافی القرآن،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۳۰۹ء
۲۵۔الدعاء والاستجابہ،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۲ء
۲۶۔رسالہ خیر خواہاں مسلمان، حصہ اول،	مفید مفصلائٹ پریس، میرٹھ،	۱۸۶۰ء
۲۷۔رسالہ خیر خواہاں مسلمان، حصہ دوم،	مفید مفصلائٹ پریس، میرٹھ،	۱۸۶۰ء
۲۸۔رسالہ خیر خواہاں مسلمان، حصہ سوم،	مفید مفصلائٹ پریس، میرٹھ،	۱۸۶۱ء
۲۹۔سرکشی ضلع بجنور،	مفصلائٹ پریس، آگرہ،	۱۸۵۸ء
۳۰۔سلسلۃ الملوک،	اشرف المطابع، دہلی،	۱۸۵۲ء
۳۱۔سیرت فریدیہ،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۴ء
۳۲۔صداقت اسلام یعنی دو مشہور و معروف لکچر اسلام پر	اختر ہند پریس، امرتسر،	۱۸۹۷ء
۳۳۔فوائد الافکار فی اعمال الفرجار،	چھاپہ خانہ سید الاخبار، دہلی،	۱۸۴۶ء
۳۴۔قواعد صرف ونحو زبان اردو،		
مرتبہ ابو سلمان شاہ جہاں پوری،	ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان (کراچی)،	۱۹۹۰ء
۳۵۔قول متین در ابطال حرکت زمین،	مطبع سید الاخبار، دہلی،	۱۳۶۵ء
۳۶۔لکچر اسلام پر، بار سوم،	انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ،	۱۹۰۶ء
۳۷۔مسلمانوں کے قسمت کا فیصلہ،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۴ء
۳۸۔مضمون نسبت نزول علوم دینیہ وعربیہ وفلسفہ یونانیہ،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۹۷ء
۳۹۔النظر فی بعض مسائل الامام الہام ابو حامد محمد غزالی،	مطبع مفید عام، آگرہ،	۱۸۷۹ء

کتب مرتبہ سرسید

۱۔ آئین اکبری، از ابوالفضل علامی، مرتبہ سرسید احمد خاں، حصہ اول و دوم، مطبع اسمٰعیل، دہلی، ۱۸۷۲ء

۲۔ تاریخ فیروز شاہی، از ضیاء الدین (برنی)، مرتبہ سرسید احمد خاں، ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ، ۱۸۶۳ء

۳۔ تزک جہانگیری، از نورالدین جہانگیر، بہ تصحیح سرسید احمد خاں، پرائیوٹ پریس، علی گڑھ، ۱۸۶۴ء

منتخبات و مجموعے

۱۔ آخری مضامین۔ منصور پریس، لاہور، ۱۸۹۸ء

۲۔ انتخاب تہذیب الاخلاق، انوار احمد پریس، الہٰ آباد، ۱۹۲۴ء

۳۔ انتخاب مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مرتبہ اصغر حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۲ء

۴۔ انتخاب مضامین تہذیب الاخلاق، مرتبہ ابوالخیر کشفی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۴ء

۵۔ انتخاب مضامین سرسید، مع حیات و سیرت سرسید، از آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، (ب ت)

۶۔ انتخاب مضامین، مع سوانح و تنقیدی تعارف، اردو پبلشرز، لکھنو، ۱۹۷۳ء

۷۔ انتخاب مضامین سرسید، تصحیح و ترتیب، انور صدیقی، جامعہ مکتبہ، نئی دہلی، ۱۹۷۲ء

۸۔ انتخاب مکاتیب سرسید، شبلی اور اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۵۸ء

۹۔ مکاتیب سرسید، مرتبہ مشتاق حسین، فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۶۰ء

۱۰۔ تذکرہ اہل دہلی، مرتبہ احمد میاں اختر جوناگڑھی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۵ء

۱۱۔ خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء

۱۲۔ سرسید کی اسلامی بصیرت، مرتبہ جمال خواجہ، نیو علی گڑھ موومنٹ، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

۱۳۔ سرسید کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء

۱۴۔ سرسید کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم، حالی پریس، پانی پت، (ب ت)

۱۵۔ سرسید مرحوم کے مضامین تہذیب الاخلاق، مرتبہ فضل الدین، ملک چنن الدین، لاہور، ۱۳۲۳ھ

۱۶۔ مقالات سرسید، مجموعہ انتخاب پرچہ تہذیب الاخلاق، مرتبہ عبداللہ خاں، خویشگی نیشنل پرنٹری، علی گڑھ، ۱۹۵۲ء

۱۷۔ مقالات سرسید،

حصہ اول۔ (مذہبی و اسلامی مضامین) مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء

حصہ دوم۔ (تفسیری مضامین) طبع اول/ دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء

حصہ سوم۔ (فلسفیانہ مضامین)۔ طبع اول ودوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء

حصہ چہارم۔ (علمی و تحقیقی مضامین) طبع اول ودوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء

حصہ پنجم۔ (اخلاقی و اصلاحی مضامین) طبع اول ودوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء۔ ۹۰

حصہ ششم۔ (تاریخ مقالات) اول ودوم، " ۱۹۶۲ء۔ ۹۰

حصہ ہفتم۔ (مضامین متعلق سوانح وسیر و ادبی مضامین) طبع اول، " ۱۹۶۲ء

طبع دوم، " ۱۹۹۱ء

حصہ ہشتم۔ (تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین) طبع اول، " ۱۹۶۲ء

طبع دوم " ۱۹۹۱ء

حصہ نہم۔ (ملکی و سیاسی مضامین)، طبع اول، " ۱۹۶۲ء

حصہ دہم۔ (آنحضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کے متعلق مضامین)، طبع اول " ۱۹۶۳ء

حصہ دوازدہم (تقریری مقالات)، طبع اول، " ۱۹۶۳ء

حصہ سیزدہم۔ (سرسید کے ذاتی عقائد کے متعلق مضامین)، طبع اول " ۱۹۶۳ء

حصہ چہاردہم۔ (متفرق مضامین)، طبع اول، " ۱۹۶۳ء

حصہ پانزدہم۔ (نایاب رسائل ومضامین)، طبع اول، " ۱۹۶۵ء

۱۸۔ مکاتبات الخلان فی اصول التفسیر وعلوم القرآن، مرتبہ محمد عثمان مقبول، مطبع احمدی، علی گڑھ، (ب ت)

رسائل وجرائد

۱۔اخبار سین ٹیفک سوسائٹی، جلد۱، نمبر۱تا۴۰، مع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۶اپریل تا۲۸ردسمبر، ۱۸۶۶ء

۲۔ ” جلد۳، نمبر۱تا۵۲، ” ۳رجنوری تا۲۵دسمبر، ۱۸۶۸ء

۳۔ ” جلد۴، نمبر۱تا۵۳، ” ۱جنوری تا۳۱ردسمبر، ۱۸۶۹ء

۴۔ ” جلد۶، نمبر۱تا۵۱، ” ۱۳رجنوری تا۲۲دسمبر، ۱۸۷۱ء

۵۔برگِ گل (سرسید نمبر) کراچی، ۱۹۵۵ء

۶۔تہذیب الاخلاق، دوراول، جلد۱۔جلد۷، انسٹی ٹیوٹ پریس، علی گڑھ، ۲۴دسمبر، ۱۸۷۰ء تا ۲۰دسمبر ۱۸۷۶ء

” دوردوم، جلد۱۔جلد۳، ” ۲۳اپریل ۱۸۷۹ء تا ۲۸ جولائی ۱۸۸۱ء

” دورسوم، جلد۱۔جلد۳، ” ۱۷اپریل ۱۸۹۴ء تا۳فروری ۱۸۹۷ء

۷۔تہذیب الاخلاق، جلد۳، شمارہ۱، ” یکم محرالحرام، ۱۲۸۹ھ

۸۔ ” جلد۱، باہتمام منشی مشتاق علی، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ ۱۸۷۰ء

۹۔ ” جلد۱، شمارہ۱، ” ” یکم شوال، ۱۲۸۷ھ

۱۰۔ ”(سرسید نمبر) جلد۱، شمارہ۱، ” یکم رجب، ۱۳۱۲ھ

۱۱۔ ” جلد۱، شمارہ۲، مدیر مہدی علی مرحوم، مشمولہ تہذیب الاخلاق یکم ذیقعدہ، ۱۳۱۱ھ

۱۲ ” جلد۱، شمارہ۱، ” ” یکم شوال ۱۳۱۱ھ

۱۳۔تہذیب الاخلاق، جلد۱تا جلد۱۹، شمارہ۱تا۱۲، مدیر ابوالکلام قاسمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۹ء تاحال

۱۴۔رسالہ ستون، علی گڑھ نمبر، جلد۱۵، شمارہ۱۱، عشرت فیروز، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۲ء

۱۵۔روئداد نمبر ۲۸، سالانہ اجلاس محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ، باہتمام محمد قادر علی خاں، مفید آگرہ، ۳۰جنوری ۱۹۰۱ء

۱۶۔روئداد نمبر۳۱، ” ” ” ” ۲۶اکتوبر ۳ ۱۹۰۲ء

۱۷۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد۱۲، نمبر۳۱۔۸۲، ۳جولائی تا۲۹دسمبر ۱۸۷۷ء

۱۸۔ ” جلد۱۳، نمبر۵۳۔۱۰۵، ۲جولائی تا۳۱دسمبر ۱۸۷۸ء

۱۹۔ ” جلد۱۴، نمبر۵۳۔۱۰۴، ۱جولائی تا۳۰دسمبر ۱۸۷۹ء

۲۰۔ ،، جلد۱۵، نمبر۵۳۔۱۰۴،	۳جولائی تا۲۸دسمبر ۱۸۸۰ء
۲۱۔علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، جلد۱۷، نمبر۱۔۵۰،	۳جنوری تا ۲۴جون ۱۸۸۲ء
۲۲۔ ،، ، جلد۱۸، نمبر۵۳۔۹۳،	۳جولائی تا ۲۹دسمبر ۱۸۸۳ء
۲۳۔ ،، ، جلد۱۹، نمبر۵۳۔۱۰۵،	۱جولائی تا۳۰دسمبر ۱۸۸۴ء
۲۴۔ ،، ، جلد۲۵، نمبر۵۲۔۴۸،	۱جولائی تا۲۳دسمبر ۱۸۹۰ء
۲۵۔علی گڑھ میگزین (ماہانہ)، جلد۱۶، نمبر۱،۲، ایڈیٹر قاضی جلال الدین،	جنوری/فروری ۱۹۱۸ء
۲۶۔ ،، ، جلد۲۳، نمبر۱، ایڈیٹر محمود فاروقی،	۱۹۴۷ء
۲۷۔ ،، ، جلد۲۴، نمبر۱، ایڈیٹر مختار الدین آرزو،	۴۹۔۱۹۴۸ء
۲۸۔ ،، ، شمارہ۱، مرتب حسن مثنیٰ انور،	۱۹۵۹ء
۲۹۔ ،، ، اقبال احمد صدیقی،	۱۹۸۹ء
۳۰۔ ،،(خصوصی شمارہ) ، مدیر محمد رضوان مصطفیٰ	۹۷۔۱۹۹۵ء
۳۱۔فکر ونظر (سہ ماہی)، خصوصی نمبر، ناموران علی گڑھ، پہلا کارواں، علی گڑھ،	۱۹۸۵ء
۳۲۔ ،، ،، دوسرا کارواں، علی گڑھ،	۱۹۸۶ء
۳۳۔ ،، ،، تیسرا کارواں، جلد اول،	۸۸۔۱۹۸۷ء
۳۴۔ ،، ،، جلد دوم،	۱۹۹۱ء
۳۵۔فکر ونظر سہ ماہی، جلد۳، نمبر۱۔۴، مدیر یوسف حسین خاں،	جنوری تا اکتوبر ۱۹۶۲ء
۳۶۔ ،، ، جلد۴، نمبر۱۔۴، ،،	جنوری تا اکتوبر ۱۹۶۳ء
۳۷۔قانون واسطے سائنٹفک سوسائٹی، سرسید، غازیپور،	۱۸۶۴ء

English Books

1.Bhatnagar, S.K. – "History of the M.A.O. College", Asia Publishing house, BOMBAY. 1969.

2.Dar. Bahsir Ahmad – "Religious through of sayyid Ahmad Khan" Institute of Islmaic Culture. LAHORE, 1957.

3.Graham. G.F.I – The life and work of Syed Ahmad Khan C.S.I. Reprint DELHI, Idarah-I Adabiyat-1 DELHI, 1974.

4. Hamid Sayyed – Life of Mohammad, Cosmos Book, NEW DELHI – 2002.

5. Karim Fazli - Sir Syed Ahmad Khan, Reformer and first protagonist of Muslim Nationalism Composing Centre, KARANCHI, 1990.

6. Khan Kazim Ali - Sir Syed and Muslim University Aligarh, Parkashan Kendra, LUCKNOW, (N.D.).

7. Khan Yusuf Hussain – Selected documents from the ALIGARH archives, Asia, BOMBAY. 1967.

8. Malik Hafees - Syed Ahmad Khan and Muslim Modernization in India and Pakistan, Columbia University, press, New York, 1980.

9. Malik Hafeez - "History of Bijnour Rebellion", Idarah-e-Adabiyat-I-Delhi – 1982.

10. Mark Karl - "Das capital, Mosco, 1974.

11. Mohammad Shan – Sir Syed Ahmad Khan, A Political Biography, Meenakshi Publications MEERUT, 1969.

12. Nehru Jawarlal - "The glimpses of world history" New Delhi, 1996.

13. Nehru Jawarlal - The selected works, Fine Art Press, DELHI, 1972.

14. Nizami, Khailque Ahmad – "Syed Ahmad Khan", Publications Division, New DELHI, 1966.

15. Province, N.W. - Speech by the Syud Ahmad Khan on the Institution of the British Indian Association, Aligarh, 1867.

16. Qureshi Ishrat Ali – "Aligarh Movement" Department of Public Relation, Aligarh, 1980.

17. Theodre Morison – History of M.A.O. College Aligarh Rev. ED. Markaz E. Urdu Lucknow – 1988.

18. Topa, I. – Sir Syed Ahmad Khan, "A Study in Social thought" Islamic Culture Hydrabad, 1953.